ماہنامہ

الفرقان

لکھنؤ

ہماری دعوت

لا الٰہ الا اللہ محمد رسول اللہ

اسی کلمہ پر اسلام کی بنیاد ہے اور ہمارا ایمان ہے کہ یہی انسانیت کی نجات کا کلمہ ہے

لیکن یہ صرف ایک بول ہی نہیں ہے، بلکہ ایک شہادت، ایک اصول اور ایک اہم فیصلہ ہے، وہ عہد ہے

اس بات کا عہد کہ ہم صرف اللہ کی عبادت اور بندگی کریں گے، زندگی کے ہر شعبہ میں اسی کی اطاعت ہوگی

اور حضرت محمد صلعم کی لائی ہوئی ہدایت اور شریعت کی پیروی کریں گے اور اسی حال میں جئیں گے اور مریں گے۔

جو لوگ اس کلمہ پر ایمان لا چکے ہیں ان کا فرض ہے کہ زندگی اس عہد کے مطابق گزاریں اور اسی والی

زندگی کو دنیا میں رواج دینے کی کوشش کریں، وہ اسی لیے پیدا ہوئے ہیں۔ ہم اس کا

عہد کرتے ہیں اسی کی دعوت دیتے ہیں اور اسی پر جینا اور مرنا چاہتے ہیں۔

فاطر السمٰوٰت والارض انت ولیّ فی الدنیا والآخرۃ

توفنی مسلماً والحقنی بالصالحین

ادارۂ الفرقان

مدیر مسئول

محمد منظور نعمانی عفا اللہ عنہ

الفرقان لکھنؤ

ماہنامہ

ہندستان اور پاکستان سے
سالانہ چندہ :- [illegible]
ششماہی :- [illegible]
فی کاپی ۸ آنے

غیر ممالک سے
سالانہ چندہ
دس شلنگ

جلد ۲۱ | بابت ماہ ذیقعدہ ۱۳۷۳ھ مطابق جولائی ۱۹۵۴ء | شمارہ ۱۱

پاکستان میں چندہ

— سکریٹری ادارۂ اصلاح و تبلیغ آسٹریلین بلڈنگس لاہور کے نام بھیجئے اور ہمیں فوراً اطلاع دیجئے۔

تاریخ اشاعت :- ہر انگریزی مہینے کی ۱۵ ار۔

— رسالہ نہ پہونچنے کی اطلاع پر اگلے مہینے کے رسالے کے ساتھ دوبارہ بلا قیمت بھیجا جا سکتا ہے۔

سرخ نشان ○ اگر اس دائرہ میں سرخ نشان لگا ہو تو مطلب یہ ہو کہ آپ کا چندہ ختم ہو چکا ہو، براہ کرم نئے سال کے لیے چندہ ارسال فرمائیں، ورنہ اگلا رسالہ بذریعہ وی پی ارسال کیا جائے گا۔
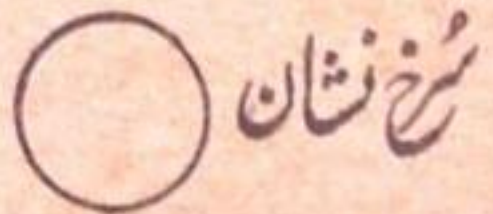
(مولوی) محمد منظور نعمانی پرنٹر و پبلشر نے تنویر پریس لکھنؤ میں چھپوا کر دفتر الفرقان گوئن روڈ لکھنؤ سے شائع کیا۔

نگاہِ اوّلیں

"ہندوستان ترقی کر رہا ہے، بڑی بڑی فیکٹریاں قائم ہو رہی ہیں، بڑے بڑے بند تعمیر ہو رہے ہیں، لاکھوں ایکڑ زمین کی سیرابی کا انتظام ہو رہا ہے، ضرورت کی بہت سی چیزیں ملک کے اندر بن رہی ہیں" ـــــ یہ الفاظ بار بار سننے اور پڑھنے میں آتے ہیں۔ اور الفاظ خالی الفاظ بھی نہیں ہیں بلکہ ان کے اندر حقیقت بھی ہے، مگر ہندوستان کے باشندوں کی اخلاقی حالت کیا ہے؟ ان کا کردار کتنی ترقی کر رہا ہے؟ ان کی انفرادی اور اجتماعی سیرت میں کتنی دیانتداری پائی جاتی ہے؟ ان کی زندگی میں مفاد پرستی کس رفتار سے گھٹ رہی ہے اور اصول پسندی کس رفتار سے بڑھ رہی ہے؟ ان میں وسیع النظری اور دوسروں کے جذبات کی رعایت کا حوصلہ کتنا ہے؟ ـــــ ان سوالات پر بھی کوئی غور کرتا ہے؟ ڈیڑھ سو سال کی غلامی نے ہندوستان کو جتنا سائنسی حیثیت سے پیچھے کر دیا ہے، اُتنا ہی وہ اخلاقی حیثیت سے بھی دیوالیہ کر گئی ہے۔ اور یہ کسی طور سے بھی قرینِ دانش نہیں ہے کہ توانائی کے ان دو بازوؤں میں سے ایک کو تو قابلِ پرواز بنانے کی دن رات جد و جہد کی جائے اور دوسرے کو یوں ہی معطل رہنے دیا جائے۔ ہندوستان کے اربابِ اقتدار دن رات ایک فلاحی ریاست (welfare State) کا خواب دیکھتے ہیں، مگر انھیں کون سمجھائے کہ تنہا سائنسی ترقی سے یہاں کے باشندے حقیقی فلاح و بہبود سے ہمکنار نہیں ہو سکتے، یہاں سماج کے جسم میں ایسے ایسے خطرناک ناسور ہیں کہ ان کے ہوتے ہوئے کتنی ہی فیکٹریوں کا قیام، بندوں کی تعمیر اور ضروریاتِ زندگی کی فراوانی اس سماج کو سچا سکون و آرام نہیں بخش سکتی! اور اگر کوئی اس کی امید کرتا ہے تو اس کا تصورِ فلاح و بہبود ناقص ہے، وہ ترقی کے بارے میں کوتاہ نظر ہے! ـــــ مغربی دنیا کا حال ہمارے سامنے ہے، وہ اس نقطۂ نظر سے ترقی کے سب سے اونچے زینے پر پہونچ چکی ہے، مگر سوسائٹی کی فلاح و بہبود جس چیز کا نام ہے اس سے وہاں کی سوسائٹی قطعاً محروم ہے، اور اب اس کا احساسِ تشنگی اس درجہ کو پہونچ گیا ہے کہ اب اسے چھپانے

کی قدرت نہیں رہی، آپ آئے دن اخبارات و رسائل میں یورپ و امریکا کے ڈاکٹروں اور مفکروں کے بیانات اور اعترافات دیکھتے ہیں جن سے پتہ چلتا ہو کہ انتہائی ترقیوں کے باوجود زرعی اور صنعتی مسائل کو حل کر لینے کے باوجود، اور تعلیمی و معاشرتی معیار بلند سے بلند تر ہو جانے کے باوجود سوسائٹی کی زندگی میں ایک خلا ہو، اور ایسا خلا ہو جو فلاح و بہبود کے خوابوں کو شرمندۂ تعبیر نہیں ہونے دیتا، وہ بہت دنوں تک اپنی اس یکطرفہ ترقی سے مبہوت رہے اور سمجھتے رہے کہ ہم نے فلاح و بہبود کی منزل پالی، مگر آخر کار انھیں سوچنا پڑا کہ یہ کیسی فلاح و بہبود ہو جس میں سوسائٹی حقیقی مسرت سے محروم ہو، صنفی انارکی روز افزوں ہو، ازدواجی زندگی میں بے لطفی عام ہو، معاشرہ کے افراد میں ایثار اور باہمی اعتماد مفقود ہو، ایک انسان دوسرے انسان کے ساتھ کوئی رعایت کرنے کو تیار نہیں، مروت اور قرابت کے تقاضے بے معنی ہیں، حتیٰ کہ ایک بیٹی کو اس میں باک نہیں کہ اپنے مرتے ہوئے باپ کی آنکھیں بیچ کر ان کی قیمت وصول کر لے! ——— مگر اب ان کے پاس اس کا کوئی علاج نہیں ——— ان کا یہ احساس جب ہو جبکہ ان کی سوسائٹی کے افراد دیانت، فرض شناسی اور اصول پسندی میں بہر حال ایک کیرکٹر رکھتے ہیں، اور ان میں ایک اجتماعی شعور ہو، تو ہم اس ترقی سے کس فلاح و بہبود کی توقع رکھ سکتے ہیں۔ جبکہ ہمارا سماج ان امور میں بھی بہت ہی تشویشناک حد تک دیوالیہ ہو۔ پھر اس پر طرہ یہ ہو کہ اب امریکن تہذیب کی وہ لعنتیں بھی درآمد کی جارہی ہیں جنکے نتائج سے وہاں کے اصحاب فکر عاجز اور بیزار ہوتے جارہے ہیں۔ تب بتلائیے یہ مادی ترقی ہمارا اور ہمارے معاشرہ کا کیا بھلا کرے گی اور کن معنیٰ میں ہمیں فلاح و بہبود سے ہمکنار کرے گی؟

مسلمان اگرچہ خالص اسلامی مقاصد اور اپنے اصل اوصاف کے ساتھ ہندوستان میں نہیں آئے مگر اس پر بھی انھوں نے ہندوستان کو بہت کچھ دیا۔ یہاں کی زمین پیاسی تھی، اس نے بڑے بڑے بادلوں سے بھی کچھ نہ کچھ لے ہی لیا۔ مگر اب مدت سے یہ سلسلہ بند ہو ——— ہم نے پہلے بھی بار بار کہا ہو، اور اب پھر یہی کہنا چاہتے ہیں کہ کسی ایسے ملک میں جہاں ہم پانچ کروڑ مسلمان موجود ہوں اور جس کا چپہ چپہ ان کا مسکن ہو، اخلاقی گراوٹ کا پایا جانا ایک افسوسناک واقعہ ہو! اور یہ ایک ایسا جرم ہو جسکے لیے ہم اللہ کے سامنے کوئی عذر نہیں پیش کر سکتے، ہمارا فرض ہو کہ ہم ملک کی یہ خدمت اپنے ہاتھ میں لیں۔ اور جس فلاح و بہبود کا ملک کا ہر باشندہ آرزومند ہو اس کے حصول کی ایک اہم شرط کو پورا کرنے کا بیڑا اٹھائیں، اسلیے بھی کہ یہ ہمارا فرض ہو، اسلیے

بھی کہ یہ ملک کی بنیادی ضرورت ہے اور اسلیے بھی کہ اس ضرورت کو پورا کرنے کی طرف کسی کو توجہ نہیں ہے، اور جو لوگ تعمیر و ترقی کے نام سے جد و جہد کر رہے ہیں اُن کو پتہ نہیں کہ اس جد و جہد میں کتنا بڑا خلا رہا جا رہا ہے ـــــ بار بار کی کہی ہوئی بات ہے مگر پھر کہنا پڑتی ہے کہ ہم میں سے جسے بھی اللہ تعالیٰ نے سوچنے کے قابل بنایا ہے وہ سوچے تو کہ آخر ہم کس مرض کی دوا ہیں؟! اگر جغرافیائی اور نسلی عوامل سے محض طبعی طور پر مسلم نامی ایک فرد یا گروہ وجود میں آجاتا تو کوئی ایسی بات نہ تھی، مگر معلوم ہے کہ ایسا نہیں ہے بلکہ اللہ تعالیٰ نے خاص ارادہ اور اہتمام کے ساتھ امتِ مسلمہ کے نام سے ایک امت بنائی ہے تو ایک شخص ہمارے "بے فائدہ وجود" کو دیکھ کر دریافت کر سکتا ہے کہ انسانیت پہلے ہی سے بہت سے فرقوں اور بہت سے گروہوں میں بٹی ہوئی تھی اور ان کی باہمی چپقلش سے تنگ تھی تو (معاذ اللہ) اللہ تعالیٰ کی مشیت نے اس نئے اضافہ سے غریب انسانیت کے ساتھ کیا بھلائی کی؟ ـــــ اللہ تعالیٰ کی مشیت اس الزام سے بری ہے، لیکن کہنے والا بھی معذور ہے، وہ جو کچھ دیکھ رہا ہے کہہ رہا ہے، ـــــ اُسے کیا معلوم کہ اللہ تعالیٰ نے اس نئی امت کو انسانیت کے جسم سے برائیوں کا میل صاف کرنے اور اُسے نیکیوں کے زیور سے آراستہ کرنے کے لیے انسانوں کے بیچ میں کھڑا کیا تھا، اور اسے معلوم بھی کیسے ہو جبکہ دنیا کے کسی گوشہ میں وہ نہیں دیکھتا کہ مسلمانوں کے وجود سے یہ مقصد پورا ہو رہا ہے! ـــــ اپنے مقصدِ وجود سے ہمارا عملی انحراف وہ دبیز پردہ ہے جس نے اللہ تعالیٰ کی حکمتِ عظیمہ کو چھپا رکھا ہے۔ اور کسی کی سمجھ میں نہیں آپاتا کہ امتِ مسلمہ کے وجود میں انسانیت کا کوئی عظیم فائدہ مضمر ہے۔

آئیے! اس پردہ کو چاک کرنے کا عزم لے کر اُٹھیے، اور اپنے اور اللہ تعالیٰ کی حکمت کے بارے میں دُنیا کی غلط فہمیوں کو دور کیجیے ـــــ مقامِ فخر ہوگا اگر یہ سعادت ہم ہندی مسلمانوں کے حصہ میں آجائے۔ مسلمان جس خدمت کیلئے وجود میں لائے گئے ہیں اس ملک کو اس خدمت کی حاجت ہے؛ اس کا اثر قبول کرنے کی استعداد بھی ہے[1]۔ مگر گذشتہ تاریخ کے بعض اسباب نے اور ہماری بعض کوتاہیوں نے اہلِ ملک کو ہم سے بدگمان کر دیا ہے، ہم انھیں خادم انسانیت کے بجائے ایک سیاسی اور معاشی رقیب نظر آنے لگے ہیں۔ ہماری خدمات کو وہ خوش آمدید کہیں گے اور اس سے ضرور فائدہ اٹھائیں گے مگر جبھی جبکہ ہم اپنی عملی تبدیلی سے اُن کے دلوں سے شبہات نکال دیں۔ اسکے لیے ہمیں سب سے پہلے اپنے دلوں کو صاف کرنا ہوگا۔ ہمیں ایمانداری سے یہ طے کرنا ہوگا کہ ہمارا کوئی مقصد ہندستان میں اسکے سوا نہیں کہ یہاں کے باشندوں کو جس حد تک خدائی ہدایت کے برکات سے مالامال کر سکتے ہوں کریں ـــــ اور ہم کسی کو کچھ دے جبھی سکتے ہیں جبکہ ہماری دولت کتابوں سے نکل کر ہماری زندگی میں چمکنے لگے۔

[1] حال ہی میں دہلی کی ۱۲ ہزار خواتین کی طرف سے سنیما کی برائیوں کے انسداد کے لیے حکومت کو جو عرضداشت پیش کی گئی ہے وہ اس استعداد کی علامت ہے۔

قرآنی دعوت

(۱۰)
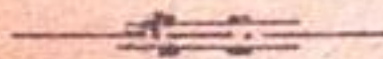
منکرینِ آخرت کے بے بنیاد شبہات کا جواب :-

قرآن مجید نے اس مسئلہ پر بلا مبالغہ سینکڑوں جگہ روشنی ڈالی ہے، اور منکرینِ آخرت کے اُن بے بنیاد استبعادات اور بے دلیل وہمی اشکالات کو جا بجا رفع کیا ہے، ـــــ چند آیتیں اس سلسلہ کی یہاں بھی پڑھ لیجیے۔

سورۂ یٰس کے بالکل آخر میں آخرت کے متعلق ان ہی وہمی شبہات و وساوس کا جواب دیتے ہوئے اللہ تعالیٰ کی قدرتِ کاملہ کا حوالہ دے کر منکرین کی عقلوں کو مخاطب کر کے ارشاد فرمایا گیا ہے

أَوَلَيْسَ الَّذِيْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْأَرْضَ بِقٰدِرٍ عَلٰى أَنْ يَّخْلُقَ مِثْلَهُمْ ۚ بَلٰى وَهُوَ الْخَلّٰقُ الْعَلِيْمُ ۝ إِنَّمَا أَمْرُهٗ إِذَا أَرَادَ شَيْئًا أَنْ يَّقُوْلَ لَهٗ كُنْ فَيَكُوْنُ ۝

(یٰس۔ ع ۵)

کیا وہ قادرِ مطلق جس نے آسمان و زمین (اور اُن کے درمیان کی ساری مخلوقات) کو پیدا کیا ہے، اس پر قادر نہیں ہے کہ ان جیسے پھر پیدا کرے، ہاں بلاشبہ وہ ضرور اسکی قدرت رکھتا ہے، اور وہ تو بہت مخلوق پیدا کرنے والا اور سب کچھ جاننے والا ہے اس کی شان تو یہ ہے کہ جب وہ کسی چیز کو بنانا چاہتا ہے تو اس کو کہتا ہے کہ ہو جا، تو اتنے ہی سے وہ ہو جاتی ہے۔

یعنی کسی چیز کو وجود بخشنے اور پیدا کرنے کے لیے صرف اس کا ارادہ اور اس کی مشیت کا اشارہ کافی ہے

پھر اس کے لیے اپنی کسی مخلوق کو ایک دفعہ موت دے کے پھر سے زندہ کر دینا کیا مشکل ہو۔

اور سورۂ روم میں فرمایا

وَهُوَ الَّذِي يَبْدَءُ الْخَلْقَ
ثُمَّ يُعِيدُهُ وَهُوَ أَهْوَنُ
عَلَيْهِ وَلَهُ الْمَثَلُ
الْأَعْلَىٰ فِي السَّمٰوٰتِ
وَالْأَرْضِ وَهُوَ الْعَزِيزُ
الْحَكِيمُ ۝
(روم ع ۳)

وہی ہو جو مخلوق کو پہلی بار پیدا کرتا ہو،
پھر وہی دوبارہ اس کو پیدا کرے گا اور
(ظاہر ہو کہ ایک دفعہ پیدا کرنے کے بعد) یہ
دوبارہ پیدا کرنا اس کے لیے بہت زیادہ
آسان ہو، اور آسمان و زمین میں اسکی
شان سب سے اعلیٰ ہو اور وہ زبردست
(قادر مطلق) اور حکمت والا ہو۔

اور سورۂ حج میں ارشاد ہو

يَا أَيُّهَا النَّاسُ إِن كُنتُمْ
فِي رَيْبٍ مِّنَ الْبَعْثِ فَإِنَّا
خَلَقْنَاكُم مِّن تُرَابٍ ثُمَّ
مِن نُّطْفَةٍ ثُمَّ مِنْ عَلَقَةٍ
ثُمَّ مِن مُّضْغَةٍ مُّخَلَّقَةٍ
وَغَيْرِ مُخَلَّقَةٍ لِّنُبَيِّنَ لَكُمْ وَ
نُقِرُّ فِي الْأَرْحَامِ مَا نَشَاءُ
إِلَىٰ أَجَلٍ مُّسَمًّى ثُمَّ
نُخْرِجُكُمْ طِفْلًا ثُمَّ لِتَبْلُغُوا
أَشُدَّكُمْ وَمِنكُم مَّن يُتَوَفَّىٰ
وَمِنكُم مَّن يُرَدُّ إِلَىٰ أَرْذَلِ
الْعُمُرِ لِكَيْلَا يَعْلَمَ مِن
بَعْدِ عِلْمٍ شَيْئًا وَتَرَى الْأَرْضَ

اے لوگو اگر تم کو قیامت اور بعث بعد الموت
کے بارہ میں کوئی شک ہو تو (غور کرو کہ) ہم نے
تم کو بنایا ہو مٹی سے، پھر نطفہ سے، پھر
بندھے ہوئے خون سے، پھر گوشت کے
مشکل یا غیر مشکل ٹکڑے سے، تاکہ ہم اپنی
قدرت تمھارے لیے ظاہر کریں، اور ہم
ٹھہرا دیتے ہیں جس نطفہ کو چاہیں رحم میں
ایک مقررہ مدت تک، پھر باہر لاتے ہیں
تم کو بچہ بنا کر، تاکہ پھر تم پہونچو اپنی پوری
جوانی کو، اور بعضے تم میں وہ ہوتے ہیں
جو اُٹھا لیے جاتے ہیں (جوانی ہی میں) اور
بعضے وہ ہوتے ہیں جو پہونچائے جاتے
ہیں (بڑھاپے والی) نکمی عمر تک (جس کا

هَامِدَةً فَإِذَا أَنزَلْنَا عَلَيْهَا الْمَاءَ اهْتَزَّتْ وَرَبَتْ وَأَنبَتَتْ مِن كُلِّ زَوْجٍ بَهِيجٍ ۝ ذَٰلِكَ بِأَنَّ اللَّهَ هُوَ الْحَقُّ وَأَنَّهُ يُحْيِي الْمَوْتَىٰ وَأَنَّهُ عَلَىٰ كُلِّ شَيْءٍ قَدِيرٌ ۝ وَأَنَّ السَّاعَةَ آتِيَةٌ لَّا رَيْبَ فِيهَا وَأَنَّ اللَّهَ يَبْعَثُ مَن فِي الْقُبُورِ ۝

(سورۃ الحج ع ۱)

نتیجہ یہ ہوتا ہو کر، علم و فہم حاصل کرنے کے بعد وہ پھر سٹھیا کر، علم سے کورے ہو کر رہ جاتے ہیں۔

اور دوسری ایک دلیل اور نشانی بعث بعد الموت کی یہ ہو کہ، تم دیکھتے ہو زمین کو خشک، پھر جب ہم نازل کرتے ہیں اس پر بارش تو وہ تر و تازہ ہو جاتی ہو، اور پھولتی پھلتی ہو، اور طرح طرح کے خوشرنگ سبزے اگاتی ہو، یہ سب اسی لیے ہو کہ اللہ کی ہستی ہی حق ہو اور (تم اپنے ان مشاہدوں سے سمجھ سکتے ہو کہ) وہ جلانے والا ہو مردوں کو اور وہ ہر چیز پر پوری طرح قادر ہو، اور یہ کہ قیامت یقیناً آنے والی ہو، اس میں کوئی شک نہیں، اور یقیناً اللہ تعالیٰ دوبارہ زندہ کرکے اٹھائے گا، قبروں کے دفن شدہ مردوں کو۔

قرآن مجید کی ان آیات کا حاصل یہی ہو کہ بعث بعد الموت کے مسئلہ میں شک کرنے والا اگر اسکو سمجھنے کا ارادہ رکھنے والا انسان اگر خود اپنی آفرینش اور پیدائش میں، اور بچپن سے لے کر بڑھاپے تک کی اپنی اس زندگی کی ان مسلسل تبدیلیوں میں غور کرے جن میں اس کا کوئی اختیار نہیں چلتا اور جو صرف اللہ ہی کے حکم سے ہوتی ہیں ـــــ اور اسی طرح اگر وہ زمین کی حالت کے اس تغیر و تبدل میں غور کرے کہ ایک موسم میں وہ بالکل خشک و بے جان اور مردہ پڑی ہوتی ہو اور اس میں زندگی کی کوئی رمق اور کوئی لہر نہیں دکھی جاتی، پھر جب اللہ اپنی رحمت کا پانی اس پر برسا دیتا ہو تو اسی مردہ زمین میں سے زندگی اور شادابی سبزہ کی شکل میں ابل پڑتی ہو ـــــ (الغرض انسان اگر خود اپنی ہستی اور اپنے پاؤں کے نیچے والی زمین کے ان انقلابات پر ایک طالب صادق کی طرح غور کرے،) تو بعث بعد الموت اور قیامت کے بارہ میں اُسے کوئی اشتباہ اور استبعاد نہیں رہ سکتا۔

اور سورۂ روم میں ایک جگہ فرمایا

يُخْرِجُ الْحَيَّ مِنَ الْمَيِّتِ وَيُخْرِجُ الْمَيِّتَ مِنَ الْحَيِّ وَيُحْيِي الْأَرْضَ بَعْدَ مَوْتِهَا وَكَذَٰلِكَ تُخْرَجُونَ ○ (روم ع ۲)	اللہ نکالتا ہے زندہ کو مردہ سے، اور نکالتا ہے مردہ کو زندہ سے اور زندگی بخشتا ہے زمین کو مردگی کے بعد (پس جس طرح دنیا میں اللہ کی قدرت سے نیستی کے بعد ہستی اور موت کے بعد زندگی کا یہ سلسلہ جاری ہے) اسی طرح تم مرنے کے بعد قیامت میں زندہ کر کے اٹھائے جاؤ گے۔

اور اسی سورۂ روم میں دوسری جگہ ارشاد فرمایا

فَانْظُرْ إِلَىٰ آثَارِ رَحْمَتِ اللَّهِ كَيْفَ يُحْيِي الْأَرْضَ بَعْدَ مَوْتِهَا إِنَّ ذَٰلِكَ لَمُحْيِي الْمَوْتَىٰ وَهُوَ عَلَىٰ كُلِّ شَيْءٍ قَدِيرٌ ○ (الروم ع ۵)	اللہ کی رحمت کے آثار تو دیکھو وہ کیسے حیات تازہ بخشدیتا ہے زمین کو اس کے خشک و بے جان اور بالکل مردہ ہوجانے کے بعد، ہاں ہاں بلاشبہ یہی اللہ دوبارہ زندہ کرنے والا ہے مردوں کو اور اس کو ہر چیز پر پوری قدرت ہے۔

اور سورۂ فصلت میں فرمایا

وَمِنْ آيَاتِهِ أَنَّكَ تَرَى الْأَرْضَ خَاشِعَةً فَإِذَا أَنْزَلْنَا عَلَيْهَا الْمَاءَ اهْتَزَّتْ وَرَبَتْ إِنَّ الَّذِي أَحْيَاهَا لَمُحْيِي الْمَوْتَىٰ إِنَّهُ عَلَىٰ كُلِّ شَيْءٍ قَدِيرٌ ○ (فصلت ع ۵)	اور اس کی نشانیوں میں سے یہ ہے کہ تم دیکھتے ہو زمین کو خشک پڑی ہوئی آثار حیات سے خالی، پھر جب ہم برسا دیتے ہیں اس پر پانی تو وہ تر و تازہ ہو جاتی ہے اور پھولتی پھلتی ہے، یقیناً وہی قادر مطلق جس نے مردہ زمین کو یہ زندگی بخشی وہی دوبارہ زندہ کرنے والا ہے مردوں کو بیشک وہ ہر چیز پر قادر ہے۔

اور سورۂ زخرف میں فرمایا

وَالَّذِي نَزَّلَ مِنَ السَّمَاءِ مَاءً بِقَدَرٍ فَأَنْشَرْنَا بِهِ بَلْدَةً مَيْتًا كَذَٰلِكَ تُخْرَجُونَ۔

(زخرف ع۱)

اور وہ اللہ جس نے پانی برسایا آسمان سے ایک خاص مقدار میں، پھر اس کے ذریعہ زندگی بخشی کسی مردہ علاقہ کو (تو جس طرح بارش برسا کر وہ مردہ علاقوں کو نئی زندگی بخشتا ہے) اسی طرح (اس کے حکم سے) تم مرنے کے بعد پھر زندہ کیے جاؤ گے۔

واقعہ یہ ہو کہ قرآن مجید نے ان آیات اور ان جیسی اپنی اور سیکڑوں آیات میں حیات بعد الموت اور حشر نشر کے اس مسئلہ کو ایسا آسان کر کے سمجھایا ہو اور کم عقلوں کے احمقانہ شبہات اور وہمی استبعادات کو دفع کرنے کے لیے ایسے عام فہم اور دلنشین دلائل پیش کیے ہیں جن کے بعد کسی استبعاد و اشکال اور کسی شک و شبہ کی گنجائش نہیں رہتی، اور مسئلہ ایسا روشن اور بدیہی ہو جاتا ہے کہ بجائے اس کے کہ اس پر کسی کو تعجب ہو اس کے انکار اور اور اس کے بارہ میں شک و شبہ کے اظہار پر لوگوں کو تعجب ہونا چاہیے۔

یہی بات قرآن مجید میں کیسے بلیغ انداز میں فرمائی گئی ہو۔

وَإِنْ تَعْجَبْ فَعَجَبٌ قَوْلُهُمْ أَإِذَا كُنَّا تُرَابًا أَإِنَّا لَفِي خَلْقٍ جَدِيدٍ۔

(رعد ع۱)

اور اگر تم کو تعجب ہو تو تعجب اور حیرت کے قابل ان (احمقوں) کا یہ کہنا ہو کہ جب ہم مر کر مٹی ہو جائیں گے تو کیا ہم کو پھر ایک نئی پیدائش اور نئی زندگی ملے گی۔

گویا کہ حیات بعد الموت اور حشر نشر کے مسئلہ پر قرآن مجید نے جو روشن دلائل پیش کیے ہیں ان کے سامنے آجانے کے بعد کسی منکر کا یہ کہنا کہ "مر کر ہمارے جسموں کے مٹی ہونے کے بعد ہم دوبارہ نئے سرے سے کیسے پیدا کیے جائیں گے؟" ایسی قابل تعجب حماقت اور سفاہت ہو جس پر جس قدر بھی تعجب کیا جائے کم ہو۔

صفحہ ۱۶ کا بقیہ — فرماتے تھے کہ اللہ تعالیٰ سے عافیت اور خیریت ہی کی دعا اور التجا کیا کرو، (سَلُوا اللّٰهَ الْعَافِيَةَ) اور خود آپ کا معمول و دستور بھی یہی تھا، پس حضرت ابو ذر رضی اللہ عنہ کی مندرجہ بالا حدیث کا مقصد یہ ہرگز نہیں ہے کہ بندہ اس دنیا میں مصائب اور تکالیف کی دعا یا تمنا کرے، بلکہ اس کا مطلب و مدعا صرف یہ ہے کہ جب اللہ کے حکم سے کوئی مصیبت یا تکلیف بندہ کو پہونچ جائے تو پھر مومن کا مقام اور زہد کا تقاضا یہ ہے کہ اس مصیبت یا تکلیف کا جو اجر و ثواب آخرت میں ملنے والا ہے وہ اس کو اس کے نہ پہنچنے سے زیادہ محبوب و مرغوب ہو۔ ان دونوں باتوں کے فرق کو اچھی طرح سمجھ لینا چاہیے!

معارف الحدیث

بسلسلۂ احادیث رقاق ——— (مسلسل)

(۵۱) عَنْ اَنَسٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ یَھْرَمُ ابْنُ آدَمَ وَیَشِبُّ فِیْہِ اِثْنَانِ اَلْحِرْصُ عَلَی الْمَالِ وَالْحِرْصُ عَلَی الْعُمُرِ ——— (رواہ البخاری ومسلم)

(ترجمہ) حضرت انسؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ آدمی بوڑھا ہوجاتا ہے (اور بڑھاپے کے اثر سے اس کی ساری قوتیں مضمحل ہوکر کمزور پڑجاتی ہیں) مگر اس کے نفس کی دو خصلتیں اور زیادہ جوان اور طاقتور ہوتی رہتی ہیں، ایک دولت کی حرص اور دوسری زیادتی عمر کی حرص۔

(بخاری ومسلم)

(تشریح) تجربہ اور مشاہدہ شاہد ہے کہ انسانوں کا عام حال یہی ہے اور اس کی وجہ بھی ظاہر ہے، بات یہ ہے کہ انسان کے نفس میں بہت سی ایسی غلط خواہشیں رکھی ہوئی ہیں جو اسی وقت پوری ہوتی ہیں جبکہ اس کے ہاتھ میں دولت ہو اور زندگی اور توانائی بھی ہو اور ان خواہشوں کی مضرتوں اور بربادیوں سے انسان کو بچانا "پاسبانِ عقل" کا کام ہے لیکن بڑھاپے کے اثر سے جب بیچاری یہ عقل بھی مضمحل اور کمزور پڑجاتی ہے تو ان خواہشات پر اپنا قابو اور کنٹرول رکھنے سے مجبور ہوجاتی ہے جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ آخر عمر میں بہت سی خواہشیں "ہوس" کا درجہ اختیار کرلیتی ہیں اور اس کی وجہ سے عمر کی زیادتی کے ساتھ مال و دولت کی اور دنیا میں زیادہ سے زیادہ رہنے کی حرص اور چاہت اور زیادہ ترقی کرتی رہتی ہے کہنے والے نے صحیح کہا ہو:۔ بنیہائے خوئے محکم شدہ ٭ قوتِ برکندن آں کم شدہ

لیکن یہ حال عوام کا ہے، اللہ کے جن بندوں نے اس دنیا اور اس کی خواہشوں کی حقیقت اور اس کے انجام کو سمجھ لیا ہے اور اپنے نفسوں کی تربیت کر لی ہے وہ اس سے مستثنیٰ ہیں۔

(۵۲) عَنْ اَبِیْ هُرَیْرَةَ عَنِ النَّبِیِّ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ قَالَ لَا یَزَالُ قَلْبُ الْکَبِیْرِ شَابًّا فِی اثْنَتَیْنِ فِیْ حُبِّ الدُّنْیَا وَطُوْلِ الْاَمَلِ۔ (رواہ البخاری ومسلم)

(ترجمہ) حضرت ابو ہریرہؓ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے نقل کرتے ہیں کہ آپ نے فرمایا۔ بوڑھے آدمی کا دل دو چیزوں کے بارہ میں ہمیشہ جوان رہتا ہے، ایک تو دنیا کی محبت اور دوسری لمبی لمبی تمنائیں۔

(تشریح) جیسا کہ پہلی حدیث کی تشریح میں ذکر کیا گیا عام انسانوں کا حال یہی ہو لیکن جن بندگان خدا کو خود شناسی اور خدا شناسی اور دنیا و آخرت کے بارہ میں صحیح علم و یقین نصیب ہو اُن کا حال یہ ہوتا ہے کہ بجائے حب دنیا کے اللہ تعالیٰ کی محبت اور اس فانی دنیا کی آرزوں کی جگہ رضاء الٰہی اور نعمائے اُخروی کا اشتیاق اور اس کی تمنا بڑھاپے میں بھی ان کے دل میں مسلسل بڑھتی اور ترقی کرتی رہتی ہے، اور ان کی عمر کا ہر اگلا دن پہلے دن کے مقابلہ میں اس پہلو سے بھی ترقی کا دن ہوتاہی

(۵۳) عَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ عَنِ النَّبِیِّ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ قَالَ لَوْ کَانَ لِابْنِ آدَمَ وَادِیَانِ مِنْ مَالٍ لَابْتَغٰی ثَالِثًا وَلَا یَمْلَأُ جَوْفَ ابْنِ آدَمَ اِلَّا التُّرَابُ وَیَتُوْبُ اللّٰهُ عَلٰی مَنْ تَابَ۔ (رواہ البخاری ومسلم)

(ترجمہ) حضرت عبداللہ بن عباس سے روایت ہے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا، اگر آدمی کے پاس مال کے بھرے ہوئے دو میدان اور دو جنگل ہوں تو وہ تیسرا اور چاہے گا اور آدمی کا پیٹ تو بس مٹی سے بھرے گا (یعنی مال و دولت کی اس ختم نہ ہونے والی ہوس اور بھوک کا خاتمہ بس قبر میں جا کر ہو گا) اور اللہ اس بندہ پر عنایت اور مہربانی کرتا ہے جو اپنا رُخ اور اپنی توجہ اس کی طرف کر لے۔

(تشریح) مطلب یہ ہو کہ مال و دولت کی زیادہ حرص عام انسانوں کی گویا فطرت ہے، اگر دولت سے ان کا گھر بھی بھرا ہو اور جنگل کے جنگل اور میدان کے میدان بھی پٹے پڑے ہوں تب بھی ان کا دل قانع نہیں ہوتا اور وہ اس میں اور زیادتی اور اضافہ ہی چاہتے ہیں اور زندگی کے آخری سانس تک ان کی ہوس کا یہی حال رہتا ہو اور بس قبر ہی میں جا کر دولت کی اس بھوک اور رال ٹپکانے کے

اس پھیرے ان کو چھٹکارا ملتا ہے ـــــ البتہ جو بندے دنیا اور دنیا کی دولت کے بجائے اپنے دل کا رخ اللہ کی طرف کریں اور اس سے تعلق جوڑلیں ان پر اللہ تعالیٰ کی خاص عنایت ہوتی ہے اور ان کو اللہ تعالیٰ اس دنیا ہی میں اطمینانِ قلب اور غنائے نفس نصیب فرما دیتا ہے۔ اور پھر اس دنیا میں بھی ان کی زندگی بڑے مزے کی اور بڑے سکون سے گزرتی ہے۔

(تنبیہ) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے یہی ارشادات ہیں جنھوں نے دنیا اور اس کی دولت کو صحابہ کرام کی نظر میں بالکل بے وقعت اور حقیر بنا دیا تھا اور ان کا دل دنیا سے ہٹ کر اللہ اور آخرت کی طرف لگ گیا تھا اگر ہم نے اِن ارشادات سے یہ فائدہ حاصل نہ کیا تو بلاشبہ ہم بڑے ناقدرے اور بڑے ہی بے نصیب ہیں۔

(۳۵) عَنْ اَنَسٍ اَنَّ النَّبِیَّ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ قَالَ مَنْ کَانَتْ نِیَّتُہٗ طَلَبَ الْاٰخِرَۃِ جَعَلَ اللّٰہُ غِنَاہُ فِیْ قَلْبِہٖ وَجَمَعَ لَہٗ شَمْلَہٗ وَاَتَتْہُ الدُّنْیَا وَھِیَ رَاغِمَۃٌ وَمَنْ کَانَتْ نِیَّتُہٗ طَلَبَ الدُّنْیَا جَعَلَ اللّٰہُ الْفَقْرَ بَیْنَ عَیْنَیْہِ وَشَتَّتَ عَلَیْہِ اَمْرَہٗ وَلَا یَاْتِیْہِ مِنْھَا اِلَّا مَا کُتِبَ لَہٗ ـــــ (رواہ الترمذی)

(ورواہ احمد والدارمی عن ابان عن زید بن ثابت)

(ترجمہ) حضرت انس سے روایت ہے کہ جس شخص کی نیت اور اس کا مقصدِ اصلی اپنی سعی و عمل سے آخرت کی طلب ہو تو اللہ تعالیٰ غنا (قلبی اطمینان، اور مخلوق کی نامحتاجی کی کیفیت) اس کے دل کو نصیب فرما دیں گے، اور اس کے پراگندہ حال کو درست فرما دیں گے اور دنیا اس کے پاس خود بخود ذلیل ہو کر آئے گی۔ اور جس شخص کی نیت اور اپنی سعی و عمل سے جس کا خاص مقصد دنیا طلب کرنا ہوگا، اللہ تعالیٰ محتاجی کے آثار اسکی بیچ پیشانی میں، اور اس کے چہرہ پر پیدا کر دیں گے اور اس کے حال کو پراگندہ کر دیں گے (جس کی وجہ سے اس کو خاطر جمعی کی راحت کبھی نصیب نہ ہوگی) اور (ساری تگ و دو کے بعد بھی) دنیا اس کو بس اسی قدر ملے گی جس قدر اُسکے واسطے پہلے سے مقدر ہو چکی ہوگی،

(اس حدیث کو حضرت انس سے امام ترمذی نے روایت کیا ہے اور امام احمد اور دارمی نے اس حدیث کو ابان کی روایت سے حضرت زید بن ثابت انصاری سے روایت کیا ہے)

(تشریح) مطلب یہ ہے کہ جو بندہ آخرت پر یقین رکھتے ہوئے آخرت کی فلاح ہی کو اپنا اصل

مطلوب و مقصود بنا لیتا ہے تو اس کے ساتھ اللہ تعالٰی کا معاملہ یہ ہوتا ہے کہ دنیا کے بارہ میں اس کو قناعت نصیب فرما کر اسکے دل کو طمانیت اور جمعیتِ خاطر نصیب فرما دی جاتی ہے۔ اور دنیا میں سے جو کچھ اس کے لیے مقدر ہوتا ہے وہ کسی نہ کسی راستہ سے خود اس کے پاس آجاتا ہے ـــــ اور اس کے برعکس جو شخص دنیا کو اپنا اصل مقصود و مطلوب بنا لیتا ہے تو اللہ تعالٰی محتاجی اور پریشاں حالی اس پر اس طرح مسلط کر دیتا ہے کہ دیکھنے والوں کو اس کے چہرہ پر اور اس کی بیچ پیشانی میں اس کے آثار نظر آتے ہیں، اور دنیا کی طلب میں خون پسینہ ایک کر دینے کے بعد بھی اس طالبِ دنیا کو بس وہی ملتا ہے جو پہلے ہی سے اس کے لیے مقدر ہے ـــــ پس جب واقعہ اور حقیقت یہ ہے تو بندہ کو چاہیئے کہ آخرت ہی کو اپنا مقصود و مطلوب بنائے اور دنیا کو بس ایک عارضی اور وقتی ضرورت سمجھ کر اس کی صرف اتنی ہی فکر کرے جتنی کہ کسی عارضی وقتی چیز کی فکر ہونی چاہیئے!

(۵۵) عَنْ أَبِي ذَرٍّ أَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ إِنِّي لَأَعْلَمُ آيَةً لَوْ أَخَذَ النَّاسُ بِهَا لَكَفَتْهُمْ وَمَنْ يَتَّقِ اللّٰهَ يَجْعَلْ لَهُ مَخْرَجًا وَيَرْزُقْهُ مِنْ حَيْثُ لَا يَحْتَسِبُ۔

(رواہ احمد وابن ماجہ والدارمی)

(ترجمہ) حضرت ابوذر سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا میں جانتا ہوں قرآن کی ایک ایسی جامع اور کافی آیت کو کہ اگر لوگ اُس کو اختیار کر لیں (یعنی اس کو اپنی زندگی کا دستورِ عمل بنا لیں) تو اُن کو بالکل کافی ہو ـــــ اور وہ آیت یہ ہے۔ "ومن یتق اللہ الآیۃ (جس کا ترجمہ یہ ہے کہ) جو کوئی اللہ سے ڈرے (اور اس کے نتیجہ میں تقوے والی زندگی اختیار کرے) تو اللہ تعالٰی نکالے گا اس کے لیے (مشکلات اور پریشانیوں سے) نجات کی شکلیں اور رزق پہونچائے گا اس کو ایسے طریقوں سے جہاں سے اس کو گمان بھی نہ ہوگا۔

(تشریح) غور کیا جائے انسان کی ساری ضرورتوں اور چاہتوں کا خلاصہ یہی ہے کہ اس کو کوئی تکلیف اور پریشانی نہ ہو اور ضرورت یا راحت و لذت کی جن چیزوں کو وہ حاصل کرنا چاہتا ہے، اس کو وہ مل جائیں۔ اور قرآن پاک کی اس آیت میں حتمی وعدہ اور ضمانت ہے کہ جو شخص اللہ سے ڈرے گا اور تقوے اختیار کرے گا اس کو ہر قسم کی تکلیفوں اور پریشانیوں سے نجات دی جائے گی اور اللہ تعالٰی اپنے خزانۂ فضل سے ایسے طریقوں سے اُس کو رزق (یعنی اس کی ضرورت اور راحت و لذت

کا وہ سامان جس کی اس کو چاہت اور خواہش ہو گی) عطا فرمائے گا جن کا اس کو خیال و گمان بھی نہ ہو گا
——پس بلاشبہ تنہا یہی آیت انسانوں کے لیے کافی ہے اگر وہ اس کو اپنا دستور العمل بنا لیں۔

(۵۶) عَنْ عَمْرِو بْنِ شُعَيْبٍ عَنْ أَبِيهِ عَنْ جَدِّهِ أَنَّ النَّبِيَّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ أَوَّلُ صَلَاحِ هٰذِهِ الْأُمَّةِ الْيَقِيْنُ وَالزُّهْدُ وَأَوَّلُ فَسَادِهَا الْبُخْلُ وَالْأَمَلُ

(رواہ البیہقی فی شعب الایمان)

(ترجمہ) روایت ہے عمرو بن شعیب سے وہ روایت کرتے ہیں اپنے والد شعیب سے اور وہ روایت کرتے ہیں اپنے دادا عبداللہ بن عمرو بن عاصؓ سے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ اس امت کی پہلی نیکی اور بہتری یقین اور زہد ہیں اور اس کی پہلی خرابی بخل اور دنیا میں زیادہ رہنے کی آرزو ہے۔

(شعب الایمان بیہقی)

(تشریح) مطلب یہ ہے کہ اس امت کی صلاح و فلاح اور اس کے کمالات و ترقیات کی بنیاد اس کی دو صفتیں تھیں ایک یقین[۱] اور دوسری زہد[۲] اور جب امت میں بگاڑ شروع ہو گا تو سب سے پہلے یہی دو صفتیں اس میں سے جائیں گی اور ان کی ضد بخل اور دنیا میں زیادہ رہنے کی آرزو آئے گی۔ اور اس کے بعد خرابیوں اور برائیوں کا نہ ختم ہونے والا سلسلہ شروع ہو جائے گا، اور امت برابر گرتی ہی چلی جائے گی۔

شارحین نے جیسا کہ لکھا ہے اس حدیث میں یقین سے مراد خاص اس حقیقت کا یقین ہے کہ اس دنیا میں جو کچھ کسی کو ملتا ہے اور جو اچھی یا بری حالت کسی پر آتی ہے وہ اللہ کی طرف سے اور اللہ کے فیصلہ سے آتی ہے[۱]۔ اور زہد کا مطلب جیسا کہ پہلے بھی معلوم ہو چکا ہے یہ ہے کہ دنیا سے دل نہ لگایا جائے اور اس کی ناپائیدار لذتوں اور راحتوں کو مطلوب و مقصود نہ بنایا جائے اور اس یقین اور زہد کا لازمی نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ اس کے حاصل ہو جانے کے بعد آدمی اللہ کے راستہ میں اور اعلیٰ مقاصد کے لیے

---

[۱] رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی دعاؤں میں آتا ہے "اللھم انی اسئلک ایمانا دائما یباشر قلبی ویقینا صادقا حتی اعلم انہ لا یصیبنی الا ما کتبت لی" اور ایک اور دعا کے الفاظ ہیں ـــ اللھم اقسم لنا........ من الیقین ما تھون بہ علینا مصائب الدنیا" ان دونوں دعاؤں میں بھی یقین کا یہی مطلب ہے۔ ۱۲

جان و مال خرچ کرنے میں بخل نہیں کرتا یعنی صاحبِ یقین اور زاہد کے لیے کسی اچھے مقصد کے لیے اور اللہ کی راہ میں زیادہ سے زیادہ مال خرچ کر دینا اور خطرات میں کود پڑنا آسان ہوجاتا ہے اور یہی مومن کی ساری ترقیوں کی کنجی ہے ـــــ اور جب مومن اِن صفات سے خالی ہوجائے یعنی بجائے اللہ پر یقین کے اس کا یقین اپنے مال پر ہوجائے اور وہ سمجھنے لگے کہ اگر مال میرے پاس ہوگا تو زندگی اچھی گزرے گی اور مال نہ ہوگا تو میں تکلیفوں اور مصیبتوں میں مبتلا ہوجاؤں گا، تو اس میں ضرور بخل پیدا ہوجائے گا اور اسی طرح جب زہد کی صفت اس میں نہ رہے گی اور دنیا اس کی مطلوب و مقصود بن جائے گی تو اس دنیا میں زیادہ سے زیادہ رہنے کی خواہش لازماً اس کے دل میں پیدا ہوجائے گی جس کو حدیث میں اَمَل سے تعبیر کیا گیا ہے اور ظاہر ہے کہ بخل اور اَمَل پیدا ہوجانے کے بعد مومن اپنے اصل مقام سے گرتا ہی چلا جائے گا۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اس ارشاد کی خاص غرض و غایت اور اس میں امت کے لیے خاص ہدایت یہ ہے کہ امت کی صلاح و فلاح کے لیے ضروری ہے کہ اس میں یقین اور زہد کی صفات پیدا کرنے کی اور ان ایمانی صفات کی حفاظت کی پوری فکر اور جد و جہد کی جائے اور بخل اور اَمَل (یعنی دنیا میں زیادہ رہنے کی آرزو) جیسی غیر ایمانی صفات سے اپنے قلوب کی حفاظت کی جائے۔ امت کی صلاح و فلاح اسی سے وابستہ ہے۔

(۵۷) عَنْ اَبِیْ ذَرٍّ عَنِ النَّبِیِّ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ قَالَ اَلزَّھَادَۃُ فِی الدُّنْیَا لَیْسَتْ بِتَحْرِیْمِ الْحَلَالِ وَلَا بِاِضَاعَۃِ الْمَالِ وَلٰکِنَّ الزَّھَادَۃَ فِی الدُّنْیَا اَنْ لَّا تَکُوْنَ بِمَا فِیْ یَدَیْکَ اَوْثَقَ مِمَّا فِیْ یَدَیِ اللّٰہِ وَاَنْ تَکُوْنَ فِیْ ثَوَابِ الْمُصِیْبَۃِ اِذَا اَنْتَ اُصِبْتَ بِھَا اَرْغَبَ فِیْھَا لَوْ اَنَّھَا اُبْقِیَتْ لَکَ۔

(رواہ الترمذی و ابن ماجہ)

(ترجمہ) حضرت ابوذر غفاری سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ "دنیا کے بارہ میں زہد اور اس کی طرف سے بے رغبتی (جو خاص ایمانی صفت ہے) وہ حلال کو اپنے پر حرام کرنے اور اپنے مال کو برباد کرنے کا نام نہیں ہے، بلکہ زہد کا معیار اور اس کا تقاضا یہ ہے کہ جو کچھ تمھارے پاس اور تمھارے ہاتھ میں ہو اس سے زیادہ اعتماد اور بھروسہ تم کو اس پر ہو جو اللہ کے پاس اور اللہ کے قبضہ میں ہے۔ اور

یہ کہ جب تم کو کوئی تکلیف اور ناخوش گواری پیش آئے تو اس کے اخروی ثواب کی چاہت اور رغبت تمہارے دل میں زیادہ ہو بہ نسبت اس خواہش کے کہ وہ تکلیف اور ناگواری کی بات تم کو پیش ہی نہ آتی۔

(ترمذی و ابن ماجہ)

(تشریح) لوگوں کو یہ غلط فہمی غالباً ہر زمانہ میں رہی ہے کہ زہد یہ ہے کہ آدمی دنیا کی ساری نعمتوں، راحتوں اور لذتوں سے بالکل دست بردار اور کنارہ کش ہو جائے، نہ کبھی لذیذ کھانا کھائے نہ برف یا ٹھنڈا پانی پئے، نہ اچھا کپڑا پہنے، نہ کبھی اچھے نرم بستر پر سوئے، اور اگر کہیں سے کچھ آجائے تو اس کو کبھی اپنے پاس نہ رکھے خواہ جلدی سے کہیں پھینک ہی دے، ــــــ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس حدیث میں اسی غلط خیالی کی اصلاح فرمائی ہے آپ کے ارشاد کا حاصل یہ ہے کہ زہد کا مطلب یہ نہیں ہے کہ اللہ نے اپنی جن نعمتوں کا استعمال بندوں کے لیے حلال کیا ہے آدمی ان کو اپنے پر حرام کرلے، اور اگر روپیہ پیسہ ہاتھ میں آئے تو اسے برباد کر دے، بلکہ زہد کا معیار اور تقاضا یہ ہے کہ جو کچھ اس دنیا میں اپنے پاس اور اپنے ہاتھ میں ہو اس کو فانی اور ناپائیدار یقین کرتے ہوئے اس پر اعتماد اور بھروسہ نہ کرے اور اس کے مقابلہ میں اللہ کے غیر فانی غیبی خزانوں پر اور اس کے فضل پر زیادہ اعتماد اور بھروسہ کرے، اور دوسرا معیار اور دوسری علامت زہد کی یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کے حکم سے جب کوئی مصیبت اور تکلیف بندہ کو پہونچ جائے تو اس کے اُخروی اجر و ثواب کی چاہت اور رغبت اس کے دل میں اس مصیبت اور تکلیف کے نہ پہنچنے کی آرزو سے زیادہ ہو، یعنی بجائے اس کے کہ اُس کا دل اس وقت یہ کہے کہ کاش یہ تکلیف مجھے نہ پہنچی ہوتی، اس کے دل کا احساس یہ ہو کہ آخرت میں مجھے اس تکلیف کا جو اجر و ثواب ملے گا، انشاء اللہ وہ تکلیف نہ پہنچنے کے مقابلہ میں میرے لیے ہزاروں درجہ بہتر ہوگا ــــــ اور ظاہر ہے کہ آدمی کا یہ حال جب ہی ہو سکتا ہے جب کہ اس کو عیشِ دنیا کے مقابلہ میں عیشِ آخرت کی زیادہ فکر ہو ــــــ اور یہی زہد کی اصل واساس ہے۔

اس حدیث سے کسی کو یہ غلط فہمی نہ ہو کہ بندوں کو اس دنیا میں عافیت اور راحت کے بجائے تکلیف اور مصیبت کی تمنا اور اللہ تعالیٰ سے اس کی دعا کرنی چاہیے! دوسری حدیثوں میں اس سے صریح ممانعت آئی ہے، اور صحیح روایات میں ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم صحابہ کرام کو ہمیشہ تاکید

(باقی صفحہ ۹ پر)

بریلی کا تکفیری فتنہ

ماضی ــــــ اور ــــــ حال

از محمد منظور نعمانی

قریباً دو ڈھائی سال سے ہندستان کے مختلف علاقوں سے اس عاجز کے نام خطوط آتے رہتے ہیں کہ بریلوی سلسلہ کے فلاں یا فلاں مولوی صاحب ہمارے یہاں آئے ہوئے ہیں اور ہندوستان کے فلاں فلاں اکابر علماء اور بزرگان دین کی طرف ایسے ایسے گندے عقیدے منسوب کرکے اُن کی تکفیر کرتے ہیں ــــ اسی طرح جمعیۃ العلماء اور تبلیغی جماعت کے خلاف بھی نہایت اشتعال انگیز تقریر کرتے ہیں اور ان جماعتوں سے تعلق رکھنے والے تمام مسلمانوں کو بھی کافر بناتے ہیں اور عام مسلمان جو اُن کی تقریروں میں شریک ہوتے ہیں وہ اُن سے ہاتھ اٹھوا اٹھوا کے ان جماعتوں کی مخالفت کا عہد لیتے ہیں، جس کی وجہ سے یہاں سخت خانہ جنگی اور فتنہ و فساد کی صورت پیدا ہو گئی ہے اور دین کی خدمت کرنے والوں کو مسلمانوں میں کام کرنا مشکل ہو رہا ہے ــــ لہٰذا ان کا جواب دینے کے لیے فوراً آئیے۔

یہ ناچیز اپنی خاص مصروفیات اور مشاغل کی وجہ سے ان خطوط کا مفصل جواب اور تفصیلی مشورہ بھی نہیں دے سکتا، ادھر چند مہینوں سے ایسے خطوط کی تعداد زیادہ بڑھ گئی ہے بلکہ اسی ہفتہ صوبۂ بہار کے میرے ایک بڑے محترم بزرگ اور عالم دین کا ایک تار بھی آیا، جس میں انھوں نے اسی خدمت کے لیے مجھے پہلی ٹرین سے صوبۂ بہار کے ایک شہر میں پہونچنے کا اصرار کے ساتھ حکم دیا تھا۔

اب میں نے ضروری سمجھا کہ اس فتنہ کی مختصر تاریخ اور اُسکے بارہ میں اپنی رائے، اپنا مشورہ اور اپنا طرزِ عمل کچھ تفصیل سے لکھ کر الفرقان میں شائع کرا دوں ــــ اسی خیال سے قلم ہاتھ میں لیا تھا،

ارادہ زیادہ لمبا مضمون لکھنے کا نہ تھا، لیکن بلا قصد یہ ذرا طویل ہو گیا، مگر امید ہو کہ جس غرض سے لکھا گیا ہو انشاء اللہ اس کے لیے نافع اور کافی ہوگا۔ واللہ الموفق]
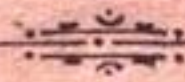
بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

اس دنیا میں بعض واقعات اس قدر عجیب و غریب اور بعید از قیاس ہوتے ہیں کہ عقل ہزار سر مارے مگر ان کی کوئی معقول توجیہ کرنے سے عاجز ہی رہتی ہو ـــــ حضرات انبیاء علیہم السلام اور اُن کی دینی دعوت کے ساتھ ان کی قوموں نے عام طور سے جو سلوک کیا وہ بھی دنیا کے انھیں عجیب و غریب اور بعید از قیاس واقعات میں سے ہو ـــــ خود اس دنیا کے پیدا کرنے والے اور چلانے والے خالق و پروردگار نے کتنے عجیب انداز میں اس پر حسرت کا اظہار کیا ہے ـــــ "يَا حَسْرَةً عَلَى الْعِبَادِ مَا يَأْتِيهِم مِّن رَّسُولٍ إِلَّا كَانُوا بِهِ يَسْتَهْزِئُونَ ۝ (یٰس ع ۲)

مثال کے طور پر صرف خاتم النبیین سیدنا حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہی کی سرگزشت کو اس نظر سے حدیث و سیر کی کتابوں میں دیکھ لیا جائے ـــــ آپ مکہ معظمہ میں پیدا ہوئے، وہیں پلے بڑھے، بچپن ہی سے صورت میں دلکشی و محبوبیت اور عادات میں معصومیت تھی۔ اس لیے ہر ایک محبت و احترام کرتا تھا، گویا آپ پوری قوم کو پیارے اور اس کی آنکھ کے تارے تھے، پھر جب عمر مبارک چالیس سال کی ہوئی تو اللہ تعالیٰ نے صورت و سیرت کی اس محبوبیت و معصومیت کے ساتھ نبوت کا کمال اور رسالت کا جلال و جمال بھی عطا فرما دیا، جس کے بعد سیرت اور زیادہ بلند ہو گئی، زبان سے علم و حکمت کے چشمے پھوٹنے لگے اور پیدائشی حسین و جمیل چہرہ میں اب نبوت کا نور بھی چمکنے لگا ـــــ پھر اللہ تعالیٰ کی طرف سے حکم ہوا کہ اپنی قوم کو توحید اور اسلام کی دعوت دیں، آپ نے پورے اخلاص، کامل محبت اور انتہائی حکمت کے ساتھ درد اور سوز سے بھری ہوئی اُس آواز میں جس سے پتھر بھی متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتے اپنی قوم کے سامنے توحید اور اسلام کی وہ دعوت پیش کی جس کا حق اور معقول ہونا اور آپ کی قوم اور ساری انسانیت

لہ ہائے کیسی حسرت ہو ان بندوں پر ہماری طرف سے جو رسول بھی ان کے پاس پہونچے یہ ان کے ساتھ تمسخر اور استہزاء سے ہی پیش آئے۔

کے لیے سراسر رحمت ہونا گویا بالکل بدیہی تھا ــــــ عقل کا فیصلہ اور قیاس کا تقاضہ یہی تھا کہ پوری قوم جو پہلے ہی سے آپ کی گرویدہ تھی اور آپ کو صادق و امین سمجھتی اور کہتی تھی وہ آپ کی اس دینی دعوت پر ایک زبان ہو کر لبیک کہتی اور پروانہ وار آپ پر ٹوٹ پڑتی اور کم از کم مکہ میں تو ایک بھی مکذب اور مخالف نہ ہوتا، لیکن ہوا یہ کہ گنتی کے چند سعادت مندوں کے سوا ساری قوم آپ کی تکذیب اور مخالفت پر متفق ہو گئی، جو ہمیشہ سے صادق و امین کہتے اور عقیدت کے پھول چڑھاتے تھے، وہی شاعر و مجنون اور ساحر و کذاب کہنے لگے اور آپ کے خلاف نفرت و عداوت کی آگ بھڑکانا ان کا محبوب ترین مشغلہ بن گیا، پھر تو قریباً دس سال تک آپ کے ان ہی جاننے پہچاننے والوں نے اس قدر ستایا اور ایسی ایسی کمینہ حرکتیں کیں کہ خود ارشاد فرماتے ہیں ــــــ "ما اوذی فی اللہ احدٌ مثل ما اوذیت" (اللہ کی راہ میں اُس کے کسی بندہ کو کبھی اتنا نہیں ستایا گیا جتنا کہ مجھے ستایا گیا ہو)

بیچاری عقل حیران ہو کہ ایسا کیوں ہوا؟ کوئی نہیں کہہ سکتا کہ ان دنوں مکہ میں دماغوں کو خراب کر کے آدمیوں کو پاگل بنا دینے والی کوئی خاص ہوا چلی تھی جس کے اثر سے ساری قوم کی قوم پاگل ہو گئی تھی، اور آپ کے ساتھ یہ جو کچھ اس نے کیا وہ پاگل پنے کی وجہ سے کیا۔

اسی کی دوسری مثال امت میں لیجئے! حضرت ابو بکر صدیقؓ، حضرت عمر فاروقؓ، حضرت عثمان غنیؓ اور حضرت علی مرتضیٰؓ (رضی اللہ عنہم اجمعین) یہ چاروں بزرگ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے جلیل القدر صحابی ہیں اور اسلام اور پیغمبر اسلام علیہ الصلوٰۃ والسلام کی تاریخ سے کچھ بھی واقفیت رکھنے والا ہر شخص جانتا ہو کہ اللہ و رسول کے ساتھ اور ان کے مقدس دین کے ساتھ ان چاروں بزرگوں کی وفاداری اور اُن کا اخلاص ہر قسم کے شک و شبہ سے بالاتر ہو، اللہ کے ان صادق بندوں اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ان جاں نثاروں نے حضور کے زمانہ میں اور آپ کے بعد اسلام کے لیے جو کچھ قربانیاں کیں اور اللہ کے اس مقدس دین کی جو خدمات انجام دیں وہ آفتاب سے زیادہ روشن اور دنیا کے زیادہ سے زیادہ مشہور و مسلّم واقعات سے زیادہ مسلّم و مستند ہیں، پھر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بہت سے مواقع پر اپنے ان چاروں جاں نثاروں کی خدمات اور قربانیوں کا جس محبت اور قدر دانی کے ساتھ اعتراف فرمایا اور ان کے مقبول اور جنتی ہونے اور جنت میں بھی اپنے پاس اور اپنے ساتھ رہنے کی بار بار جو شہادتیں اور بشارتیں دیں وہ اپنے تواتر کی وجہ سے قریب قریب ایسی ہی یقینی اور ناقابل شک ہیں جیسا کہ عقیدہ

توحید و عقیدۂ قیامت اور نماز اور روزہ اور حج و زکوٰۃ کا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیمات سے ہونا قطعاً غیر مشتبہ اور یقینی ہو ــــــ لیکن غور کیجیے اس امت کی تاریخ کا یہ کیا عجیب و غریب اور ناقابل فہم واقعہ ہو کہ اسلام کے بالکل ابتدائی دور ہی میں خود مسلمانوں میں ایسے مستقل فرقے پیدا ہوئے جن کی خصوصیت اور جن کا امتیاز صرف یہی ہو کہ ان کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ان جلیل القدر اور ممتاز صحابہ کے ان ہی سے انکار تھا اور وہ (معاذ اللہ) ان کو کافر و منافق اور گردن زدنی کہنے پر مصر تھے اور ابتک بھی یہ فرقے دنیا میں موجود ہیں ــــــ کون نہیں جانتا کہ مسلمانوں کے قدیم ترین فرقہ شیعہ کی خصوصیت اور اس کا امتیاز ہی یہ ہو کہ حضرت ابوبکرؓ، حضرت عمرؓ اور حضرت عثمانؓ کی عداوت و بدگوئی اور ان کے مومن و مخلص ہونے سے انکار ان کے مذہب کی بنیاد یا کم از کم ان کا مذہبی شعار ہو۔ اور اس معاملہ میں ان کا غلو اور جنون اس حد کو پہونچا ہوا ہو کہ ان کے بہت سے چوٹی کے "مہذب" اور "تعلیم یافتہ" افراد "تہذیب و رواداری" کے اس دور میں بھی اپنے اس حال کے اظہار سے نہیں شرماتے کہ ان بزرگوں کی تعریف و مدح میں کسی اور کا بھی کچھ کہنا ان کے لیے ناقابل برداشت ہو اور اس کے برعکس ان پاک ہستیوں پر تبرا بازی ان کا محبوب ترین مشغلہ اور ان کے نزدیک کار ثواب ہو۔

ناطقہ سر بگریباں کہ اسے کیا کہیے!

غلاف عقل مناظرانہ کج بحثیوں کو تو چھوڑ دیجیے اور پھر ٹھنڈے دل سے غور کیجیے کہ کیا کسی کی عقل بھی ان لوگوں کے اس طرز عمل کی کوئی معقول توجیہ کر سکتی ہو؟ ــــــ کون کہہ سکتا ہو کہ اس فرقہ والے سب پاگل اور عقل عام سے محروم ہیں، واقعہ یہ ہو کہ ان میں بڑے بڑے تعلیم یافتہ، بڑے بڑے دانشور، اور ایک سے ایک ذہین و فطین، ہر دور میں رہے ہیں اور آج بھی موجود ہیں، بلکہ اس فرقہ کے جن ممتاز عالموں اور مصنفوں نے خاص اسی موضوع (مطاعن خلفاء ثلثہ) پر ضخیم ضخیم کتابیں لکھی ہیں، ان کی وہی کتابیں شاہد ہیں کہ نہ وہ پاگل ہیں نہ بے خبر جاہل ہیں، بلکہ ــــــ "اَضَلَّہُ اللّٰہُ عَلٰی عِلْمٍ" کا قابل عبرت نمونہ ہیں۔

یہی حال ان کے اصل حریف اور مدمقابل فرقہ یعنی خوارج و نواصب کا ہو، ان بدبختوں کے نزدیک سیدنا حضرت علی کرم اللہ وجہہ (معاذ اللہ) ایسے بددین، اس درجہ کے دشمن اسلام، ایسے مجرم اور گردن زدنی تھے کہ ان کو ختم کر دینا نہ صرف کار ثواب بلکہ ان کے قاتل کے جنت میں پہونچنے کا یقینی

ذریعہ تھا، مورخین نے لکھا ہے کہ جب شقی ابن ملجم نے سیدنا حضرت علی رضی اللہ عنہ پر تلوار سے وار کیا اور اس کو معلوم ہو گیا کہ وار بھرپور پڑا اور حضرت ممدوح کی زندگی ختم کر دینے کے اپنے منصوبہ میں وہ کامیاب ہو گیا تو گرفتار ہو جانے کے باوجود وہ کہتا تھا کہ "فُزْتُ وَرَبِّ الْكَعْبَة" (اس بدبخت کا مطلب یہ تھا کہ (سیدنا) علی کو خاک و خون میں تڑپا کے اور ان کی شمع حیات گل کر کے میں نے تو نجات اور جنت حاصل کرنے کا سامان کر لیا، اور خواہ اس زندگی میں اب مجھ پر کچھ بھی گزرے، لیکن مرنے کے بعد آخرت کی کبھی نہ ختم ہونے والی زندگی میں میرا یہ عمل مجھے جنت میں ضرور پہونچادے گا۔) ——— بتلائیے! کہ عقل بیچاری اس گمراہی اور عقل باختگی کی کیا توجیہ کرے؟ ——— جو لوگ تاریخ کے ذریعہ ابن ملجم اور اس کے فرقہ کے حالات سے واقف ہیں وہ جانتے ہیں کہ یہ فرقہ بھی پاگلوں اور ان پڑھ جاہلوں کا فرقہ نہ تھا، بلکہ ان میں بہت سے اچھے خاصے علم و فہم والے بھی تھے ——— اصل بات یہ ہے کہ جب کوئی شخص حُبِّ مال یا حُبِّ جاہ یا ایسے ہی کسی اور غلط جذبہ کے تحت کسی معاملہ میں اللہ کی ہدایت کے بجائے اپنے نفس کی خواہشات اور اپنے ذاتی جذبات و خیالات کی پیروی کا فیصلہ کر لیتا ہے تو کم از کم اس خاص معاملہ میں خدا ترسی و حق بینی کی صلاحیت اور فہم سلیم کی دولت اس سے چھین لی جاتی ہے، اور پھر بظاہر عقل و ہوش رکھنے کے باوجود اس سے اس معاملہ میں ایسی ایسی حرکتیں سرزد ہوتی ہیں کہ عقل سلیم ان کی کوئی توجیہ بھی نہیں کر سکتی ایسے ہی لوگوں کے متعلق قرآن مجید کا بیان ہے۔ لَهُمْ قُلُوبٌ لَّا يَفْقَهُونَ بِهَا وَلَهُمْ آذَانٌ لَّا يَسْمَعُونَ بِهَا وَلَهُمْ أَعْيُنٌ لَّا يُبْصِرُونَ بِهَا إِنْ هُمْ إِلَّا كَالْأَنْعَامِ بَلْ هُمْ أَضَلُّ۔[1]

عقل و خرد کی گمراہی کی ایسی مثالیں اسلامی تاریخ کے بعد کے دوروں میں بھی بکثرت ملتی ہیں۔ اور مختلف زمانوں میں ایسے لوگ پیدا ہوتے رہے ہیں جنھوں نے اپنے زمانہ کے اچھے سے اچھے اور نہایت پاک سیرت بندوں کی عداوت و دشمنی اور بدگوئی و ایذارسانی کو اپنا خاص مشغلہ بنایا، بلکہ شاید امت کے اکابر و ائمہ میں سے شاذ و نادر ہستیاں ہی ایسی ہوں گی جن کو نبوت کی اس میراث سے حصہ نہ ملا ہو ——— شیخ تاج الدین سبکی نے "طبقات الشافعیۃ الکبریٰ" میں رنج اور غصہ کے ساتھ لکھا ہے۔

---

[1] ان کے دل ہیں مگر یہ ان سے سمجھتے نہیں، ان کے کان ہیں مگر یہ ان سے سنتے نہیں، ان کی آنکھیں ہیں مگر یہ ان سے دیکھتے نہیں، یہ تو بس جانوروں کی طرح ہیں بلکہ ان سے بھی گئے گزرے اور زیادہ گمراہ ہیں۔

مامن امام الا وقد طعن فیہ طاعنون وھلک فیہ ھالکون ○	امت کا کوئی امام ایسا نہیں ہو جس کو حملہ کرنے والوں نے اپنے حملوں کا نشانہ نہ بنایا ہو۔ اور جس کی شان میں گستاخیاں کر کے ہلاک ہونے والے ہلاک نہ ہوئے ہوں۔

اس وقت جس افسوسناک اور تکلیف دہ واقعہ کے متعلق کچھ عرض کرنا ہو وہ بھی اسی سلسلہ کی ایک کڑی ہو؛

حقیقتوں کا پورا علم تو اللہ تعالیٰ ہی کو ہو لیکن جہاں تک بشری معلومات اور اطلاعات کا تعلق ہو اپنے دل کے پورے اطمینان کے ساتھ اور بلاخوف تردید کہا جاسکتا ہو کہ حضرت شاہ ولی اللہؒ وشاہ عبدالعزیزؒ کے بعد تیرھویں صدی ہجری (اور انیسویں صدی عیسوی) میں، ان کے خلاف و وارثین حضرت شاہ اسمٰعیل شہید و حضرت سید احمد شہید اور ان کے رفقاء نے اللہ کی راہ میں جو قربانیاں دیں اور اسلام کے فروغ اور اس کی سرسبزی کے لیے جو محنتیں کیں، یہاں تک کہ بالاکوٹ کے معرکہ میں اسی راہ میں اپنی جانیں بھی قربان کر دیں، اور پھر اُن کی ان محنتوں اور قربانیوں کا یہاں کے مسلمانوں پر جو اثر پڑا اور اس ملک میں دین کی جو تجدید ظہور میں آئی، اور صلاح و تقویٰ اور تعلق باللہ اور روحِ جہاد اور اتباعِ سنت کی صفات کو جو نئی زندگی اس ملک میں ملی اور اِن صفات میں خود ان بزرگوں کا جو حال تھا، ان سب چیزوں کے پیش نظر رکھنے کے بعد اس میں کوئی شبہ نہیں رہتا کہ یہ حضرات اس دور میں اللہ تعالیٰ کے خاص مقبول بندوں میں سے تھے ——— پھر بعد کے دور میں (یعنی تیرھویں صدی کے آخر اور چودھویں صدی کے شروع میں) ان ہی مجاہدینِ ملت اور مصلحینِ امت کے علمی و روحانی وارثین حضرت مولانا محمد قاسم نانوتوی اور حضرت مولانا رشید احمد گنگوہی، اور ان کے خاص رفقاء کو اللہ تعالیٰ نے اس ملک میں اپنے مقدس دین کی حفاظت و خدمت کی جو توفیق دی اور ان کی جدوجہد سے توحید و سنت اور عام اسلامی تعلیمات کی اس ملک میں جو اشاعت ہوئی اور علم و عمل اور عشق و فنائیت کی جامعیت کے لحاظ سے خود ان بزرگوں کا جو حال تھا، اور یہ مبارک صفات اُن کے ذریعہ امت کے مختلف طبقات میں جس وسیع پیمانہ پہ پھیلیں، ان سب چیزوں کو اور ان کے اثرات و ثمرات کو آنکھوں سے دیکھنے کے بعد دل کو اس میں ذرا شبہ نہیں رہتا کہ یہ حضرات اس دور کے خاصانِ خدا میں سے تھے جن کو اللہ تعالیٰ نے اپنے دین کی خدمت اور توحید و سنت کی اشاعت کے لیے، اور

اُن کے قلوب کو اپنے خاص تعلق کے واسطے چن لیا تھا ــــــ لیکن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے خلفاء راشدین کی وراثت و نیابت میں ان بندگانِ خدا کے ساتھ بھی یہی ہوا کہ اس دور میں کچھ ایسے لوگ بھی پیدا ہوئے جنھوں نے ان حضرات کو بدنام کرنا اور اُن پر جھوٹی تہمتیں لگا لگا کر مسلمانوں میں ان کے خلاف نفرت پیدا کرنا اپنا مشغلہ بنا لیا ــــــ

تیرھویں اور چودھویں صدی کے ان مجاہدین فی سبیل اللہ اور محافظین سنت و شریعت و مصلحین اُمت کے خلاف فتوے بازی اور فتنہ انگیزی و افترا پردازی میں اس دور کے جن صاحب نے سب سے زیادہ حصہ لیا اور جو "وَالَّذِي تَوَلَّىٰ كِبْرَهُ" کے مصداق ہیں وہ بریلی کے مولوی احمد رضا خاں صاحب ہیں جو اپنی اس تکفیر بازی ہی کی وجہ سے یہ مقام حاصل کر چکے ہیں کہ ایمان والوں کی بے پناہ تکفیر کی مثال میں عام طور سے ان ہی کا نام بطور ضرب المثل کے زبانوں پر آتا ہے۔

ان خاں صاحب نے پہلے تو عرصہ تک حضرت شاہ اسمٰعیل شہیدؒ کو اپنی بدگوئی اور کفر بازی کا نشانہ بنایا اور اپنے رسالوں اور فتووں میں ایسے ایسے گندے اور خبیث عقیدے ان کی طرف منسوب کیے جن کی نقل سے بھی ایمانی روح لرزتی ہے، برسوں ان بزرگوار کا یہی مشغلہ رہا، ایک ایک رسالہ اور فتوے میں راہِ خدا کے اس شہید کو ستر ستر اور پچھتر پچھتر وجہ سے کافر ثابت کر کے یہ اپنے شوقِ تکفیر کا مظاہرہ کرتے رہے۔

اس کے بعد انھوں نے اسی ولی اللّٰہی خاندان کے علمی و روحانی وارثین حضرت مولانا محمد قاسم نانوتوی اور حضرت مولانا رشید احمد گنگوہی وغیرہ اکابر جماعت کو اپنی مشق ستم کے لیے انتخاب کیا اور پھر زندگی بھر ان ہی بزرگوں کی بدگوئی اور تکفیر کر کر کے ان کے حسنات میں اضافہ اور درجات میں ترقی کا سامان کرتے رہے ــــــ سب سے پہلے سنہ ۱۳۲۰ھ میں اپنی کتاب "المعتمد المستند" میں ان حضرات کو انکار ختم نبوت اور تکذیب رب العزت اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تنقیص اہانت کا مجرم قرار دے کر ان کی قطعی تکفیر کی ــــــ لیکن ان کی فتوے بازی اور کافرسازی چونکہ نہایت بدنام اور رسوا ہو چکی تھی اس لیے اس کا کوئی اثر نہیں ہوا، یہاں تک کہ جن بزرگوں کی تکفیر کی گئی تھی انھوں نے بھی کوئی نوٹس نہیں لیا۔

مولوی احمد رضا خاں صاحب نے اپنے فتوے کا یہ حشر دیکھ کر ایک نیا منصوبہ بنایا، سنہ ۱۳۲۳ھ

میں ان بزرگوں کی تکفیر کا ایک فتویٰ انھوں نے مرتب کیا جس میں وہی انکارِ ختم نبوت اور تکذیب رب العزت و اہانت حضرت رسالت جیسے صریح کفریات کو ان بزرگوں کی طرف منسوب کرکے ان کی قطعی تکفیر کی، ایسی قطعی تکفیر کہ جو شخص ان کو مسلمان مانے یا ان کے کافر ہونے میں شک بھی کرے، اس کے بارے میں بھی لکھا کہ وہ بھی قطعی کافر، دائرۂ اسلام سے خارج اور جہنمی ہے ــــــ تکفیر کی اس سراسر جعلی اور مفتریانہ دستاویز کو لے کر مولوی احمد رضا خاں صاحب اسی سال حجاز گئے اور مکہ معظمہ اور مدینہ طیبہ کے حضرات علماء و مفتیین کے پاس پہونچ کر نہایت ہی عیارانہ اور پرفریب انداز میں ان حضرات سے فریاد کی کہ ہندوستان میں اسلام پر بڑا سخت وقت آگیا ہے، مسلمانوں ہی میں بعض لوگ ایسے ایسے کافرانہ عقائد رکھنے والے پیدا ہو گئے ہیں اور عام مسلمانوں پر بھی ان کا اثر پڑ رہا ہے، ہم غرباء اس فتنہ کی روک تھام کر رہے ہیں مگر اس مہم میں ہم کو آپ کی اس مدد کی ضرورت ہے کہ ان بدعقیدہ لوگوں کی تکفیر کے اس فتوے کی آپ حضرات بھی تصدیق فرمادیں، چونکہ آپ اللہ کے مقدس گھر اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاک شہر کے رہنے والے ہیں اس لیے دینی رہنمائی کے بارہ میں ہندوستان کے ہم مسلمانوں کو آپ ہی حضرات پر پورا اعتماد ہے، اور اس کی وجہ سے اس فتوے پر آپ ہی کی تصدیقی مہریں ہندستان کے عام مسلمانوں کو کفر و بددینی کے اس سیلاب میں بہنے سے روک سکتی ہیں ورنہ فتنہ ایسا شدید ہے کہ ان کا ایمان پر قائم رہنا مشکل ہے، المدد المدد اے خدا کے شیرو! الغیاث الغیاث اے لشکرِ محمدی کے شہسوارو!![1]

الغرض مولوی احمد رضا خاں صاحب نے اُن علماءِ حرمین کے سامنے جو اصل واقعات سے بالکل بے خبر تھے اور اردو زبان سے واقف نہ ہونے کی وجہ سے ان اکابر جماعت دیوبند کی وہ کتابیں بھی نہیں پڑھ سکتے تھے جن کی طرف مولوی احمد رضا خاں صاحب نے انکار ختم نبوت وغیرہ کفریہ مضامین منسوب کیے تھے۔ اپنا یہ جعلی فتویٰ اس انداز میں اور اس تمہید کے ساتھ پیش کیا کہ گویا ہندوستانی مسلمانوں کے ایمان کی حفاظت اب بس اس فتوے سے اور اس پر علماء حرمین کی تصدیقی مہریں لگ جانے سے

---

[1] مولوی احمد رضا خاں صاحب نے جو فتویٰ علماء حرمین کے سامنے پیش کیا تھا جو بعد کو "حسام الحرمین" کے نام سے چھپ کر شائع ہوا۔ یہ اسی کی تمہید کا حاصل اور خلاصہ ہے ــــــ جھوٹے آنسوؤں اور جھوٹی آہوں سے اللہ کے نیک اور بھولے بندوں کو متاثر کرنا مکاری کا ایک فن ہے اور مولوی احمد رضا خاں صاحب کی حسام الحرمین کی تمہید اس کا خاص نمونہ ہے، ہم نے تو صرف اپنے الفاظ میں اس کا حاصل اور خلاصہ لکھ دیا ہے۔

میں ہے، پس عورت کو بھی آزادیٔ نسواں کا ڈھول پیٹ پیٹ کر اس کے دائرۂ عمل سے باہر لانا اس کی ترقی کا نہیں بلکہ پورے معاشرہ کی تباہی کا باعث بنے گا، مثال میں یورپ کو پیش کیا گیا ہے کہ وہاں اس غلطی کا خمیازہ اب خاندانی اور معاشرتی انتشار کی اور پراگندگی کی شکل میں بھگتا جا رہا ہے ——— یہ بحث بجائے خود ٹھیک ہے مگر اس سے اسلامی پردہ ثابت نہیں ہوتا، ضرورت اس بات کی تھی کہ اس بے پردگی کے مقابلہ میں اسلامی پردہ کو اصول فطرت اور دلائل عقلیہ کی رو سے تمدن کی ایک ناگزیر ضرورت ثابت کیا جاتا۔

(ع۔س)

قرآن اور علم جدید

مصنفہ جناب ڈاکٹر رفیع الدین صاحب ایم اے۔ پی۔ ایچ۔ ڈی۔ شائع کردہ ادارۂ ثقافت اسلامیہ کلب روڈ لاہور (پاکستان) کاغذ سفید چکنا، صفحات ۶ء۷ مجلد قیمت صہ

الحاد و بے دینی کی جو وبا پھیلی ہوئی ہے اور بکثرت مسلمانوں کو روحانی موت کے گھاٹ اتار چکی ہے اس سے پریشانی اور بے چینی کا پیدا ہونا اور اس کے انسداد کی فکر کرنا ایمان کا تقاضا ہے۔ اسی تقاضے نے ڈاکٹر صاحب کو اس کتاب کی تالیف پر مجبور کیا۔ مصنف کے نزدیک الحاد و بیدینی کا یہ سیلاب باطل فلسفوں کے سوتوں سے نکلا ہے۔ جب تک انھیں بند نہ کیا جائے اس وقت تک اس کا رکنا ناممکن ہے اس رائے سے ایک حد تک ہم بھی متفق ہیں اور اس رائے سے تو ہمیں کامل اتفاق ہے کہ ان فلسفوں کی تردید اس سیلاب کو روکنے کے لئے ایک ضروری چیز ہے لیکن مؤلف نے اس مرحلہ کو سر کرنے کے لئے جو راستہ اختیار کیا ہے وہ بہت ہی خطرناک ہے۔ تاریخ کی روشنی میں دیکھئے تو آپ کو بکثرت ایسے اشخاص نظر آئیں گے جو قلب مخلص اور روشن دماغ رکھنے کے باوجود اس راہ پر پڑ کر ہلاک و برباد ہو گئے

ڈاکٹر صاحب کی رائے میں اس وبائے الحاد کا علاج یہ ہے کہ اسلام کو ایک فلسفہ کی حیثیت سے پیش کیا جائے اور قرآن مجید کی تشریح و تفسیر اس طرح کی جائے کہ گویا وہ بالفاظ مصنف ایک نصب العینوں کا فلسفہ (PHILOSOPHY OF IDEALS) ہے۔ عنوان تعارف کے ماتحت مصنف نے اپنے اس نظریہ کی خوب وضاحت کی ہے لیکن ہم پورے وثوق کے ساتھ کہہ سکتے ہیں کہ یہ طریقہ مفید ہونیکے بجائے سخت مضرت رساں ہے۔ اسلام ایک دین ہے نہ کہ کوئی فلسفہ۔ دین اور فلسفہ میں بنیادی اختلاف موجود ہے ایک کی تعبیر دوسرے سے کرنا کوئی معنی نہیں رکھتا۔ فلسفہ سوالات پیدا کرتا ہے مگر ان کے جواب سے قاصر ہے۔ دین حق فطرت کے سوالات کا جواب ہے۔ فلسفہ پیاس پیدا کرتا ہے اور اسے بڑھاتا ہے

لیکن اس کی تسکین سے قاصر ہے۔ دین اس آبِ شیریں کا نام ہے جو اس فطری پیاس کو تسکین دیتا ہے، اس لئے دین کو فلسفہ کہنا اس پر ظلم ہے۔

دین کی فلسفیانہ تعبیر ایک ایسی غلطی ہے جو ایک دوسری غلطی میں عموماً مبتلا کر دیتی ہے۔ یہ غلطی اس سے بھی زائد خطرناک ہوتی ہے۔ ڈاکٹر صاحب بھی اس میں مبتلا ہوئے ہیں اور انھوں نے بھی طبعی طور پر پہلا قدم دین و فلسفہ میں تطبیق کی طرف اٹھایا ہے۔ طبیعیات، نفسیات، اجتماعیات اور حیاتیات کے بعض جدید بنیادی نظریات کو لے کر انھوں نے قرآن مجید کے بیانات کو ان پر منطبق کیا ہے۔

خیانت ہوگی اگر ہم یہ کہیں کہ انھوں نے ڈارون، فرائڈ، ایڈلر، میکنا ویلی، مارکس وغیرہ کے نظریات کو جوں کا توں لے کر اسلام کے سر منڈھنے کی کوشش کی ہے۔ اُن کا قول یہ ہے کہ یہ سب نظریات بلکہ اس نوع کے کل نظریات صداقتوں اور غلطیوں کا مجموعہ ہوتے ہیں، ان میں سے صداقتوں کو چن کر کلمۃ الحکمۃ ضالۃ المومن پر عمل کرتے ہوئے قرآن مجید پر منطبق کرنا چاہئے اور دین کا اساسی حصہ بنا لینا چاہئے لیکن سوال یہ ہے کہ اس تجزیہ وتحلیل کے لئے کیا طریقہ اختیار کرنا چاہئے اور یہ کس حد تک ممکن ہے کہ کسی نظریہ کے صادق وکاذب، صحیح اور غلط اجزاء کو جو ایک دوسرے کے ساتھ اس طرح مخلوط ہو چکے ہیں کہ دوئی کی لہر بھی نہیں محسوس ہوتی علیحدہ علیحدہ کر دیا جائے۔ ہم اس تجزیہ پر علمی و فنی اغراض کے لئے تو اعتماد کر سکتے ہیں لیکن اس حد تک اعتماد نہیں کر سکتے کہ ان اجزا کو اساس دین بنا لیں۔ اگر اس تجزیہ میں ہم کامیابی کا دعویٰ بھی کریں تو دوسرا سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ جن اجزا کو ہم صداقت کی سند دے رہے ہیں ان کی صداقت کا معیار کیا ہے اور انھیں صحیح سمجھنے میں ہم کہاں تک حق بجانب ہیں؟

جہاں تک بدیہی امور کا تعلق ہے ان کے متعلق کسی کد وکاوش کی حاجت نہیں ہے۔ کلام تو نظری امور میں ہے۔ کسی نظریہ کے جن اجزاء کو صداقتوں کے نام سے آپ نے پیش کیا ہے اگر وہ نظری ہیں تو ان میں تبدیلی کی ہمیشہ گنجائش ہے اگر آپ انھیں دین کا جزء بنائیں گے تو اس کے معنی یہ ہوں گے کہ اسلام کے اساسی تصورات میں ہمیشہ تبدیلی ہوتی رہے۔

فاضل مصنف کا ذہن رسا بھی اس اشکال سے دوچار ہوا ہے لیکن انھوں نے اس کے دو جواب دئے ہیں، پہلے جواب کا خلاصہ یہ ہے کہ علوم کے یہ تغیرات صداقت کی جانب اقدام کا نتیجہ ہیں اس لئے ہر نظریہ کے لئے ایک ایسی منزل ناگزیر ہے جس پر پہنچ کر وہ خالص صداقت کو پانے میں کامیاب

ہو جائے۔ لیکن اس کا کیا ثبوت ہے کہ وہ منزل آگئی، ہو سکتا ہے کہ ہم نے سراب کو آب سمجھا ہو، اور راہ کو منزل۔

دوسرے جواب کا حاصل یہ ہے کہ قرآن مجید معیار صداقت ہے، جب سائنس کا کوئی نتیجہ روح قرآن کے ساتھ مطابق ہو جائے تو وہ صحیح ہے اور اس میں تبدیلی کی گنجائش باقی نہیں رہتی۔ یہ اصول مصنف کے اخلاص کا آئینہ دار ہے لیکن اس کی عملی شکل اس کی افادیت کو کم کر دیتی ہے، چنانچہ خود فاضل مصنف نے اس اصول کو جو عملی جامہ پہنایا ہے وہ اس کے جسم پر کسی طرح فٹ نہیں ہوتا۔ چند سطروں کے بعد ہم اس مسئلہ پر ذرا تفصیل سے بحث کریں گے۔ روح قرآن کا لفظ بھی بہت مبہم ہے، جس کی تفصیل و تشریح پر اچھی خاصی گفتگو ہو سکتی ہے اور اس کے بارے میں ایک دو نہیں بہت سی رائیں ہو سکتی ہیں۔ اس لئے مصنف کا یہ جواب اشکال کو حل کرنے کے بجائے اور پیچیدہ کر دیتا ہے

کتاب کے حصہ اول میں مصنف نے موجودہ دور کے اہم اور بنیادی سائنٹفک اور فلسفیانہ نظریات کی مختصر توضیح کی ہے۔ انھوں نے جس قابلیت کے ساتھ اختصار اور جامعیت دونوں کی رعایت کی ہے اور ان علمی مضامین کو عام فہم بنانے کی جو کامیاب کوشش کی ہے اس کی داد نہ دینا ظلم ہے۔ دوسرا حصہ ان نظریات پر تنقید کے لئے مخصوص ہے۔ ڈاکٹر صاحب نے ان کے جن اجزاء کو غلط اور روح قرآن کے خلاف سمجھا ہے ان پر بہت اچھے انداز میں تنقید کی ہے اور ان کی علمی غلطی کی کامیاب وضاحت کی ہے لیکن اس مرحلے سے گزرنے کے بعد جو راستہ انھوں نے اختیار کیا ہے وہ بہت سنگلاخ اور خطرناک ہے معقول اور منقول کی تطبیق میں ڈاکٹر صاحب نے سخت ٹھوکریں کھائی ہیں اور اصل راہ سے بہت دور نکل گئے ہیں۔

مثال کے طور پر ہم تخلیق کائنات کے متعلق مصنف کا نقطۂ نظر پیش کرتے ہیں۔ اس مسئلہ کے متعلق انھوں نے ڈارون کے نظریۂ ارتقاء کے بعض اجزاء کو تسلیم کر لیا ہے اور یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ یہ اجزاء روح قرآن کے مطابق ہیں اور قرآن مجید کا نقطۂ نظر اس بارے میں وہی ہے جو ڈارون پیش کرتا ہے۔

اس سلسلہ میں آیات قرآنی کی جو توضیحات انھوں نے پیش کی ہیں وہ بعض مقامات پر تحریف کی حد کو

پہونچ گئی ہیں۔ صفحہ ۵۴ پر انھوں نے پوری قوت کے ساتھ دعویٰ کیا ہے کہ

"ساری تخلیق درحقیقت قوانین ہی کی تخلیق ہے۔ نئے نئے قوانین کے ظہور میں آنے کو تخلیق (CREATION) کہتے ہیں اور ارتقا (EVOLUTION) بھی اسی کا نام ہے"

تخلیق کے یہ معنی قرآن مجید کی کس آیت سے ثابت ہیں؟ یا کس حدیث میں تخلیق کی یہ تفسیر وارد ہوئی ہے قوانین فطرت (LAWS OF NATURE) کا نظریہ بہت پرانا ہو چکا، مدت ہوئی کہ سائنسداں اس کی تجہیز و تکفین سے فارغ ہو چکے ہیں۔ اس فرسودہ نظریہ کو تفسیر قرآن کی اساس بنانا کس قدر غلط ہے

نظریہ ارتقار کے متعلق ڈاکٹر صاحب نے جس حسن ظن کا اظہار فرمایا ہے وہ حیرت انگیز ہے۔ مصنف کا یہ فرمانا کہ نظریہ ارتقا ایک مسلمہ و ناقابل انکار حقیقت ہے جو بے شمار دلائل و شواہد پر مبنی ہے محض ناواقفیت پر مبنی ہے۔ اسباب سے قطع نظر خود ارتقار کا جو مفہوم ڈارون اور اس کے ہمنوا بیان کرتے ہیں، اس کی حیثیت ایک نظریہ سے زائد نہیں ہے، نہ وہ علمی دنیا کی مسلمہ حقیقت کہی جاسکتی ہے اور نہ وزنی دلائل کی تائید اسے حاصل ہے۔ اس نظریہ کو یورپ میں قبولیت عامہ ضرور حاصل ہوئی لیکن کسی شئے کا مقبول و پسندیدہ ہونا دوسری چیز ہے اور علمی مسلمات میں داخل ہونا دوسری شئے۔ قبولیت عامہ کا یہ سبب نہیں ہے کہ علمی حیثیت سے اس نظریہ کی کوئی قدر و قیمت ہے بلکہ یہ ہے کہ یہ نظریہ اہل یورپ کی گندی اور ناپاک زندگی سے بہت مناسبت رکھتا ہے اور ان کے ہر جرم و جور، بہیمیت و حیوانیت، بدکاری اور بے حیائی کے لئے ثبوت جواز فراہم کر دیتا ہے۔ دوسرے الفاظ میں یورپ کی تہذیب اور اس کی گندی زندگی نے اسے قبول کر لیا ہے لیکن اس کے علمی ذہن و فکر نے متفقہ طور پر آج تک اسے قبول نہیں کیا ہے جیمس جینز، آرنلڈ ایڈنگٹن اور اسی قسم کے دوسرے سائنسدانوں کے مضامین ملاحظہ فرمایئے خود کائنات کے وجود و تدریجی کا نظریہ ہی مشکوک و مشتبہ نظر آئے گا، چہ جائے کہ ڈارون کا پیش کیا ہوا تصور۔

مبینہ اسباب ارتقا کا ڈاکٹر صاحب نے انکار کیا ہے لیکن لطیفہ یہ ہے کہ یورپ میں جو چیز زیادہ مقبول ہے وہ یہی اسباب ارتقا ہیں۔ خود نظریہ ارتقا کی مقبولیت بھی بڑی حد تک انھیں کی مرہون منت ہے، یہی مغربی سیہ کاریوں کے لئے وجہ جواز فراہم کرتے ہیں۔ صرف بقار اصلح کے قوانین کی گردن پر نہ معلوم کتنے خون ہیں، خود نظریہ ارتقار تو ان کا طفیل ہے جو اس قسم کے

طبعزاد اصول کا پس خوردہ مردار کھاتا رہتا ہے۔ اگر انسانیت کے جسم سے ان کے دانت نکال دئے جائیں تو ممکن ہے کہ یہ نظریہ بھی یورپ کے دسترخوان پر سے اٹھا دیا جائے۔ اصول ارتقا کا انکار کرنے کے بعد خود ارتقا کا اقرار کرنے اور اسے خواہ مخواہ قرآن مجید کے سر مڑھنے میں معلوم نہیں جناب مصنف نے کیا فائدہ سوچا ہے۔

جہاں تک دلائل کا تعلق ہے یہ نظریہ ان کی قوت سے محروم ہے۔ اس کی بنیاد سراسر تخمینی اور محض فرضی امور پر قائم ہے۔ جو ہرگز کسی سائنٹفک یا فلسفیانہ نظریہ کی بنیاد بننے کے لائق نہیں کہے جاسکتے۔ بطور نمونہ اجسام متحجرہ (ناسل) ہی کے مسئلہ کو لے لیجئے جو اس نظریہ کی سنگین بنیاد سمجھا جاتا ہے، اس کے متعلق ایک محقق اور حقیقت پسند دماغ کتنے منطقی شبہات ظاہر کرسکتا ہے۔ اول تو یہ کہنا ہی دشوار ہے کہ ان اجسام میں سے کتنے واقعی ہیں اور کتنے محض فرضی اور جعلی۔ اس قسم کے واقعات یورپ میں پیش آچکے ہیں اور آتے رہتے ہیں کہ مصنوعی کھوپڑی کو محض رقم وصول کرنے کے لئے قدیم انسان کی کھوپڑی ظاہر کیا گیا اور ماہرین سائنس کو برسوں فریب میں مبتلا رکھا گیا۔ پھر یہ بھی عین ممکن ہے کہ ان کی شکل وشباہت میں امراض یا دوسرے خارجی اور عارضی اسباب و موثرات کی وجہ سے فرق ہو گیا ہو یہ ڈھانچے بے زبان ہیں اس کا کیا ثبوت ہے کہ ہم جس ڈھانچے کو انسانی ڈھانچہ سمجھ رہے ہیں وہ واقعی انسانی ڈھانچہ ہے یا اس کی شکل اس وقت بھی ایسی ہی تھی جب مادر گیتی نے اسے اپنے آغوش عاطفت میں جگہ دی تھی۔

یہ ایک مثال ہے اس سے قیاس کیا جاسکتا ہے کہ اس نظریہ کا استدلالی پہلو کس قدر کمزور ہے سچ پوچھئے تو اس کے پس پشت ایک دلیل بھی ایسی نہیں ہے جو علمی دنیا کو اسے تسلیم کرنے پر مجبور کرسکے، دلیل و برہان تو ایک طرف ابھی تک یہ نظریہ اپنی وضاحت کی تکمیل بھی نہیں کرسکا ہے، بہت سے انواع کی درمیانی کڑیاں بالکل گم ہیں، جب تک انھیں سامنے نہ لایا جائے اس وقت تک اس کی تصویر دھندلی ہی رہے گی۔

یہ بات اور بھی عجیب ہے کہ جناب مصنف اس نظریہ کو بقول خود روحِ قرآن کے مطابق پاتے ہیں۔ اس نظریہ کا محرک ہی یہ زعم باطل ہے کہ معاذ اللہ یہ نظام کائنات بغیر خدا کے بھی وجود میں آسکتا ہے اور جاری رہ سکتا ہے۔ منکر خدا ڈارون کی ساری کد و کاوش اسی لئے تھی۔ اگر

اللہ تعالیٰ کے وجود کا اقرار کر لیا جائے تو فوری وجود اور تدریجی وجود دونوں کا امکان یکساں ہو جاتا ہے اور ان میں سے کسی ایک پر زور دے کر کائنات کے دائرے کو تنگ کرنے کی کوئی ضرورت ہی باقی نہیں رہتی۔

نظریہ ارتقا کا ماحصل یہ ہے کہ انسان ایک ترقی یافتہ حیوان ہے۔ مغربی زندگی کا مرکزی نقطہ یہی اصول ہے لیکن اسلام تو اسے تسلیم کرنے کے لئے تیار نہیں ہے۔ بیشک انسانی زندگی کا ایک حصہ حیوانیت و بہیمیت بھی ہے لیکن یہ کہنا کسی طرح صحیح نہیں کہ انسان کی حقیقت ہی یہی ہے، یا اسی حصہ نے ترقی کر کے انسان کی شکل اختیار کر لی ہے۔ ایک شخص گھوڑے پر سوار ہو کر اسے دوڑا رہا ہے ہم کہہ سکتے ہیں کہ سوار کے حرکات کا ایک جزو گھوڑے کے حرکات ہیں، سوار ان سے اچھا خاصا اثر لے رہا ہے، بہت سے حرکات میں وہ گھوڑے کا محتاج بھی ہے لیکن یہ کسی طرح نہیں کہہ سکتے کہ سوار کی حقیقت یہ ہے کہ وہ ایک ترقی یافتہ گھوڑا ہے۔ انسان کے ان دونوں تصورات میں جس قدر دوری ہے اتنی ہی دوری روح قرآن کو نظریہ ارتقا سے ہے۔

یہی وجہ ہے کہ جب ڈاکٹر صاحب نے قرآن حکیم میں اس نظریہ کی گنجائش نکالنی چاہی تو انہیں آیات کتاب میں عجیب عجیب تاویلات کرنی پڑیں جو بعض مقامات پر معنوی تحریف کی حد تک پہنچ گئی ہیں۔ نمونے ملاحظہ ہوں۔

آیۂ کریمہ (مَا خَلْقُكُمْ وَلَا بَعْثُكُمْ إِلَّا كَنَفْسٍ وَاحِدَةٍ) کے جو معنی ڈاکٹر صاحب نے لئے ہیں معلوم نہیں ان کا ماخذ کیا ہے۔ عربی زبان کا ذوق رکھنے والا تو سیاق و سباق کو ملحوظ رکھتے ہوئے اس مفہوم کو صحیح نہیں سمجھ سکتا۔ اگر تخلیق نوع کو تخلیق فرد سے کامل تشبیہ دے کر دونوں کو یکساں ثابت کرنا منظور ہے تو اس کے معنی یہ ہوں گے کہ "بعث نوع" بھی تخلیق فرد کے مثل ہو۔ حالانکہ یہ چیز عقلاً و نقلاً ہر طرح باطل ہے۔ کیا کوئی اس بات کا قائل ہو سکتا ہے کہ انسان قیامت کے روز اسی طرح پیدا کیا جائے گا جس طرح اس کے افراد دنیا میں پیدا ہوتے ہیں؟ کیا روز محشر بھی نطفہ سے جنین بن کر رحم مادر سے انسان پیدا ہوگا؟ بعث نفس واحدۂ انسانیہ کی کوئی مثال دنیا میں نہیں ملتی ہے اس لئے اس سے تشبیہ دینا بے معنی ہے مجبوراً یہی تسلیم کرنا پڑے گا کہ بعث مذکور کو تخلیق مذکور ہی سے تشبیہ دی گئی ہے اور اس کی غلطی واضح ہو چکی۔ آیت کا صحیح مفہوم یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ جل شانہٗ کی قدرت کاملہ

جس طرح خلق پر حاوی ہے اسی طرح بعث پر بھی مشتمل ہے۔ قدرت علی الخلق مشاہدے سے ثابت ہے اس لئے قدرت علی البعث کو بعید از قیاس کیوں سمجھتے ہو؟ اللہ تعالیٰ اجس طرح ایک فرد کی تخلیق پر قادر ہیں اسی طرح پوری نوع کی تخلیق اور اس کے بعث پر قادر ہیں خلق نوع کو خلق فرد سے تشبیہ کا مل دے کر کیفیت خلق کا بیان کرنے سے آیت کو دور کا بھی لگاؤ نہیں ہے۔

ایک دوسری آیت ملاحظہ ہو اِنَّ مَثَلَ عِیْسٰی عِنْدَ اللّٰہِ کَمَثَلِ اٰدَمَ خَلَقَہٗ مِنْ تُرَابٍ ثُمَّ قَالَ لَہٗ کُنْ فَیَکُوْنُ حضرت عیسیٰ کی مثال اللہ تعالیٰ کے نزدیک حضرت آدم کی طرح ہے اللہ نے انھیں مٹی سے پیدا کیا پھر فرمایا کہ ہو جاؤ پس وہ ہو گئے۔ کیا یہاں آپ یہ مراد لے سکتے ہیں کہ حضرت آدم کی پیدائش یا زندگی حضرت عیسیٰ کی طرح ہوئی تھی یا اس کے برعکس واقعہ ہوا تھا ظاہر ہے کہ دونوں باتیں مراد نہیں ہو سکتیں

ربوبیت کا تقاضہ ارتقا، تدریجی تسلیم لیکن اس سے وجود تدریجی "کیسے ثابت ہو جائے گا۔ اگر وجود ذات دفعۃً ہوا ہو اور اس کے بعد ارتقار صفات تدریجًا ہوتا رہے یا بعض اشیاء کا وجود دفعۃً ہوا ہو اور بعض کا تدریجًا تو کیا ربوبیت کا تقاضہ پورا نہ ہو گا؟ اگر نہیں تو کیوں؟ اچھا یہ بھی فرض کر لیا کہ ہر شے کا وجود تدریجی ربوبیت کا لازمی تقاضہ ہے لیکن اس تدریج سے ڈارون کا بیش کیا ہوا ارتقا رکس طرح ثابت ہو جائے گا؟

یہ کہنا کہ "کن فیکون" سے فوری وجود مراد نہیں ہے ذوق عربیت پر بڑا ظلم ہے۔ ڈاکٹر صاحب نے اپنے غلط استدلال سے جو کچھ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے اسے نقل کرتے ہوئے بھی دل کانپتا ہے، یہ کہنا کہ معاذ اللہ حضرت آدم علیہ السلام کسی حیوانی شکل سے انسانی شکل میں منتقل ہوئے، بہت سخت کلمہ ہے۔ بیشک قرآن مجید بتاتا ہے کہ ان کی تخلیق مٹی سے ہوئی مگر اس تخلیق کی وہ کیفیت جو ڈارون بیان کرتا ہے قرآن مجید کو اس سے کیا واسطہ؟ اس غلطی کو نباہنے کے لئے مصنف کو صریح نصوص میں رکیک تاویلات بلکہ تحریفات کرنی پڑی ہیں اور حضرت ابو البشر کا جنت سماوی میں ہونا، وہاں سے اترنا، شجر ممنوعہ کا کھانا اور اسی قسم کے صریح قرآنی بیانات کا انکار کرنا پڑا۔ لطیفہ یہ ہے کہ باوجود اس غلط روی اور کد و کاوش کے مصنف اپنا مدعا ثابت کرنے میں بالکل ناکام رہے ہیں۔

یہاں کتاب کے ہر جز و پر تفصیلی تنقید مقصود نہیں ہے۔ نمونہ کے طور پر ہم نے مصنف

کی غلط روی کی چند مثالیں پیش کر دیں۔ ان کے علاوہ بکثرت مثالیں ایسی ہیں جنھیں ہم ناظرین کے قیاس پر چھوڑتے ہیں۔

کتاب دیکھنے سے مصنف کے جذبات کا جس قدر اندازہ ممکن ہے اس اندازے کی بنا پر ہماری رائے یہ ہے کہ مصنف مخلص ہیں لیکن سرسید مرحوم کی پیروی کر کے انھوں نے باوجود اخلاص سخت ٹھوکر کھائی ہے اور بہت غلط طریقہ اختیار کیا ہے۔ قرآن مجید پر نظر کرنے کا جو طریقہ انھوں نے اختیار کیا ہے اور اس کے اسلوب بیان کے متعلق جس رائے کا اظہار کیا ہے اس سے گمراہیوں اور معنوی تحریفات کا ایک باب عظیم کھل جاتا ہے۔ اگر قرآنی قصص و حکایات کو بقول ڈاکٹر صاحب محض ڈرامائی طرز بیان سمجھ لیا جائے اور مبینہ واقعات کو محض ایک مثالی تصویر سمجھ لیا جائے تو کتاب مبین کے ہر جزو پر سے امان اٹھ جاتا ہے اور ہر گمراہ کو اس کا موقع مل جاتا ہے کہ وہ اپنی گمراہی کے لئے اس سے کوئی سند حاصل کرلے۔ (از قلم مولانا حکیم محمد اسحٰق صاحب سندیلوی)

معارف الحدیث

پر

ایک تازہ تبصرہ

اُحادیث نبویؐ کا جدید انتخاب اُردو ترجمہ اور مفید و ضروری تشریحات کے ساتھ۔

معارف الحدیث" کے نام سے منظر عام پر آیا ہے، اور کوئی شک نہیں کہ یہ کتاب اپنی افادیت کے اعتبار سے اتنی اہم، گراں قدر اور بابرکت ہے کہ اردو داں مسلمانوں کے ہر گھر میں اس کا پہنچنا ضروری ہے"۔

معارف الحدیث" کا مقدمہ مولانا حبیب الرحمٰن الاعظمی نے لکھا ہے، جو سنت رسولؐ کے دین میں حجت ہونے پر ایک گرانقدر دستاویز بلکہ برہان ناطق ہے"۔

ترجمہ و تشریحات کی خصوصیت :-

"یہ تشریحات واقعی دل کی گرہیں کھولتی اور وسوسوں کو دور کرتی ہیں، ترجمہ سلیس اور تشریحات عام فہم ہیں"۔ (فاران کراچی)

عصرِ حاضر کی ضرورت کے مطابق

اردو زبان میں حدیثِ نبوی کی ایک تازہ ترین خدمت

معارف الحدیث

جلد اوّل

یعنی احادیثِ نبوی کا ایک جدید مجموعہ اردو ترجمہ و تشریح کے ساتھ

تالیف مولینا محمد منظور نعمانی مدیر الفرقان لکھنؤ

اس کتاب میں کیا ہے اور اس کی کیا خصوصیات ہیں؟ — اس کا صحیح اندازہ تو مطالعہ سے ہی ہو سکتا ہے یا الفرقان کے ناظرین کو مفصل فہرست مضامین سے کچھ ہوا ہوگا جو الفرقان ماہ شعبان میں شائع ہو چکی ہے۔

پھر بھی کم از کم یہ اہم خصوصیت یہاں قابل ذکر ہے کہ یہ کتاب حدیثِ نبوی کی خالص علمی اور فنی خدمت کے طور پر نہیں لکھی گئی ہے بلکہ احادیثِ نبویہ کی جو اصل غرض و غایت اور روح ہے (یعنی ارشاد و ہدایت اور اصلاح و تربیت) کوشش کی گئی ہے کہ یہی اس کتاب کی بھی روح رہے — مگر اسی کے ساتھ ہر حدیث سے متعلق اُن سوالات کے پورے تشفی بخش علمی و تحقیقی جوابات بھی دئے گئے ہیں جو آج کل کے بگڑے ہوئے ذہنوں میں احادیث نبوی کے متعلق پیدا ہوتے ہیں یا کبھی پہلے پیدا ہوئے ہیں۔

امید ہے کہ رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وسلم کی مقدس ذات اور آپ کی تعلیم و ہدایت سے محبت رکھنے والے اہل ایمان اس کتاب کے مطالعہ سے اپنی دینی روح میں ایک تازگی اور نور ایمان میں اضافہ محسوس کریں گے اور ان کا دل چاہے گا کہ کسی طرح زیادہ سے زیادہ تعلیم یافتہ مسلمانوں تک وہ یہ تحفہ پہنچا سکیں۔

عربی مدارس کے طلبہ کے لئے بھی اس کا مطالعہ انشاء اللہ بہت زیادہ مفید اور موجب بصیرت ہوگا

شروع میں مولف کے دیباچہ کے علاوہ استاذ حدیث حضرت مولانا حبیب الرحمٰن صاحب اعظمی کا ایک بسیط محققانہ مقدمہ ہے جس میں صرف قرآن مجید سے بتلایا گیا ہے کہ دین میں حدیث وسنت کا کیا مقام ہے اور جو لوگ حدیث وسنت کے حجت دینی ہونے کے منکر ہیں وہ قرآن حکیم کے کس قدر نصوص و بینات سے منحرف ہیں — یہ مقدمہ اپنے موضوع پر بجائے خود ایک بہترین مقالہ ہے۔

ظاہری حیثیت سے بھی کتاب کو بہتر سے بہتر شکل میں پیش کرنے کی ہم نے اپنی حد تک پوری کوشش کی ہے

کاغذ اعلیٰ سے اعلیٰ لگایا گیا ہے۔ کتابت و طباعت بھی بفضلہ تعالیٰ مثالی اور معیاری ہے

قیمت غیر مجلد تین روپے بارہ آنے (۱۲/۳) ————— مجلد مع گرد پوش چار روپے آٹھ آنے (۸/۴)

(پوری جلد کپڑے کی ہے، جلد کی قیمت لاگت بلاگت لگائی گئی ہے)

ملنے کا پتہ کتب خانہ الفرقان گوئن روڈ لکھنؤ

Regd. No. (A-353)

قیمت مجلد دو روپیہ آٹھ آنے
اور بلا جلد کاغذ معمولی ایک روپیہ آٹھ آنے

Only Cover Printed at TAJ PRESS,
Khwaja Qutbuddin Road, Lucknow.

ماہنامہ الفرقان لکھنؤ

ہماری دعوت

لا الٰہ الا اللہ محمد رسول اللہ

اسی کلمہ پر اسلام کی بنیاد ہے اور ہمارا ایمان ہے کہ یہی انسانیت کی نجات کا کلمہ ہے
لیکن یہ صرف ایک بول ہی نہیں ہے بلکہ ایک شہادت، ایک اصول اور ایک اہم فیصلہ ہے، در اصل یہ
اس بات کا عہد ہے کہ ہم صرف اللہ کی عبادت اور بندگی کریں گے اور زندگی کے ہر شعبہ میں اسی کی بھیجی ہوئی
اور حضرت محمد صلعم کی لائی ہوئی ہدایت و شریعت کی پیروی کریں گے اور اسی کے لیے جئیں گے اور مریں گے۔
جو لوگ اس کلمہ پر ایمان لا چکے ہیں ان کا فرض ہے کہ زندگی اس عہد کے مطابق گزاریں اور اسی ایمانی
زندگی کو دنیا میں رواج دینے کی کوشش کریں، وہ اسی لیے پیدا ہوئے ہیں، ہم اس کا
عہد کرتے ہیں اسی کی دعوت دیتے ہیں اور اسی پر جینا اور مرنا چاہتے ہیں۔

فاطر السموات والارض انت ولیی فی الدنیا والآخرۃ
توفنی مسلما والحقنی بالصالحین

"ادارہ الفرقان"

مدیر مسئول
محمد منظور نعمانی عفا اللہ عنہ

مولانا محمد منظور نعمانی ——— اور ——— مولانا سید ابو الحسن علی ندوی

تبلیغی تقریریں!

جو ہندوستان و پاکستان کے مختلف شہروں کے اہم تبلیغی اجتماعات میں کی گئی تھیں

ان کے مطالعہ سے ہر شخص کو معلوم ہوگا ——— کہ

(۱) دعوت و تبلیغ کی اس جد و جہد کی کیا اہمیت اور ضرورت ہے۔

(۲) اس کا مقصد و نصب العین اور اس کے اصول کیا ہیں، اور وہ کن امتیازات کی حامل ہے۔

(۳) مسلمانوں سے اس کا کیا مطالبہ ہے، اور ان کے لئے اس کا کیا پیام ہے۔

(۴) دنیا اور آخرت میں اس تحریک سے کن نتائج کی توقع ہے۔

(۵) جو لوگ اس دینی دعوت کو صرف کلمہ و نماز کی تحریک یا جامد خانقاہیت کی دعوت کہتے ہیں وہ اصل حقیقت سے کتنے ناواقف ہیں۔

اس تحریک کے کارکنوں کو ان تقریروں کے مطالعہ سے معلوم ہوگا ——— کہ

(۶) مسلمانوں کے مختلف طبقوں کے سامنے اس دعوت کو کس انداز میں پیش کرنا چاہئے۔

(۷) شبہات اور غلط فہمیوں کو کس طرح صاف کرنا چاہئے۔

(۸) اس کام سے تعلق رکھنے والوں کو کن باتوں کی پابندی خاص طور سے کرنی چاہئے۔

(۹) ان میں بعض تقریریں وہ بھی ہیں جو ایسے مجمعوں میں کی گئیں جن میں غیر مسلم بھی خاصی تعداد میں تھے، ان سے معلوم ہوگا کہ غیر مسلم حضرات کیلئے ہماری دعوت اور ہمارا پیام کیا ہے؟ اور ہم اُن سے کیا کہتے ہیں۔

(۱۰) بوقت ضرورت ان تقریروں کو اجتماعات میں بھی سنایا جا سکتا ہے۔

اس میں کل ۱۳ تقریریں ہیں۔ پونے تین سو صفحات ۔ مجلد ۔ خوشنما ۔ مع گرد پوش ۔ قیمت عہ/۴

بعض ضروری اطلاعات

تین مہینے کے التواء کے بعد الفرقان کی اشاعت کا سلسلہ بعونہ تعالیٰ اس پرچہ سے پھر شروع ہو رہا ہے، اس موقع پر آپ حضرات کو ایک چیز کی اطلاع دینا ضروری معلوم ہوتا ہے۔

جیسا کہ آپ حضرات کو الفرقان ہی کے صفحات سے پہلے بھی معلوم ہوتا رہا ہے، ایک عرصہ سے صورت یہ ہے کہ یہ عاجز اپنے خاص حالات اور مشاغل کی وجہ سے الفرقان کے انتظامی معاملات کی دیکھ بھال سے معذور رہتا ہے ــــ تاہم تمام تر ذمہ داری ابتک میری ہی تھی، لیکن اب میرے لیے اس ذمہ داری کا نباہنا بھی مشکل ہو گیا ہے، حتیٰ کہ کبھی کبھی ایسا ہوتا ہے کہ اس میں شائع ہونے والے بعض مضامین کو بھی میں نہیں دیکھ سکتا، اس لیے اب میں نے اپنے کو اس ذمہ داری سے بھی سبکدوش کر لیا ہے، اور الفرقان کے سلسلے کے سارے کام مولوی عتیق الرحمٰن سلمہ کے سپرد کر دیے ہیں، اللہ تعالیٰ ان کو توفیق دے کہ وہ ان ذمہ داریوں کے بوجھ کو پوری طرح محسوس کر کے انجام دیں ــــ حضرات ناظرین و معاونین الفرقان کے متعلق ہر قسم کی مراسلت آئندہ انہی سے کریں۔

مجھ سے صرف ذاتی اور ضروری خط و کتابت کی جائے۔

محمد منظور نعمانی ــــ ۲۰ ذی الحجہ سنہ ۷۲ھ

پاکستان کے انتظام میں پھر تبدیلی

ہمارے مخلص دوست مولوی محمد اقبال صاحب ہوشیارپوری منیجر "مکتبۂ اصلاح مال روڈ لاہور" کو پچھلے دنوں پورے تین مہینے لاہور سے باہر رہنا پڑا اور وہ الفرقان کا کام کرنے سے معذور رہے ــــ اس لیے ہم کو پھر انتظام بدلنا پڑا، ــــ اب آئندہ سے پاکستانی احباب الفرقان اور کتب خانہ الفرقان کی تمام رقوم سابقہ پتہ

ناظم "ادارہ اصلاح و تبلیغ" آسٹریلین بلڈنگس ــــ لاہور

پر روانہ فرمائیں، ہر منی آرڈر میں اس کی تصریح ضرور کی جائے کہ یہ الفرقان یا کتب خانۂ الفرقان کے لیے ہے، اور پرانے خریدار صاحبان جب چندہ بھیجیں تو نام اور پتہ کے ساتھ نمبر خریداری بھی ضرور لکھیں۔ اور حسب معمول لکھنؤ کے دفتر کو اس کی اطلاع دیں۔

ناظم ــ الفرقان ــ گوئن روڈ لکھنؤ

فہرست مضامین

چندہ ہندستان و پاکستان سے سالانہ ... پانچ روپیہ ششماہی ... تین روپے فی کاپی ... ۸ر	# الفرقان لکھنؤ ماہنامہ	چندہ غیر ممالک سے سالانہ ... ۱۲ شلنگ یعنی ہندستانی سکہ میں آٹھ روپیے

جلد ۲۱	بابتہ ماہ محرم الحرام ۱۳۷۳ھ مطابق ستمبر ۱۹۵۳ء	نمبر ۱

توجہ طلب

ابتک الفرقان کی اشاعت وقت کی پوری پابندی سے نہیں ہو پاتی تھی۔ اسلیے رسالہ نہ پہونچنے کی اطلاع دینے کیلئے کوئی آخری تاریخ بھی ہم متعین نہیں کر سکتے تھے، حتیٰ کہ لوگ چھ چھ مہینے بعد اطلاع دیتے تھے اور ہم دوبارہ بلا قیمت بھیجدیتے تھے۔ مگر اب انشاء اللہ اشاعت میں وقت کی پوری پابندی ہوگی اسلیے رسالہ کا انتظار انگریزی مہینے کی صرف ۲۰ تاریخ تک کیا جائے اگر نہ پہونچے تو فوراً اطلاع دیدی جائے تاکہ اسی مہینے کے اندر دوسرا رسالہ بھیجدیا جائے جو حضرات اس کا خیال نہیں رکھیں گے ان کی شکایت کی تلافی سے دفتر قاصر رہے گا ——— ناظم الفرقان

(مولوی) محمد منظور نعمانی پرنٹر و پبلشر نے نامی پریس میں چھپوا کر دفتر الفرقان، گوئن روڈ لکھنؤ سے شائع کیا

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

نگاہِ اوّلیں

افتتاح جلد بست و یکم (۲۱)

الحمد للہ رب العالمین والصلوٰۃ والسلام علیٰ رسولہ الامین

خاتم الانبیاء والمرسلین وعلیٰ آلہ الاطہار واصحابہ الاخیار

الیٰ یوم الدین

آج الفرقان نے بیس سال پورے کر لیے، اب اکیسویں کا آغاز ہے، اب تک جس کا کرم شاملِ حال رہا وہی آئندہ بھی کارساز ہے، نعم المولیٰ ونعم النصیر! شکر! بے نہایت شکر، تعریف! بے پناہ تعریف، واجب ہے لیکن الفاظ نہیں، قلم حیران ہے اور ساتھ ہی ساتھ بیتاب بھی، مگر اعترافِ عجز کے سوا کوئی چارہ کار نہیں! احسان ہے نبی اُمّی کا جنھوں نے عاجز انسان کی اس مشکل کو بھی حل کیا اور بتلایا کہ اس باب میں اعترافِ عجز ہی کمال شکر و ثنا ہے، پھر اس کے لیے الفاظ بھی دیے لا اُحصی ثناءً علیک انت کما اثنیت علیٰ نفسک. پروردگار اپنے دامن میں اس عجز کے سوا کچھ نہیں، تو کریم ہے اسی کو بجائے شکر قبول فرما اور لَاَزِیْدَنَّکُمْ کا وعدہ پورا فرما!

قادرِ مطلق تیرے لیے کسی بڑے سے بڑے وعدہ کا ایفا بھی مشکل نہیں، مگر ہم عاجزوں کیلئے کسی چھوٹے سے چھوٹے عہد پر قائم رہنا بھی آسان نہیں. تو جانتا ہے ہم نے تیرے حضور میں ایک عہد کیا ہے وہی ہمارے لیے حاصلِ بندگی، سرمایۂ زندگی اور متاعِ دوجہاں ہے، اس پر قائم رہنے اور آخری سانسوں تک اسے پورا کرتے رہنے کی توفیق دے، بھرپور توفیق ——

یہی التجا ہے، یہی دعا ہے آغاز سے انجام تک!

ہندستان میں دو مسئلے ایسے ہیں جن کی اہمیت ہر جگہ زیادہ محسوس کی جارہی ہو۔ اور ان کے بخوبی حل ہوجانے ہی پر ملک کی نجات منحصر سمجھی جاتی ہو۔ ایک مسئلہ فرقہ واریت کا ہو اور دوسرا معاشی پریشانی اور ناہمواری کا۔ برسرِاقتدار پارٹی (کانگرس) تو دونوں ہی مسئلوں کی شدت کو یکساں طور پر محسوس کرتی ہو، لیکن دوسری پارٹیوں کی توجہات زیادہ تر دوسرے مسئلہ پر مرکوز ہیں، بلاشبہ یہ دونوں مسئلے بہت قابلِ فکر ہیں۔ اقتصادی پریشانی کے مارے ملک کی حالت دیکھی نہیں جاتی، اور فرقہ داری تعصب انسانی شرافت کے لیے سمِ قاتل ہو۔ جن لوگوں نے ملک کی ذمہ داری اپنے سر لی ہو ان کا فرض ہو کہ اپنی ساری صلاحیتوں اور اقتدار کی تمام طاقتوں کے ساتھ ان مسئلوں کا مقابلہ کریں، اور جب تک ان پر قابو نہ پالیں راتوں کی نیند اور دن کا چین اپنے اوپر حرام کرلیں۔ اس کے بغیر وہ اس امانت کا حق ادا نہیں کرسکتے۔ جو ملک کے چھتیس کروڑ باشندوں نے انھیں سونپی ہو۔ مگر ہم انھیں یہ بتانا چاہتے ہیں کہ اسی ملک میں ایک تیسرا مسئلہ بھی ہو جس کی اہمیت ان دو مسئلوں سے کسی طرح کم نہیں ہو، اور اُسے حل کیے بغیر وہ ملک کی خیرخواہی کا حق ادا نہیں کرسکتے! یہ مسئلہ ہو اخلاقی گراوٹ کا، امانت اور دیانت کے فقدان کا، عریانیت اور فحاشی کے بڑھتے ہوئے چلن کا اور جنسیت و شہوانیت کی خطرناک رَو کا! آج جس طرح ہم اپنی آبادیوں کے ہر ہر گوشہ میں، ایک نظر میں اقتصادی بدحالی کے غم انگیز مناظر دیکھ سکتے ہیں، اسی طرح ہر محلے، ہر بازار، ہر شاہراہ اور ہر بک اسٹال پر بلا کسی جستجو اور قصد کے اس اخلاقی انحطاط اور جنسی اشتعال کا دلدوز نظارہ ہو سکتا ہو۔ ایسے ایسے مناظر پیش نظر آتے ہیں کہ انسانیت کا جی چاہتا ہو؟ زمین پھٹے اور وہ اس میں سما جائے اور پھر کبھی اس چاند، اس سورج، اور ان ستاروں کو منھ نہ دکھائے جن کی بھری محفل میں اسے یوں ننگا کیا گیا ہو —— ہم ملک کے ذمہ داروں سے پوچھنا چاہتے ہیں کہ آخر وہ کیا سوچ کر اس مسئلے سے لاپرواہی برت رہے ہیں؟ کیا وہ اسے قابلِ اعتنا ہی نہیں سمجھتے یا اس سے تعرض کرنے کو اپنے فرائض میں شمار نہیں کرتے۔؟ اگر پہلی صورت ہو تو کیا وہ اس کو پسند کرتے ہیں کہ ان کا ملک ایک دوسرا امریکا یا فرانس

یا انگلینڈ بن جائے، جہاں ہر سو میں سے پچاس سے زائد کنوارے اور کنواریاں شادی سے پہلے جنسی تجربہ حاصل کر لیا کریں۔ اور ہر سو میں ۹۵ مرد اور ۵۰ عورتیں عمر کے کسی نہ کسی حصہ میں بدچلنی کا دھبہ اپنے دامن پر لگا لیا کریں؟ کیسے مان لیا جائے کہ وہ لوگ اسے خوشی سے برداشت کر لیں گے جن میں ڈاکٹر راجندر پرشاد، راج گوپال آچاری اور کے، ایم، منشی جیسے مشرقی روایات کے دلدادگان موجود ہیں! اور اگر دوسری صورت ہو تو پھر بتلائیے کہ کیوں آپ کی پولیس کبھی کبھی پارکوں اور ہوٹلوں کی خلوتوں میں خلل انداز ہوتی ہو۔ معلوم ہوتا ہو کہ آپ اس کو جرم سمجھتے ہیں! تو پھر یہ کہاں کی دانائی ہو کہ ایک فعل کو آپ جرم بھی سمجھیں اور گرفت میں آجائے تو مجرم کو سزا بھی دے ڈالیں، لیکن جو عوامل اور جو ماحول اس فعل پر آمادہ کرتے ہیں ان پر کوئی قدغن نہ لگائیں! کیسی اندھیر نگری ہو کہ سیلاب کو روکنے کی تو آپ کوئی تدبیر کرتے نہیں لیکن جو اس میں ثابت قدم نہ رہ سکے اس پر دار و گیر کرتے ہیں۔ یہ وہی بوالعجبی ہو

درمیانِ قعرِ دریا تختہ بندم کردہ ای
باز می گوئی کہ دامن تر مکن ہشیار باش!

یہ ایک عجیب مہمل قسم کی پالیسی ہو جس کا حاصل سوائے اس کے کچھ نہیں کہ کبھی کبھی کسی "غریب" کے رنگ میں بھنگ پڑ جائے۔ بالکل سیدھی سی بات ہو کہ یا تو اخلاقی جرائم کے سرچشموں کو بند کرنے کی فکر کیجیے ورنہ پھر ان جرائم پر سے ہر قسم کی دار و گیر ختم کر دیجیے!

ممکن ہو دوسرے اخلاقی جرائم کے بارے میں ارباب حل و عقد کا یہ خیال ہو کہ معاشی فارغ البالی حاصل ہو جانے کے بعد یہ سب خود بخود ختم ہو جائیں گے۔ لیکن جنسی جرائم کا تو ظاہر ہو معاشی پریشانی سے کوئی تعلق ہی نہیں کہ اس پریشانی کے اطمینان اور فارغ البالی سے

عـــہ ....

عـــہ انڈیانا یونیورسٹی (امریکہ) کے ماہر جنسیات ڈاکٹر کنسی کا بیان ..... بحوالہ صدق لکھنؤ ۔ ۱۰ اگست ۱۹۵۳ء

بدل جانے کے بعد ان میں کوئی کمی واقع ہو جائے۔ اور اس مسئلہ کی طرف فوری توجہ نہ کرنے کا نتیجہ کیسے گھنونے مستقبل کی شکل میں سامنے آئے گا، وہ ہم مختصر طور پر کہہ چکے ہیں، پوری قوم اپنے سفلی جذبات کے ہاتھوں میں ایک کھلونا بن کر رہ جائے گی، عصمت، عفت، اور شرافت نام کی کوئی قدر یہاں سننے میں نہ آئے گی اور بعید نہیں کہ قوم کی پوری زندگی کا محور معاشی تقاضہ سے بھی گر کر جنسی جذبہ رہ جائے۔ اس لیے ہندستان کے ہر شرافت پسند انسان کا فرض ہو کہ وہ اس صورت حال کے خلاف سخت احتجاج کرے اور کار پردازان حکومت سے مطالبہ کرے کہ اس مسئلہ کو کسی دوسرے مسئلہ سے کمتر نہ سمجھا جائے اور ہر ممکن طریقہ سے قوم کی انسانیت کو حیثیت اور شہوانیت کے کھڈ میں گر کر تباہ ہونے سے بچایا جائے۔ مسلمانوں پر یہ ذمہ داری سب سے زیادہ عائد ہوتی ہو، کیونکہ وہ معلم اخلاق (صلی اللہ علیہ وسلم) کے اُمتی ہیں جس کی دعوت اور شریعت میں اخلاق کو نہایت بلند مقام حاصل ہو، ۱۹۴۷ء کے بعد سے ان پر ایک اضمحلال سا طاری ہو، اور وہ زندگی کی کسی جد و جہد میں سرگرمی نہیں دکھا رہے ہیں۔ یہ ایک موقع ہو، ان کا خاص کام ہو، اللہ کے آخری پیغمبر کی میراث ہو، جس کے وہ سب سے زیادہ حقدار ہیں۔ کاش وہ آگے بڑھیں اور ثابت کریں کہ ہندستان کو ان کی ضرورت ہو، کہ جب چراغ انسانیت کی لو تھرتھرا اُٹھتی ہو تو انھیں کے دم سے اسے حیات نو ملتی ہو........

بعض خریداروں کے خطوط سے معلوم ہوتا ہو کہ انھیں جون سے اگست تک الفرقان کی اشاعت ملتوی رہنے کا علم ہی نہیں ہو۔ اور وہ یہ سمجھ رہے ہیں کہ رسالہ شائع ہو رہا ہو، مگر ہمارے پاس نہیں آ رہا ہو۔ اسکی وجہ یہ معلوم ہوتی ہو کہ التوا کے اعلان کے لیے جو ضمیمہ جولائی میں شائع کیا گیا تھا وہ ان حضرات کو نہیں پہونچا — بہر حال ایسے تمام حضرات کو ان سطور کے ذریعہ اطلاع دی جاتی ہو کہ بعض مجبوریوں کے ماتحت شعبان کے رسالہ کے بعد ابتک کوئی رسالہ شائع نہیں ہوا تھا، یہ پہلا رسالہ ہو جو شعبان ۷۲ھ کے بعد شائع ہو رہا ہو۔ اگر تفصیل معلوم کرنے کی ضرورت ہو تو ایک کارڈ لکھ کر ضمیمہ طلب کرلیں۔ اس کی کاپیاں دفتر میں موجود ہیں۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

قرآنی دعوت

(۶)

توحید

اللہ تعالیٰ کی صفات کے متعلق جو قرآنی بیانات یہاں تک نقل کیے گئے ان سے معلوم ہوا کہ اللہ تعالیٰ عالم الغیب والشہادۃ اور علیم کل ہے، سب کے ساتھ اور سب سے قریب ہے، قادر مطلق ہے، سب کا خالق و رازق اور سب کا کارساز و پروردگار ہے، اور وہی اس ساری کائنات کا مالک و حاکم اور قیوم ہے، اور یہاں جو کچھ ہوتا ہے اسی کے حکم سے ہوتا ہے، اس کے علاوہ کوئی ہستی نہیں جو بلا اس کے حکم کے یہاں کچھ کر سکے، ہر قسم کی عظمت و کبریائی اسی کے لیے ہے، اور وہ بڑی رحمت والا اور نہایت مہربان ہے، اور ساتھ ہی وہ بڑا بے نیاز بھی ہے، سب اس کے محتاج ہیں اور وہ کسی کا محتاج نہیں، اور اس کو کسی کی پرواہ نہیں، اور وہ صاحب عدالت بھی ہے، یعنی ہر ایک کو اس کے اعمال کا بدلہ دینے والا ہے،

—— اور ان صفات کمال سے موصوف ہونے کے ساتھ وہ ہر اس بات اور ہر اس چیز سے بری بھی ہے جس میں نقص اور عیب کا کوئی پہلو اور کوئی شائبہ ہو، اور جو اس کی شان قدوسیت کے خلاف ہو۔

ظاہر ہے کہ یہ معلوم ہو جانے کے بعد کہ کوئی ہستی ایسی ہے جس میں یہ ساری صفتیں اور سارے کمالات جمع ہیں آپ سے آپ یہ بات طے ہو جاتی ہے کہ بس وہی عبادت اور بندگی کے لائق ہے، اور وہی اس

قابل ہے کہ اس کی پرستش کی جائے اور محبت و عظمت کے ساتھ اس کے ہر فرمان کے سامنے سر خم کیا جائے اور اس کو اپنا مولا اور اپنے کو اس کا بندہ سمجھ کر اس کے حکموں پر چلا جائے، اسی سے آس لگائی جائے اپنی ضرورتوں کے لیے اسی سے دعا کی جائے، مصائب و مشکلات میں اسی سے مدد مانگی جائے، اسی سے امید باندھی جائے، اور اسی پر بھروسہ کیا جائے، اسی کی رضا جوئی میں جیا جائے اور مرا جائے۔ اسی کی حمد و ثنا اور اسی کی تسبیح و تقدیس کی جائے اور اسی کی یاد کو اپنا وظیفہ بنایا جائے —

اسی لیے قرآن مجید میں بیان صفات کے ساتھ ساتھ اکثر مقامات پر ایک ثابت شدہ حقیقت اور لازمی نتیجہ کے طور پر توحید کا بھی ذکر کیا گیا ہو، جیسا کہ ناظرین نے بیان صفات کے سلسلہ کی مندرجہ قبل آیات کو پڑھتے ہوئے خود بھی جا بجا محسوس کیا ہوگا، اس لحاظ سے توحید کے مستقل بیان کی اب زیادہ ضرورت باقی نہیں رہی، لیکن چونکہ توحید قرآن پاک کا خاص الخاص موضوعِ دعوت ہو اور اس میں دوسرے تمام مسئلوں سے زیادہ زور اسی پر دیا گیا ہو اور قرآن سے پہلے آنے والی اللہ کی کتابوں اور اللہ کے رسولوں کی تعلیم و دعوت کا مرکزی نقطہ بھی چونکہ توحید ہی کا مسئلہ رہا ہو اس لیے ہم توحید کے بارہ میں قرآن مجید کے بیان کو کسی قدر تفصیل سے اور مستقلاً بھی پیش کرنا چاہتے ہیں۔

قرآن مجید میں توحید کی تعلیم اتنی وضاحت اور ایسی تفصیل سے دی گئی ہو کہ مسئلہ کا کوئی گوشہ ایسا نہیں رہا ہو جو پوری طرح روشنی میں نہ آگیا ہو۔ اور ہونا بھی یہی چاہیے تھا، کیوں کہ امتوں اور قوموں نے توحید ہی کے بارہ میں ہمیشہ سخت ٹھوکریں کھائی ہیں، بلکہ یہ کہنا بالکل صحیح ہوگا کہ جتنی غلطیوں اور گمراہیوں میں قومیں توحید کے بارہ میں مبتلا ہوئیں اتنی کسی دوسرے مسئلہ میں گمراہ نہیں ہوئیں حالاں کہ اللہ کے تمام پیغمبروں اور مذاہب کے سب سچے داعیوں نے اپنی اپنی قوموں کو ہمیشہ توحید ہی کی تعلیم دی تھی، بلکہ قرآن مجید کا تو بیان ہے کہ دنیا میں کوئی قوم ایسی نہیں جس کو اللہ کے پیغمبروں اور ہادیوں نے توحید کا پیغام نہ پہونچایا ہو۔

وَلَقَدْ بَعَثْنَا فِي كُلِّ أُمَّةٍ رَّسُولًا أَنِ اعْبُدُوا اللَّهَ وَاجْتَنِبُوا الطَّاغُوتَ ۝ (النحل ع ۵)

اور بھیجا ہم نے ہر قوم میں اپنا پیغامبر اور اس رسول اور اس پیام کے ساتھ، کہ صرف اللہ کی بندگی کرو (جو سچا معبود ہے)، اور ہر جھوٹے خدا سے بچو۔

اور ایک دوسرے موقع پر فرمایا۔

وَمَا أَرْسَلْنَا مِن قَبْلِكَ مِن رَّسُولٍ إِلَّا نُوحِي إِلَيْهِ أَنَّهُ لَا إِلَٰهَ إِلَّا أَنَا فَاعْبُدُونِ ۝ (الانبیاء ع ۲)

اور جو پیغمبر بھی ہم نے تم سے پہلے بھیجے ان کی طرف یہی وحی کی اور ان کو یہی پیام دیا کہ میرے سوا کوئی عبادت اور بندگی کے لائق نہیں ہے لہذا صرف میری ہی عبادت اور بندگی کرو۔

الغرض یہ واقعہ ہے کہ ہر قوم میں آنے والے اللہ کے پیغمبر اور ہادی نے ہمیشہ توحید ہی کی تعلیم دی، لیکن کچھ مدت گزرنے کے بعد اکثر قومیں کسی نہ کسی قسم کے شرک میں مبتلا ہو گئیں۔ اور اب بھی یہی ہے کہ بہت سے لوگ اللہ کو مانتے ہیں اور اس پر ایمان رکھتے ہیں، لیکن کسی نہ کسی قسم کے شرک میں مبتلا ہیں — قرآن ہی کا بیان ہے۔

وَمَا يُؤْمِنُ أَكْثَرُهُم بِاللَّهِ إِلَّا وَهُم مُّشْرِكُونَ ۝ (یوسف ع ۱۲)

اور اکثر لوگ اللہ پر ایمان بھی رکھتے ہیں اور اسی کے ساتھ وہ شرک میں بھی مبتلا ہیں۔

بہر حال ہمیشہ سے شرک انسانوں کی بڑی خطرناک اور بڑی عام بیماری رہی ہے، اسی لیے قرآن مجید میں ــــ جو اللہ تعالیٰ کی طرف سے آخری کتاب ہدایت ہے اور جس کے بعد انسانوں کے لیے کوئی آسمانی ہدایت نامہ آنے والا نہیں ہے ــــ توحید کے مسئلہ کو زیادہ سے زیادہ روشن اور واضح کیا گیا ہے بلکہ ان تمام دروازوں کو بھی بند کرنے کی پوری پوری کوشش کی گئی ہے جن سے اگلی امتوں میں شرک آیا یا اس کے آنے کا امکان ہو سکتا تھا۔

قرآن مجید نے صرف یہ کہہ کر توحید کا درس ختم نہیں کر دیا کہ "خدا ایک ہے، اس کے سوا کسی کی عبادت اور بندگی نہ کی جائے" بلکہ توحید فی الذات کے علاوہ اس نے ایک ایک خدائی

صفت کا ذکر کرکے بتلایا کہ یہ صفت صرف اللہ ہی میں ہے اور وہ اپنی ذات کی طرح صفات میں بھی وحدہٗ لاشریک ہے اسی طرح اپنے افعال و اختیارات میں بھی وہ وحدہٗ لاشریک ہے، اور پھر اپنے خدائی حقوق میں بھی وہ اسی طرح وحدہٗ لاشریک ہے۔ اس نے توحید کے ان سب پہلوؤں کو اتنا واضح کیا کہ کسی قسم کے اعتقادی یا عملی، جلی یا خفی شرک کے لیے کوئی گنجائش نہیں چھوڑی۔

ہم قرآن مجید کی دعوتِ توحید کے سلسلہ کی چند آیات کو یہاں چند عنوانوں کے تحت ایک خاص ترتیب سے مرتب کرکے پیش کرتے ہیں۔

توحید ذاتی اور توحید الوہیت :-

توحید کا ایک سادہ سا اجمالی اور جامع عنوان یہ ہے کہ اللہ یعنی معبود بس ایک ہے صرف وہی عبادت اور بندگی کے لائق ہے، قرآن مجید میں موقع بموقع اس کو بیسیوں جگہ دہرایا گیا ہے، چند آیتیں یہ ہیں۔

وَاِلٰهُكُمْ اِلٰهٌ وَّاحِدٌ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ الرَّحْمٰنُ الرَّحِيْمُ ۝ (البقرہ ع۱۹)

اور تمہارا معبود بس ایک معبود ہے، اس کے سوا کوئی عبادت اور بندگی کے لائق نہیں وہ بڑی رحمت والا نہایت مہربان ہے۔

وَمَا مِنْ اِلٰهٍ اِلَّا اللّٰهُ وَاِنَّ اللّٰهَ لَهُوَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ ۝ (آل عمران ع۲)

اور اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں اور وہ اللہ ہر چیز پر قابو رکھنے والا اور حکمت والا ہے۔

اِنَّ اِلٰهَكُمْ لَوَاحِدٌ رَبُّ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَمَا بَيْنَهُمَا (الصّٰفّٰت ع۱)

حق یہ ہے کہ تمہارا معبود ایک ہی ہے، وہ آسمان و زمین اور ان کے درمیان کی ساری مخلوق کا پروردگار ہے۔

قُلْ اِنَّمَا هُوَ اِلٰهٌ وَّاحِدٌ وَّاِنَّنِيْ بَرِيْٓءٌ مِّمَّا تُشْرِكُوْنَ ۝ (انعام ع۲)

اے پیغمبر آپ ان لوگوں سے کہہ دیجئے اور اعلان کر دیجئے کہ معبود برحق بس ایک ہی معبود ہے اور میں تمہارے شرک سے بیزار ہوں۔

فَاِلٰهُكُمْ اِلٰهٌ وَّاحِدٌ فَلَهٗ اَسْلِمُوْا۔ (حج ع ۵)

پس تمھارا معبود ایک ہی معبود ہو، لہذا اسی کی فرمانبرداری کرو، اور اپنے کو اسی کے سامنے جھکا دو۔

توحید صفات وافعال:۔

توحید الوہیت کے اس سادہ اجمالی بیان کے علاوہ قرآن مجید صفات و افعال میں اللہ تعالیٰ کی وحدانیت کو بھی جا بجا تفصیل سے بیان کرتا ہو، وہ تبلاتا ہو کہ سب کا پیدا کرنے والا، سب کی پرورش کرنے والا، سب کو روزی دینے والا، جلانے والا اور مارنے والا بس اللہ ہی ہو۔

—— اس مضمون کی متعدد آیات صفات کے بیان میں آپ پڑھ چکے ہیں، چند آیتیں یہاں بھی پڑھ لیجیے! سورہ روم میں فرمایا۔

اَللّٰهُ الَّذِيْ خَلَقَكُمْ ثُمَّ رَزَقَكُمْ ثُمَّ يُمِيْتُكُمْ ثُمَّ يُحْيِيْكُمْ هَلْ مِنْ شُرَكَآئِكُمْ مَّنْ يَّفْعَلُ مِنْ ذٰلِكُمْ مِّنْ شَيْءٍ سُبْحٰنَهٗ وَتَعٰلٰى عَمَّا يُشْرِكُوْنَ۔ (روم ع ۴)

اللہ ہی ہو جس نے تم کو پیدا کیا، پھر اسی نے تم کو رزق دیا، اور تمھاری زندگی کی ضرورتیں مہیا کیں، پھر وہی تم کو وقت آنے پر موت دے گا، اور اس کے بعد وہی تم کو جلائے گا۔ بتاؤ جن واقعی یا فرضی ہستیوں کو تم نے خدائی حقوق میں شریک ٹھہرا رکھا ہو، کیا ان میں سے کوئی ان میں کوئی کام بھی کرتا ہو، یا کر سکتا ہو، پاک ہو اللہ اور برتر ہو ان کے شرک سے اور شریکوں سے۔

اور سورہ فاطر میں ارشاد ہو۔

قُلْ اَرَءَيْتُمْ شُرَكَآءَكُمُ الَّذِيْنَ تَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ اَرُوْنِيْ مَاذَا خَلَقُوْا مِنَ الْاَرْضِ اَمْ لَهُمْ شِرْكٌ فِي السَّمٰوٰتِ۔ (فاطر ع ۵)

بتاؤ تو اللہ کے سوا جن شریکوں کو تم پکارتے ہو مجھے دکھاؤ کیا چیز پیدا کی ہو انھوں نے زمین میں، یا ان کی کوئی شرکت ہو آسمانوں میں؟۔

اور اسی سورۂ فاطر میں ایک جگہ فرمایا

هَلْ مِنْ خَالِقٍ غَيْرُ اللّٰهِ يَرْزُقُكُمْ مِنَ السَّمَاءِ وَالْأَرْضِ لَا إِلٰهَ إِلَّا هُوَ فَأَنّٰى تُؤْفَكُوْنَ ۝ (فاطر ع ۱)

کیا اللہ کے سوا کوئی خالق ہے جو زمین و آسمان سے تمہاری روزی کا انتظام کرتا ہو، اس کے سوا کوئی بھی الٰہ (معبود) نہیں، پھر تم کہاں بہکے جا رہے ہو۔

اور سورۂ عنکبوت میں ارشاد فرمایا

إِنَّ الَّذِيْنَ تَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ لَا يَمْلِكُوْنَ لَكُمْ رِزْقًا فَابْتَغُوْا عِنْدَ اللّٰهِ الرِّزْقَ وَاعْبُدُوْهُ وَاشْكُرُوْا لَهٗ إِلَيْهِ تُرْجَعُوْنَ ۝ (عنکبوت ع ۲)

اللہ کے سوا جن ہستیوں کی تم عبادت کرتے ہو وہ تمہاری روزی کی مالک نہیں اور تم کو کچھ نہیں دے سکتیں، پس اللہ ہی سے رزق مانگو اور اسی کی عبادت کرو اور اسی کا شکر کرو، تم اسی کی طرف لوٹائے جاؤ گے۔

ساری کائنات پر صرف اللہ ہی کا حکم چلتا ہے، اور سب کچھ صرف اسی کے اختیار میں ہے۔

قرآن مجید بتلاتا ہے کہ زمین و آسمان اور ساری کائنات صرف اللہ کے زیر حکم ہے، جس طرح سب کا خالق و رازق اللہ ہے، اسی طرح سب پر حکم بھی صرف اسی کا چلتا ہے۔

له الخلق والامر (اعراف ع ۷)

تخلیق بھی اسی کی اور حکم و فرمان بھی اسی کا،

له الحكم واليه ترجعون ۝ (قصص ع ۷)

بس صرف اسی کا حکم چلتا ہے، اور تم سب اسی کی طرف لوٹائے جاؤ گے۔

وہی جو کچھ کرنا چاہتا ہے کرتا ہے، اس کے سوا کسی کے اختیار میں کچھ بھی نہیں، نہ کوئی کسی کو وجود دے سکتا ہے، نہ کسی سے کوئی وجود لے سکتا ہے، نہ موت و حیات پر کسی کا اختیار ہے، نہ کوئی کسی کے نفع یا نقصان کا مختار ہے ـــــــ اور نادان اور گمراہ لوگ اپنی

نادانی اور جہالت سے جن ہستیوں کے متعلق یہ سمجھتے ہیں کہ دنیا کے نظام میں ان کا بھی کوئی دخل ہو اور یہ بھی جسے چاہیں نفع یا نقصان پہونچا سکتے ہیں — قرآن مجید جا بجا کہتا ہو کہ یہ بالکل غلط ہو ان کے بس میں کچھ بھی نہیں، اگر وہ سب بھی جمع ہو جائیں تو اپنے اختیار سے کچھ نہیں کر سکتے حتیٰ کہ ایک مکھی اور ایک چیونٹی بھی نہیں بنا سکتے، کسی کی بگڑی کو نہیں بنا سکتے، کسی کی مدد اور حمایت نہیں کر سکتے، قرآن مجید کا یہ بیان ذرا اسی کے الفاظ میں سنیے۔

إِنَّ اللهَ لَهُ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَالْأَرْضِ يُحْيِي وَيُمِيتُ وَمَا لَكُمْ مِّنْ دُونِ اللهِ مِنْ وَّلِيٍّ وَّلَا نَصِيرٍ ۝ (شوریٰ ع ۱)

زمین و آسمان کی بادشاہت اللہ ہی کے لیے ہو وہی زندگی اور موت دیتا ہو اور اللہ کے سوا کوئی تمہارا کارساز اور مددگار نہیں۔

ذٰلِكُمُ اللهُ رَبُّكُمْ لَهُ الْمُلْكُ وَالَّذِينَ تَدْعُونَ مِنْ دُونِهِ مَا يَمْلِكُونَ مِنْ قِطْمِيرٍ ۝ (فاطر ع ۲)

یہی اللہ تمہارا پروردگار اور مالک ہو، اسی کی بادشاہی ہو اور اللہ کے سوا جن ہستیوں کو تم پکارتے ہو وہ تو کھجور کی گٹھلی کے چھلکے جیسی کسی بے قیمت اور حقیر چیز کی بھی مالک نہیں۔

إِنَّ الَّذِينَ تَدْعُونَ مِنْ دُونِ اللهِ لَنْ يَّخْلُقُوا ذُبَابًا وَّلَوِ اجْتَمَعُوا لَهُ ۝ (الحج ع ۲)

اللہ کے سوا جن ہستیوں کو تم پکارتے ہو وہ تو ایک مکھی بھی نہیں بنا سکتے اگرچہ سب مل کر اسکے لیے کوشش کریں۔

قُلِ ادْعُوا الَّذِينَ زَعَمْتُمْ مِّنْ دُونِ اللهِ لَا يَمْلِكُونَ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ فِي السَّمٰوٰتِ وَلَا فِي الْأَرْضِ وَمَا لَهُمْ فِيهِمَا مِنْ شِرْكٍ وَّمَا لَهُ مِنْهُمْ مِّنْ ظَهِيرٍ ۝ (سبا ع ۳)

اے پیغمبر آپ ان سے کہیے کہ تم اللہ کے سوا جنکو اپنا کارساز اور حاجت روا سمجھتے ہو، ان کو پکار کے تو دیکھو زمین و آسمان میں ان کا ذرہ برابر بھی اختیار نہیں ہو اور نہ ان میں کسی قسم کی ان کی شرکت ہو اور نہ ان میں سے کوئی اس کا مددگار ہو (مطلب یہ کہ نہ کوئی چیز ان کی ملکیت میں ہو

نہ ان کا ساجھا ہو اور نہ اللہ کو ان سے اپنے کاموں میں مدد لینے کی ضرورت ہو۔

قُلْ أَفَرَأَيْتُم مَّا تَدْعُونَ مِن دُونِ اللَّهِ إِنْ أَرَادَنِيَ اللَّهُ بِضُرٍّ هَلْ هُنَّ كَاشِفَاتُ ضُرِّهِ أَوْ أَرَادَنِي بِرَحْمَةٍ هَلْ هُنَّ مُمْسِكَاتُ رَحْمَتِهِ ۚ قُلْ حَسْبِيَ اللَّهُ عَلَيْهِ يَتَوَكَّلُ الْمُتَوَكِّلُونَ (زمر ع ۴)

اے پیغمبر آپ ان سے کہیے کہ تم بتاؤ جن کو تم اللہ کے سوا پکارتے ہو، اگر اللہ مجھے کوئی تکلیف دینا چاہے تو کیا وہ اسکو دور کر سکتے ہیں یا اگر اللہ مجھے اپنی رحمت سے نوازنا چاہے تو کیا وہ اللہ کی رحمت کو مجھ سے روک سکتے ہیں (ہرگز نہیں) آپ کہہ دیجیے کہ اللہ مجھے کافی ہے، اور بھروسہ کرنے والے اسی پر بھروسہ کرتے ہیں۔

أَمِ اتَّخَذُوا مِن دُونِهِ أَوْلِيَاءَ ۖ فَاللَّهُ هُوَ الْوَلِيُّ (شوریٰ ع ۱)

کیا انھوں نے اللہ کے سوا کچھ کارساز بنائے ہیں، پس اللہ ہی سب کا کارساز ہے۔

نظام عالم کو قائم رکھنے والا صرف اللہ ہی ہے:-

قرآن کہتا ہے کہ زمین و آسمان کے اس نظام کو بلا شرکت غیرے صرف اللہ ہی چلا رہا ہے اور وہی اس کو تھامے ہوئے ہے، اگر وہ ایک لمحہ کے لیے اس کو چھوڑ دے تو کوئی دوسرا اس کو تھام نہیں سکتا اور پھر ساری کائنات آن کی آن میں فنا کے گھاٹ اتر جائے۔

إِنَّ اللَّهَ يُمْسِكُ السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضَ أَن تَزُولَا ۚ وَلَئِن زَالَتَا إِنْ أَمْسَكَهُمَا مِنْ أَحَدٍ مِّن بَعْدِهِ (فاطر ع ۵)

اللہ ہی تھامے ہوئے ہے آسمانوں اور زمین کو کہ ٹل نہ جائیں، اور اگر وہ ٹل جائیں تو اسکے سوا کوئی ان کو تھام نہیں سکتا۔

صرف اللہ ہی زندہ جاوید ہے باقی سب فانی ہیں:-

قرآن مجید یہ بھی بتلاتا ہے کہ اصلی اور ذاتی زندگی جس کو کبھی فنا نہیں صرف اللہ کی ہے

اور اس کے سوا جو ہستیاں ہیں ان سب کی زندگی مستعار ہے، اور سب کو فنا کے گھاٹ سے گزرنا ہے۔

ارشاد ہے۔

هُوَ الْحَيُّ لَا إِلٰهَ إِلَّا هُوَ (مومن ع ۷)

صرف وہی زندۂ جاوید ہے، اس کے سوا کوئی عبادت اور بندگی کے لائق نہیں۔

كُلُّ شَيْءٍ هَالِكٌ إِلَّا وَجْهَهُ (قصص ع ۹)

اس ذات کے سوا جو کچھ ہے سب فنا ہونے والا ہے۔

صرف اللہ ہی عالم الغیب اور علیم کل ہے:-

اسی طرح قرآن مجید یہ بھی بتلاتا ہے کہ یہ شان صرف اللہ ہی کی ہے کہ وہ ہر چیز کو جانتا ہے، اور غیب و شہود سب یکساں طور پر اسکے سامنے ہے، کسی کی کوئی بات اس سے پوشیدہ نہیں، ارشاد ہے۔

يَعْلَمُ مَا بَيْنَ أَيْدِيهِمْ وَمَا خَلْفَهُمْ وَلَا يُحِيطُونَ بِشَيْءٍ مِنْ عِلْمِهِ إِلَّا بِمَا شَاءَ (البقرہ ع ۳۴)

اللہ وہ سب کچھ جانتا ہے جو بندوں کے سامنے حاضر ہے اور اس سب کو بھی جانتا ہے جو ان کے پیچھے اور ان سے غائب ہے، اور مخلوقات اور بندوں کا حال یہ ہے کہ وہ اس کے بے نہایت علم میں سے ایک چیز کو بھی پوری طرح نہیں جان سکتے۔ اِلّا یہ کہ کسی چیز کا علم وہ خود ہی ان کو دینا چاہے۔

ایک جگہ ارشاد ہے۔

لَهُ غَيْبُ السَّمٰوٰتِ وَالْأَرْضِ أَبْصِرْ بِهِ وَأَسْمِعْ (کہف ع ۴)

آسمان و زمین کے چھپے بھیدوں کا اسی کو علم ہے، کیسا عجیب دیکھنے والا اور سننے والا ہے۔

ایک دوسری جگہ ارشاد ہے۔

قُلْ لَا يَعْلَمُ مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْأَرْضِ الْغَيْبَ

اے پیغمبر آپ ان لوگوں سے کہہ دیجیے اور بتا دیجیے کہ آسمان و زمین میں جو مخلوقات ہیں وہ

اِلَّا اللّٰہ۔ (نمل ع ۵) غیب کا علم نہیں رکھتے بجز اللہ کے۔ بس وہی عالم الغیب ہے،

ایک اور موقع پر فرمایا۔

وَعِنْدَہٗ مَفَاتِحُ الْغَیْبِ لَا یَعْلَمُھَا اِلَّا ھُوَ۔ (انعام ع ۷)

اللہ ہی کے پاس ہیں غیب کی کنجیاں اس کے سوا کوئی ان کی خبر نہیں رکھتا (مطلب یہ ہو کہ اللہ کے سوا کسی کے پاس کوئی ایسا آلہ اور ذریعہ نہیں جس سے غیب کے مخفی بھیدوں کا علم حاصل ہو)

(باقی)

معارف الاحادیث

— مُسلسَل —

(۱۳) عن ابی ھریرۃ قال قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم من یاخذ عنی ھؤلاء الکلمات فیعمل بھن او یعلّم من یعمل بھن؟ قلت انا یا رسول اللہ فاخذ بیدی فعدَّ خمساً فقال اتق المحارم تکن اعبد الناس وارض بما قسم اللہ لک تکن اغنی الناس واحسن الی جارک تکن مومناً واحب للناس ماتحب لنفسک تکن مسلماً ولا تکثر الضحک فانّ کثرۃ الضحک تمیت القلب۔

(رواہ احمد والترمذی)

(ترجمہ) حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہو کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے (ایک دن ہم لوگوں کو مخاطب کرتے ہوئے) فرمایا، کون ہو جو مجھ سے سیکھ لے یہ چند خاص باتیں، پھر وہ خود ان پر عمل کرے یا دوسرے عمل کرنے والوں کو بتائے؟ میں نے عرض کیا یا رسول اللہ میں حاضر ہوں، تو آپ نے (از راہ شفقت) میرا ہاتھ اپنے دست مبارک میں لے لیا اور گن کر یہ پانچ باتیں بتائیں ——— فرمایا جو چیزیں اللہ نے حرام قرار دی ہیں اُن سے بچو اور ان سے پورا پورا پرہیز کرو، اگر تم نے ایسا کیا تو تم بہت بڑے عبادت گذار ہو، (اور یہ عبادت نفلی عبادت کی کثرت سے افضل ہو)، ——— دوسری بات آپ نے فرمائی کہ اللہ نے جو تمھاری قسمت میں لکھا ہو اس پر راضی اور مطمئن ہو جاؤ، اگر ایسا کروگے تو تم بڑے بے نیاز اور دولت مند ہو جاؤگے،

اور تیسری بات یہ کہ اپنے پڑوسی کے ساتھ اچھا سلوک کرو، اگر ایسا کروگے تو تم مومن کامل ہو جاؤگے۔ اور چوتھی بات یہ کہ جو تم اپنے لیے چاہتے اور پسند کرتے ہو وہی دوسرے لوگوں کے لیے بھی چاہو اور پسند کرو، اگر تم ایسا کروگے تو حقیقی مسلم اور پورے پورے مسلمان ہو جاؤگے اور پانچویں بات یہ ہے کہ زیادہ مت ہنسا کرو، کیونکہ زیادہ ہنسنا دل کو مردہ کر دیتا ہے۔"

(امام احمد و ترمذی)

(تشریح) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یہ پانچ باتیں بتانا چاہتے تھے، آپ نے مخاطبین میں خاص طلب پیدا کرنے کے لیے اور اُن کے دلوں کو پوری طرح بیدار اور متوجہ کرنے کے لیے پہلے ارشاد فرمایا کہ "میں اس وقت کچھ خاص باتیں بتانا اور سکھانا چاہتا ہوں، تم میں سے کون ان کو سیکھنا چاہتا ہو، لیکن اس کو ان باتوں کا یہ حق ادا کرنا ہوگا کہ وہ خود ان پر عمل کرے اور دوسروں کو بھی بتلائے تاکہ وہ بھی عمل کریں۔"

اس سے معلوم ہوا کہ جو آدمی دین کی باتیں سیکھے اس پر دو حق ہیں ایک یہ کہ خود ان پر عمل کرے، اور دوسرے یہ کہ اوروں کو پہونچائے اور بتلائے، بلکہ اگر خود پورا عمل نہ کرے تب بھی دوسروں کو بتانے سے دریغ نہ کرے۔

جو پانچ باتیں حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اس موقع پر تعلیم فرمائیں وہ بڑی اہم حقیقتیں ہیں۔ پہلی بات آپ نے یہ ارشاد فرمائی کہ بڑا عبادت گزار بندہ وہ ہے جو محرمات اور ممنوعات سے پرہیز کرتا ہو۔ اگرچہ زیادہ نفلی نمازیں نہ پڑھتا ہو نفلی روزے زیادہ نہ رکھتا ہو، ذکر و تسبیح میں بہت زیادہ مشغول نہ رہتا ہو ـــــ دوسری بات یہ فرمائی کہ اللہ کی طرف سے جو مقسوم اور مقدر ہو اس پر راضی ہو جانے سے آدمی کو بڑا اطمینان اور بڑی بے فکری نصیب ہو جاتی ہے، تیسری بات یہ کہ پڑوسیوں کے ساتھ اچھا برتاؤ کمالِ ایمان کی شرط ہے، چوتھی بات یہ کہ کامل مسلمان ہونے کے لیے ضروری ہے کہ آدمی دوسروں کا اتنا خیرخواہ اور بہی خواہ ہو کہ جو اپنے لیے چاہے وہی دوسروں کے لیے چاہے۔ اور پانچویں بات یہ کہ زیادہ نہ ہنسا جائے کیونکہ یہ عادت دل کو مردہ اور بے حس کر دیتی ہے۔

اگر اللہ کی توفیق سے اس کا کوئی بندہ آج بھی ان پانچ باتوں پر کاربند ہو جائے تو دُنیا ہی میں وہ جنت کا مزہ چکھ لے گا، اس کی زندگی پاک صاف اور بڑے اطمینان والی ہوگی، دور و قریب کے لوگ اس سے محبت کریں گے۔ اس کا دل اللہ کے ذکر سے زندہ اور شاداب ہوگا، اور آخرت میں اللہ کی رضا اور جنت کی جو نعمتیں اس کو ملیں گی ان کی قدر و قیمت اور حقیقی لذت تو بس وہیں جا کر معلوم ہوگی۔

(۱۴) عن ابی ذر قال امرنی خلیلی بسبع، امرنی بحب المساکین و الدنو منھم و امرنی ان انظر الی من ھو دونی ولا انظر الی من ھو فوقی، و امرنی ان اصل الرحم وان ادبرت، و امرنی ان لا اسأل احدا شیئاً و امرنی ان اقول بالحق وان کان مراً، و امرنی ان لا اخاف فی اللہ لومۃ لائم، و امرنی ان اکثر من قول لاحول ولا قوۃ الا باللہ فانھن من کنز تحت العرش۔　(رواہ احمد)

(ترجمہ) حضرت ابوذر غفاری رضی اللہ عنہ سے مروی ہے، انھوں نے فرمایا کہ مجھے میرے محبوب دوست (صلی اللہ علیہ وسلم) نے سات باتوں کا خاص طور سے حکم فرمایا ہے، مجھے آپ نے حکم فرمایا ہے، مساکین اور غرباء سے محبت رکھنے کا اور ان سے قریب رہنے کا، اور آپ نے حکم فرمایا ہے کہ دنیا میں ان لوگوں پر نظر رکھوں جو مجھ سے نیچے درجہ کے ہیں (یعنی جن کے پاس دنیوی زندگی کا سامان مجھ سے بھی کم ہے)، اور ان پر نظر نہ کروں جو مجھ سے اوپر کے درجہ کے ہیں، (یعنی جن کو دنیوی زندگی کا سامان مجھ سے زیادہ دیا گیا ہے، بعض دوسری احادیث میں ہے کہ ایسا کرنے سے بندہ میں صبر و شکر کی صفت پیدا ہوتی ہے، اور یہ ظاہر بھی ہے) آگے حضرت ابوذر فرماتے ہیں کہ — اور مجھے آپ نے حکم دیا ہے کہ میں اپنے اہلِ قرابت کے ساتھ صلہ رحمی کروں اور قرابتی رشتہ کو جوڑوں، (یعنی ان کے ساتھ وہ معاملہ اور وہ سلوک کرتا رہوں جو اپنے عزیزوں قریبوں کے ساتھ کرنا چاہیے) اگرچہ وہ میرے ساتھ ایسا نہ کریں، اور آپ نے مجھے حکم دیا ہے کہ

کسی آدمی سے کوئی چیز نہ مانگوں (یعنی اپنی ہر حاجت کے لیے اللہ ہی کے سامنے ہاتھ پھیلاؤں اور اس کے سوا کسی کے در کا سائل نہ بنوں) اور آپ نے مجھے حکم فرمایا کہ میں ہر موقع پر حق بات کہوں، اگرچہ وہ لوگوں کے لیے کڑوی ہو (اور ان کی خواہشات اور اغراض کے خلاف ہونے کی وجہ سے انھیں بری لگے) اور آپ نے مجھے حکم فرمایا ہے کہ میں اللہ کے راستے میں کسی ملامت کرنے والے کی ملامت سے نہ ڈروں (یعنی دنیا والے اگرچہ مجھے برا کہیں لیکن میں وہی کہوں اور وہی کروں جو اللہ کا حکم ہو اور جس سے اللہ راضی ہو اور کسی کے برابھلا کہنے کی مطلق پروا نہ کروں) اور آپ نے مجھے حکم فرمایا ہے کہ میں کلمہ "لَاحَوْلَ وَلَا قُوَّةَ اِلَّا بِاللّٰہِ" کثرت سے پڑھا کروں، کیونکہ یہ سب باتیں اس خزانے سے ہیں جو عرش کے نیچے ہے (یعنی یہ اس خزانے کے قیمتی جواہرات میں جو عرش الٰہی کے نیچے ہے اور جن کو اللہ ہی جن بندوں کو چاہتا ہے عطا فرماتا ہے، کسی اور کی وہاں تک دسترس نہیں)۔ (امام احمد)

(تشریح) حدیث کی ضروری تشریح ترجمہ ہی کے ضمن میں ہو چکی ہے، یہاں صرف ایک بات یہ قابل ذکر ہے کہ کلمہ "لَاحَوْلَ وَلَاقُوَّةَ اِلَّا بِاللّٰہِ" جس کی کثرت کی اس حدیث میں تاکید فرمائی گئی ہے۔ اس کی تشریح خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے ایک حدیث میں مروی ہے کہ "گناہوں سے بچاؤ اور نیکی کرنے کی قوت بس اللہ ہی کی توفیق سے بندہ کو ملتی ہے" یعنی اللہ کا فضل اور اس کی توفیق اگر شامل حال نہ ہو تو بندہ نہ گناہوں سے بچ سکتا ہے اور نہ نیک اعمال کر سکتا ہے، پس بندہ کو چاہیے کہ وہ ہمیشہ اللہ سے توفیق اور اس کا فضل مانگتا رہے اور معصیات سے بچنا اور نیک اعمال کا کرنا اگر نصیب ہو تو اس کو اپنا کمال نہ سمجھے، بلکہ اللہ کا فضل و کرم جانے ـــــ واقعہ یہ ہے کہ یہ کلمہ جس حقیقت کو بیان کرتا ہے اگر اس کے دھیان اور استحضار کے ساتھ کثرت سے اس کا ورد کیا جائے تو بندہ کی اصلاح کے لیے اکسیر ہے اور اس میں بڑی تاثیر ہے، مشائخ طریقت میں سے خصوصیت کے ساتھ حضرات شاذلیہ طالبینِ سالکین کو اسی کلمہ کی کثرت کی زیادہ تلقین کرتے ہیں۔

(۱۵) عن ابی ھریرۃ قال قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم امرنی ربی بتسع خشیۃ اللہ فی السر والعلانیۃ، وکلمۃ العدل فی الغضب والرضا، والقصد فی الفقر والغنا وان اصل من قطعنی واعطی من حرمنی واعفو عمن ظلمنی، وان یکون صمتی فکراً ونطقی ذکراً، ونظری عبرۃ و امر بالعرف وقیل بالمعروف۔ (رواہ رزین)

(ترجمہ) حضرت ابوہریرہ سے مروی ہے، بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ مجھے میرے پروردگار نے ان نو باتوں کا خاص طور سے حکم فرمایا ہو، ایک اللہ سے ڈرنا خلوت میں اور جلوت میں، اور عدل و انصاف کی بات کہنا غصہ میں اور رضامندی میں (یعنی ایسا نہ ہو کہ جب کسی سے ناراضی اور اس پر غصہ ہو تو اس کی حق تلفی اور اس کے ساتھ بے انصافی کی جائے اور جب کسی سے دوستی اور رضامندی ہو تو اس کی بے جا حمایت اور طرفداری کی جائے۔ بلکہ ہر حال میں عدل و انصاف اور اعتدال کی راہ پر چلا جائے) اور حکم فرمایا میانہ روی پر قائم رہنے کا، غریبی و ناداری و فراخدستی و دولت مندی کی دونوں حالتوں میں (یعنی جب اللہ تعالیٰ ناداری اور غریبی میں مبتلا کرے تو بے صبری اور پریشاں حالی کا اظہار نہ ہو اور جب وہ فراخدستی اور خوشحالی نصیب فرمائے تو بندہ اپنی حقیقت کو بھول کر غرور اور سرکشی میں مبتلا نہ ہو جائے، الغرض ان دونوں امتحانی حالتوں میں افراط و تفریط سے بچا جائے اور اپنی روش درمیانی رکھی جائے، یہی وہ میانہ روی ہو جس کا اللہ تعالیٰ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو حکم فرمایا ہو آگے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں) اور مجھے حکم فرمایا کہ میں ان اہل قرابت کے ساتھ بھی رشتہ جوڑوں اور ان کے حقوق قرابت اچھی طرح ادا کروں جو مجھ سے رشتۂ قرابت توڑیں اور میرے ساتھ بدسلوکی کریں، اور یہ کہ میں ان لوگوں کو بھی دوں جنھوں نے مجھے محروم رکھا ہو، اور میرا حق مجھے نہ دیا ہو، اور یہ کہ میں ان لوگوں کو معاف کر دوں جنھوں نے

مجھ پر ظلم کیا ہو اور مجھے ستایا ہو، اور مجھے حکم دیا ہو کہ میری خاموشی میں تفکر ہو (یعنی جس وقت میں خاموش ہوں تو اس وقت سوچنے کی چیزیں سوچوں، اور جو چیزیں قابلِ تفکر ہیں اُن میں غور و تفکر کروں، مثلاً اللہ تعالیٰ کی صفات اور اس کی آیات اور مثلاً یہ کہ اللہ تعالیٰ کا معاملہ میرے ساتھ کیا ہو اور اس کا مجھے کیا حکم ہو اور میرا معاملہ اللہ کے ساتھ اور اس کے احکام کے ساتھ کیا ہو اور کیا ہونا چاہیے۔ اور میرا انجام کیا ہونے والا ہو، اور مثلاً یہ کہ اللہ کے غافل بندوں کو کس طرح اللہ سے جوڑا جائے، الغرض خاموشی میں اس طرح کا تفکر ہو) اور مجھے یہ حکم دیا ہو کہ میری گفتگو ذکر ہو (یعنی میں جب بھی بولوں اور جو بھی بولوں اس کا اللہ سے تعلق ہو خواہ اس طرح کہ وہ اللہ کی ثنا و صفت ہو یا اس کے احکام کی تعلیم و تبلیغ ہو، یا اس طرح کہ اس میں اللہ کے احکام اور حدود کی رعایت اور نگہداشت ہو، ان سب صورتوں میں جو گفتگو ہوگی وہ "ذکر" کے قبیل سے ہوگی) اور مجھے حکم ہو کہ میری نظر عبرت والی نظر ہو (یعنی میں جس چیز کو دیکھوں اس سے سبق اور عبرت حاصل کروں، اور لوگوں کو حکم کروں اچھی باتوں کا" (رزین)

(تشریح) ضروری تشریح ترجمہ کے ضمن میں ہو چکی ہو ___ صرف ایک بات اور قابلِ ذکر ہے کہ حدیث کا آخری جز (وآمر بالمعروف) اُن نو باتوں سے علاوہ ہو، گویا حضور نے اللہ تعالیٰ کے وہ خاص نو حکم بیان فرمانے کے بعد جو آپ اس موقع پر بیان فرمانا چاہتے تھے، اللہ تعالیٰ کا ایک اور اہم حکم بھی بیان فرما دیا جس کے لیے آپ نبی و رسول ہونے کی حیثیت سے خاص طور سے مامور ہیں۔ اور وہ آپ کا خاص الخاص فرض منصبی ہو، یعنی "امر بالمعروف" جس میں نہی عن المنکر بھی داخل ہو کیونکہ وہ دراصل امر بالمعروف ہی کی منفی صورت ہو ___ یہ حدیث اور اس سے پہلی حدیث بھی بڑی اہم تعلیمات کی جامع ہیں اور حق یہ ہو کہ اللہ تعالیٰ اگر عمل نصیب فرما دیں تو اصلاح و تزکیہ کے لیے یہی دو حدیثیں کافی ہیں۔

تذکرۂ باقی

یعنی

حضرت خواجہ باقی باللہ دہلویؒ کی کتابِ زندگی کے چند ورق

(از ——— مولانا نسیم احمد فریدی فاروقی امروہوی)

صاحبزادگانِ حضرت خواجہ باقی باللہ دہلویؒ کا تذکرہ لکھتے وقت ارادہ تھا کہ آئندہ آپ کے خلفاء کے حالات مرتب کروں گا ——— مگر بعد کو خیال آیا کہ اس سے پہلے حضرت خواجہؒ کا ذکر خیر ہونا چاہیے اس سلسلے میں مولانا محمد ہاشم کشمی صاحب زبدۃ المقاماتؒ اور صاحب سراجیہ نے میری خاص طور سے امداد کی ——— اگرچہ خواجہ باقی باللہؒ کے سوانح حیات ، حیات باقی وغیرہ کتابوں میں اردو زبان کے اندر شائع ہو چکے ہیں مگر میں چاہتا ہوں کہ خاص ترتیب کے ساتھ مستند ترین حوالہ جات کے حالات خواجہ پیش کر کے سعادت دارین حاصل کروں۔ اس مادی دور میں جب کہ تزکیہ نفس اور تہذیب اخلاق کی اہمیت دلوں سے نکلتی جا رہی ہو. تعلق باللہ میں کمزوری آ رہی ہو ، بالقصد ان ذرائع اور وسائل کو ختم کرنے کی مسلسل کوشش جاری ہو جن سے سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم اور ان کے لائے ہوئے دین سے شیفتگی و فریفتگی اندرون قلب میں پیدا ہوتی تھی بزرگوں کے کارنامے بھلا کر

---

[1] یہ کتاب حضرت خواجہ باقی باللہ کی وفات سے تقریباً ۲۰ سال بعد لکھی گئی . حالات خواجہؒ و مجددؒ میں مستند ترین کتاب ہو . اس کا اصل نام برکات الاحمدیہ الباقیہ ہو .

اپنے ناقص سکے دلوں پر جمائے جا رہے ہیں۔ نقوش انسانیت مٹ رہے ہیں ــــ بار بار ایسے واقعات پارینہ دہرانے ضروری ہیں جن سے معلوم ہو کہ اس گلشن عالم میں ایک ایک عندلیب شیدا کے بہار خیز ترانوں سے کس کس طرح روح بہار دوڑنے لگتی ہو اور ایک ایک مست الست کی روحانی کیف سے کیسے کیسے زریں نقوش ڈھل کر نکلتے ہیں ــــ دہلی مرحوم کی یاد میرے کس حساس دل سے مٹائی نہ جا سکے گی، اس سرزمین پر کیسے کیسے عظیم الشان روحانی شفا خانے اور علم و عمل کے کارخانے تھے، افسوس اب وہ سب زینت طاق نسیاں ہو رہے ہیں۔ اس کے چپے چپے پر جہاں اور بہت سے خزانے دفن ہیں وہاں ماوراء النہر کا ایک گوہر شب چراغ "بھی" تہ خاک پوشیدہ ہو ــــ اس کا نام باقی ہو ــــ اس کا کام باقی ہو ــــ اس کو خواجہ باقی باللہ دہلوی رح کہا جاتا ہو، اس نقشبندی درویش نے اپنی توجہ اور تربیت کے فیض سے حضرت مجدد الف ثانی جیسا روشن دل انسان تیار کیا جو بجا طور پر ہند میں "سرمایۂ ملت" کا نگہبان تھا ــــ آؤ اس نقشبندی خواجہ کے کچھ حالات سنائیں۔

ابتدائی حالات

خواجہ محمد باقی رح نام ــــ لقب خواجہ باقی باللہ ــــ والد بزرگوار کا نام مبارک قاضی عبد السلام ــــ خواجہ صاحب ۹۷۲ھ میں بمقام کابل پیدا ہوئے۔ مولانا صادق حلوائی سے تعلیم حاصل کی اور ان کے ہمراہ کابل سے ماوراء النہر آئے وہاں پر بھی تحصیل علم کا سلسلہ جاری رہا اور اپنے اقران میں امتیاز تام حاصل کیا ــــ اگرچہ علوم ظاہریہ کی تکمیل نہ ہو سکی، لیکن فراست اور پیدائشی ذکاوت سے اس مقام تک پہونچ چکے تھے کہ کتب متداولہ مشکلہ کا مطالعہ کر کے ان کو سمجھ سکیں۔

علم باطن کی طرف توجہ

بعدہٗ علم باطن کی طرف توجہ ہوئی۔ آپ یوں تو اویسی المشرب تھے، یعنی آپ کی تربیت باطنی حضرت رسالتمآب صلی اللہ علیہ وسلم اور حضرت خواجہ بہاء الدین رحمۃ اللہ علیہ کی روحانیت سے ہوئی تھی، لیکن ظاہر میں بھی کسی شیخ کامل کی تلاش تھی۔ ابتداءً ماوراء النہر ہی میں جو درویشوں کا مخزن و معدن

بنا ہوا تھا بہت سے مشائخ کے ہاتھ پر توبہ کی اس کے بعد ہندوستان تشریف لائے، یہاں آپ کے بعض دوستوں نے جو اعلیٰ مناصب پر تھے آپ کو مجبور کیا کہ آپ فوج میں ملازمت کر لیں لیکن قدرت کو آپ سے سرزمین ہند میں ایک بڑا کام لینا تھا اس لیے دنیاوی وجاہت کی طرف توجہ نہ کرتے ہوئے آپ نے صاف انکار فرما دیا۔ اس عرصہ میں اصحاب معرفت اور ارباب محبت کی کتابوں کا آپ نے مطالعہ کیا۔ ان کتابوں کے مطالعہ نے ایک نئی روح آپ کے اندر پھونک دی اور آپ ہمہ تن فقر و درویشی کی طرف متوجہ ہو گئے۔

جستجوئے مشائخ ہندوستان آکر بھی آپ نے مشائخ کی جستجو برابر جاری رکھی۔ بلدۂ لاہور میں برسات کے موسم میں وہاں کے گورستانوں بیابانوں اور کھنڈروں میں اسی کی تلاش تھی کہ کوئی درویش باصفا مل جائے۔ بعض مجذوبوں سے بھی ملاقات کی۔ اور اس سلسلۂ جستجو میں بڑی دشواریاں برداشت کیں۔ حضرت خواجہؒ نے خود فرمایا ہو کہ اگرچہ میں نے ریاضاتِ شاقہ نہیں جھیلیں لیکن "انتظار شدید" اور "قلق عظیم" کی لذتیں خوب چکھی ہیں جو کہ سخت سے سخت ریاضت و مشقت کو متضمن تھیں۔ اصل الفاظ یہ ہیں ——— "اگرچہ ما ریاضاتِ شاقہ چنانچہ بعضے اہل اللہ کشیدہ نکشیدہ ایم لیکن انتظارہا و قلقہائے عظیم دیدہ ایم کہ ریاضتہائے و محنتہائے شگرف را متضمن بود۔"

والدۂ ماجدہ کی دعائیں حضرت خواجہؒ کی والدۂ ماجدہ ایک خدا رسیدہ خاتون تھیں خود فرماتے ہیں کہ اُن کی دعاؤں اور مناجاتوں کی برکت سے بھی دولت باطنی سے ہم آغوشی نصیب ہوئی ہو، اپنے جوان بیٹے کو اس طرح سراسیمہ اور پریشان اور تلاش مطلوب میں دن رات سرگرداں دیکھ دیکھ کر ان کی والدہ راتوں کو اٹھ اٹھ کر دعا کرتی تھیں کہ اے اللہ میرے بچے کی مراد کو پورا کر دے جو تیری طلب میں سب کچھ آزاد اور لذت جوانی سے کنارہ کش ہو گیا ہو اور اگر اس کی مراد پوری نہیں کرنی تو مجھے زندہ نہ رکھ مجھ سے اس کی یہ ناکامی و بے آرامی نہیں دیکھی جاتی ——— خود فرماتے ہیں۔

"ازاں دعا و التماس ایشان مرا کشائشہا روزی گردید جزاہم اللہ عنہا خیر الجزاء"

متعدد مشائخ سے تحصیل فیض

حضرت خواجہؒ نے مشائخ کی ملاقات اور ان سے اخذ طریقت کرنے کے لیے بہت سے دور دراز مقامات کا سفر اختیار کیا ہے ——— ایک مرتبہ ایک مقام پر ایک شیخ طریقت کے پاس پہونچے، چاہا کہ ان سے اخذ طریقت کریں اور سلوک طے کریں، استخارہ فرمایا، حضرت خواجہ محمد پارساؒ ظاہر ہوئے اور انھوں نے فرمایا کہ تفصیل سے سلوک طے کرنے کا مقصد یہی تو ہے کہ تہذیب اخلاق حاصل ہو جائے اور تم کو تہذیب اخلاق کی دولت نصیب ہو ہی چکی ہے پھر یہ تحصیل حاصل کیوں؟

خود حضرت خواجہؒ نے اپنے ابتدائے سلوک کے واقعات اس طرح لکھے ہیں۔ — کہ ابتداءً میں نے معاصی سے توبہ خواجہ عبیدؒ کی خدمت میں کی خواجہ عبیدؒ مولانا لطف اللہ کے خلفاء میں سے تھے۔ چونکہ توفیق استقامت یہاں نصیب نہ ہوئی اس لیے بار دگر حضرت افتخار شیخؒ کی خدمت میں توبہ کی۔ یہ بزرگ سمرقند میں مقیم تھے۔ اور حضرت خواجہ احمد یسویؒ کے سلسلے میں تھے۔ باصرار خواجہ انھوں نے توبہ کرائی اور فرمایا ——— "خدا استقامت دہد" ——— بعدہٗ امیر عبداللہ بلخیؒ کی خدمت میں تجدید توبہ کی۔ — فرماتے ہیں کہ ان سے مصافحہ کرتے ہی وہ نعمت باطنی نصیب ہوئی جس کے برکات امید ہے کہ قیام قیامت تک باقی رہیں گے۔

کشمیر میں حضرت شیخ بابا ولی قدس سرہ العزیز کی خدمت میں پہونچ کر اُن کی برکات نظر سے بھی مستفیض ہوئے ہیں، حضرت کشمیریؒ سلسلۂ علیہ نقشبندیہ کے شیخ مجاز تھے، ان بزرگ کے انتقال کے بعد آپ کی نسبت نقشبندیہ میں قوت پیدا ہوئی ——— علاوہ ازیں بلخ و بدخشاں میں مختلف سلاسل کے درویشوں سے مستفیض ہوئے اور "احوال حاصلہ" کی تصحیح کی۔ — مولانا میر عالی قدس سرہٗ کے پاس بھی پہونچے ہیں ——— اسی جستجو کے سلسلہ میں سمرقند بھی جانا ہوا ——— اس زمانہ میں ہی آپ کے حالات و کمالات کو دیکھ دیکھ کر طالبین آپ کی طرف پروانہ وار متوجہ ہو رہے تھے۔

لیکن آپ نے ابھی مسندِ مشیخت پر بیٹھنا پسند نہیں فرمایا ـــــ صاحب زبدۃ المقامات لکھتے ہیں:۔

"باوجود حصول ایں حالات وکمالات درجوع طلاب بآستان ایشان حضرت خواجہ ازیں ہمت عالی وتفرید والا برسر مشیخت وتعلیم طریقت نیامدند دلبیر ماورالنہر د بلخ ویدخشاں شدند"۔

حضرت مولانا امکنگی کی خدمت میں پہونچ کر دوبارہ ہندوستان آنا

آخر میں حقائق پناہ ارشاد دستگاہ حضرت مولانا خواجگی امکنگی قدس سرہٗ العزیز کی خدمت میں پہونچ گئے ـــ اور اُن کی خدمت میں خواجگان نقشبندیہ کا طریقہ اخذ کیا، یہ بزرگ ماوراالنہر میں مقیم تھے۔ جس وقت ماوراالنہر کی جانب متوجہ تھے تو راستہ میں ایک شہر میں مولانا امکنگی کو خواب میں دیکھا کہ وہ تشریف لائے ہیں اور فرماتے ہیں اے فرزند چشم ما براہ شما است" (ہم تمھارے منتظر ہیں)، حضرت خواجہؒ کے جذبات کا ابھر کیا پوچھنا اپنے اس شعر کو اس وقت زبان پر جاری فرمایا ؎

یکگذشتم زغم آسودہ کرنا گہ زکمیں عالم آشوب نگاہے سرراہم بگرفت

حضرت مولاناؒ کی نسبت بیعت دُو واسطوں سے خواجہ احرارؒ تک پہونچتی ہو ـــ جب حضرت مولانا امکنگیؒ کی خدمت میں پہونچے انھوں نے حضرت خواجہؒ کے "احوال بلند" کا مشاہدہ کیا تین شبانہ روز تخلیہ میں ان کی طرف خاص توجہ فرمائی اور بعض فوائد کی اطلاع دے کر فرمایا کہ تمھارا کام اللہ تعالیٰ کی حمایت اور بزرگوں کی شفقت سے انجام پذیر ہوگیا، اب تم کو چاہیے کہ اس سلسلۂ علیہ کی اشاعت کے لیے ہندوستان جاؤ تاکہ وہاں یہ سلسلہ رونق پائے اور تمھاری برکت تربیت سے "مستفیدان عالی مقدار" بروئے کار آئیں ـــــ حضرت خواجہؒ نے ازراہ انکساری ہرچند معذرت پیش کی لیکن حضرت مولانا کا برابر یہی اصرار رہا ـــــ حضرت مولانا امکنگیؒ کے اقربا میں سے ایک درویش کا بیان ہو کہ جب حضرت مولاناؒ کے قدیم الخدمت اور صاحب نسبت مریدوں نے یہ سُنا کہ حضرت مولاناؒ نے چند روز میں حضرت خواجہؒ کو خلافت واجازت کاملہ دے کر کشور ہندوستان کو رخصت فرمایا ہو تو وہ لوگ کچھ ملول ہوئے

اور آپس میں چہ میگوئیاں کرنے لگے جب حضرت مولاناؒ کو اس کا پتہ چلا تو فرمایا کہ ـــــ تمھیں خبر نہیں ہو، یہ شخص اپنا کام پورا کر کے یہاں آیا تھا میرے پاس تو اس شخص نے فقط تصحیح، حال کی ہو اور بس یقیناً جو اس طرح کا کمال رکھتا ہوگا وہ اسی طرح جلد کامیاب ہو کر واپس ہوگا۔ فارسی الفاظ یہ ہیں ـــــ "لاجرم ہر کہ چناں آید چنیں رود"

پس حضرت خواجہؒ اپنے پیر کے حکم کے مطابق متوجہ ہندستان ہو گئے۔ اس وقت زمانہ بزبانِ حال حافظ شیرازیؒ کا یہ شعر ترنم کے ساتھ پڑھ رہا تھا۔

شکر شکن شوند ہمہ طوطیان ہند　　زیں قند پارسی کہ بہ بنگالہ می رود

جب ہندوستان پہونچے تو ایک سال لاہور میں رہے وہاں کے بہت سے علماء و فضلاء آپکے شیفتہ و فریفتہ ہوئے۔ لیکن چونکہ دہلی مرکزی حیثیت سے دارالاولیاء اور بیت الفقراء بنی ہوئی تھی اس لیے آپنے وہاں کا قصد فرمایا اور وہاں پر قلعہ فیروزی میں جو کہ دریائے جمنا کے کنارے پر واقع تھا، اور اس میں ایک عظیم الشان مسجد بھی تھی ـــــ سکونت فرمائی ـــــ انتقال کے وقت تک اس جگہ سے دوسری جگہ تشریف نہیں لے گئے۔

سنبھل میں خواجہ اللہ بخش گڈھ مکتیسریؒ سے ملاقات

اگرچہ تلاش مشائخ و ملاقات مشائخ کا عنوان گزر چکا ہو اور یہ بات اسی کے ذیل میں آسکتی تھی لیکن میں نے چاہا کہ خواجہ اللہ بخش گڈھ مکتیسریؒ کی ملاقات کا تذکرہ مستقل عنوان سے کروں پہلی مرتبہ حضرت خواجہؒ نے تلاش مشائخ کے سلسلہ میں ہندستان کے مختلف مقامات کا دورہ فرمایا۔

لہ خواجہ اللہ بخش گڈھ مکتیسریؒ شیخ مبارکؒ مرید سید علی قوام شطاری کے مرید و خلیفہ تھے۔ ۸ رمضان [illegible]ھ کو انتقال ہوا۔ سورۂ اخلاص کے اعداد سے تاریخ وفات برآمد ہوتی ہو۔ حضرت شیخ تاج الدین سنبھلی پہلے سلسلۂ حنفیہ شطاریہ میں حضرت گڈھ مکتیسریؒ کے مرید و خلیفہ تھے، بعدہٗ حضرت خواجہ باقی باللہؒ سے سلسلۂ نقشبندیہ میں خلافت و اجازت حاصل کی۔ مزار گڈھ مکتیسر ضلع میرٹھ میں ہے۔

(زبدۃ المقامات، اسرار یہ قلمی، مونس الذاکرین، تاریخ جونپور)

تھا ان میں لاہور وکشمیر کا ذکر تو تذکروں میں نمایاں طور پر ملتا ہو لیکن وہ لاہور وکشمیر کے علاوہ کہاں کہاں تشریف لے گئے ـــــ اس کو آج کون بتلائے ؟ آئیے ـــــ حضرت خواجہ گدڑہ مکٹیسری کی ملاقات کے سلسلے میں حضرت خواجہؒ کے سنبھل تشریف لانے کا کچھ ذکر کریں ـــــ سید کمال سنبھلیؒ نے یہ بات صاف طور پر بیان کی ہو ورنہ صاحب زبدۃ المقامات کی عبارت سے واضح طور پر سمجھ میں نہیں آتی تھی۔ مولانا کشمیؒ لکھتے ہیں ـــــ " در بدایت طلب کہ حضرت خواجہؒ با بخدمت مشائخ تردد می فرمودند در قریۂ از قرائے سنبھل کہ از بلاد تابعہ دہلی است بصحبت شیخ اللہ بخش نیز رسیدہ بودہ اند" ـــــ یہ سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ حضرت خواجہؒ گدڑہ مکٹیسر والے خواجہ اللہ بخشؒ سے ملنے کے لیے بجائے گدڑہ مکٹیسر کے سنبھل کے کسی قریے میں کس لیے پہونچے اور وہاں اُن سے کیونکر ملاقات ہوئی ؟ پھر گدڑہ مکٹیسر اور سنبھل کا کافی فاصلہ ہو، وہ سنبھل کا قریہ قرار نہیں دیا جا سکتا ـــــ علاوہ ازیں صاحب زبدۃ المقامات نے خواجہ اللہ بخشؒ کے نام کے ساتھ گدڑہ مکٹیسر کی نسبت بھی نہیں کی ہو، اس لیے سمجھا جا سکتا تھا کہ یہ خواجہ اللہ بخش کوئی دوسرے غیر معروف بزرگ ہونگے جو سنبھل کے کسی گاؤں میں رہتے ہونگے ـــــ گر صاحب اسرار یہ نے یہ بات صاف کر دی ـــــ وہ شیخ محمد و شیخ پیر محمد نبیرگان حضرت شیخ اللہ بخش گدڑہ مکٹیسریؒ کے ذکر میں لکھتے ہیں۔

منقول است کہ شیخ اللہ بخشؒ از کاملان بودہ است صاحب آیات ظاہرہ و کرامات باہرہ خواجہؒ بزرگ در وقت آمدن بہ سنبھل شیخ را دیدہ اند چنانچہ در ذکر شیخ رفیع الدین گذشت۔

(اسراریہ)

شیخ اللہ بخش گدڑہ مکٹیسریؒ کاملین میں سے تھے اور صاحب کرامات بزرگ تھے، حضرت خواجہ باقی باللہ نے سنبھل تشریف لا کر شیخ اللہ بخش کو دیکھا ہو، جیسا کہ شیخ رفیع الدین کے تذکرے میں گزر چکا۔

افسوس میرے پاس اسراریہ کا وہ حصہ نہیں جس میں شیخ رفیع الدین کا ذکر ہو۔ اس حصہ سے بھی اس سلسلے میں بہت کچھ معلوم ہو جاتا۔

اب ایک چیز باقی رہ جاتی ہو کہ صاحب زبدۃ المقامات نے " در قریۂ از قرائے سنبھل " سے کیا مطلب لیا ہو۔ غور کرنے سے پتہ چلا کہ شاید سنبھل کا کوئی محلہ مراد ہو۔ واللہ اعلم بالصواب۔

جن حضرات نے سنبھل کو دیکھا ہو ان کو معلوم ہو کہ قریب قریب ہر بڑا محلہ ایک مستقل بستی کی حیثیت رکھتا ہو اور محلہ جات کے درمیان کھیتوں کا فصل ہو، اسی بنا پر اگر اس کے کسی محلہ کو قریہ کہہ دیا گیا ہو تو کچھ بعید نہیں ــــــ حقیقت واقعہ یہ ہو کہ شیخ اللہ بخش مبادی حال میں طلب حق کے سلسلہ میں سنبھل پہونچے تھے اور ایک مسجد میں رہنے لگے ــــــ جیسا کہ اسرار یہ میں ہے۔

"گویند در مبادی حال اندر طلب حق بر آمدہ و سنبھل رسیدہ و در مسجد بسر بردہ"

یہ محلہ غالباً وہ ہو جس کو آج حاتم سرائے کہا جاتا ہو ــــــ صاحب اسراریہ کہتے ہیں کہ مسجد میں ایک اجنبی مسافر کو جب افضل الفضلا شیخ حاتم سنبھلیؒ نے دیکھا تو دریافت کیا کہ از کدام قومی؟ ــــــ شیخ اللہ بخشؒ نے کچھ جواب نہیں دیا، انھوں نے دوبارہ یہی سوال کیا کہ تم کس قوم سے ہو کون ہو؟۔ دوسری مرتبہ بھی جواب نہیں ملا ـــ تیسری مرتبہ شیخ حاتمؒ نے کہا کہ اے جوان! تیرا خاموش رہنا اور کچھ جواب نہ دینا کیا معنیٰ رکھتا ہو؟ پھر جو جواب دیا ہو وہ آب زر سے لکھنے کے قابل ہو۔

جواب داد کہ من از قومے کہ بودہ ام بر آمدہ ام و بدان مطلبے کہ خواہانم نرسیدہ پس خود را از کدام قوم فرانمائم۔ (اسراریہ)

جواب دیا کہ میں جس قوم سے ہوں اس سے تو نکل آیا ہوں اور جس مقصد کا خواہاں ہوں اس تک پہونچا نہیں، پھر میں اپنے آپ کو کس قوم سے بتلاؤں۔

شیخ حاتمؒ نے یہ سن کر از راہ ترحم و شفقت تسلی دیتے ہوئے فرمایا۔

بداں راہے کہ قدم نہادہٗ رسیدہٗ خود را از جماعت رسیدگان بنگار۔ (اسراریہ)

جس راہ میں تم نے قدم رکھا ہو اس کی منزل مقصود کو تم پہونچ گئے۔ اب تم اپنے کو کامیاب شدہ لوگوں میں سے سمجھو۔

یہ گفتگو میں نے اسراریہ سے اس لیے نقل کی کہ اس سے معلوم ہو رہا ہو کہ خواجہ گدھ مکتیسریؒ کی ابتدائے سلوک میں سنبھل آئے تھے اور وہاں کسی محلہ کی مسجد میں قیام فرمایا تھا ـــ حضرت خواجہ باقی باللہ اسی زمانۂ قیام میں اُن سے سنبھل میں ملے ہوں گے۔

حضرت خواجہؒ کو خواجہ اللہ بخشؒ کے پاس جانے کی شیخ تاج الدین سنبھلیؒ نے ترغیب دی تھی وہ پہلے ان کے ہی مرید تھے ——— چنانچہ زبدۃ المقامات میں ہو ——— "شیخ تاجؒ دلالت بارادت وصحبت شیخ خود کردہ بود" اگرچہ حضرت خواجہؒ نے خواجہ اللہ بخشؒ کے سلسلۂ طریقت سے اپنا کوئی تعلق پیدا نہیں کیا مگر ان کے معتقد ضرور ہو گئے تھے۔ جیسا کہ حضرت کی بعض تحریرات سے آشکار ہوتا ہو۔ زبدۃ المقامات میں ہو۔

"حضرت خواجہ ما دریں باب استخارہ نمودہ بودہ اند و از اکابر خواجگان نقشبندیہ روح اللہ ارواحہم رخصت آں انتساب نیافتہ از انجا عناں سیر بصوب دیگر منصرف داشتہ اند اما شیوۂ فقر و نیستی و حال شیخ اللہ بخش را معتقد می بودہ اند چنانچہ از بعضے مرقومات ایشاں پیدا است۔"

صاحب اسرار یہ نے تو یہاں تک لکھا ہو کہ حضرت خواجہؒ نے حضرت شیخ اللہ بخشؒ کی بہت تعریف فرمائی ہو اور ان کے جذبے کو سراہا ہو اور یہ فرمایا ہو کہ

"چوں شیخ در ہندوستان کسے ندیدہ ام"

حضرت خواجہؒ کے ہندوستان کو دوبارہ مراجعت فرمانے کے بعد حضرت شیخ گدھ مکیسریؒ کا وصال ہو چکا تھا جیسا کہ زبدۃ المقامات میں ہو۔

"چوں حضرت خواجہؒ از سفر میامن اثر ماوراء النہر بہند مراجعت نمودہ بارشاد طلاب توجہ فرمودہ اند شیخ اللہ بخشؒ سفر آخرت اختیار کردہ بودہ است" (باقی)

حکیم الامت ——— نقوش و تاثرات (از مولانا عبدالماجد صاحب دریابادی) حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کو ایک ممتاز عالم دین اور عارف و مصلح شیخ وقت کی حیثیت سے تو عام طور سے جانا جاتا ہو، لیکن اس کتاب سے حضرت ممدوح کے علمی و عملی ظاہری و باطنی کمالات کے علاوہ خاص بات ناظرین کو یہ بھی معلوم ہوگی کہ نفس انسانیت کے لحاظ سے حضرت کا مقام کتنا بلند تھا، اور ان کے اصول و ہدایات کو اپنا کر آدمی کچھ اور بنے یا نہ بنے لیکن ایک بہترین اور بلند سیرت انسان ضرور بن سکتا ہو ——— پھر مولانا دریابادی کے قلم نے کتاب میں جو دلچسپی اور تاثیر بھر دی ہو، اس کا اندازہ ناظرین کو مطالعہ کے بعد ہی ہو سکے گا۔ قیمت آٹھ روپے مجلد (مجلد)

ھَادِمُ اللَّذَّاتِ

"کمزور حافظہ کی ایک تاریخی مثال"

(از مولانا مناظر احسن گیلانی)

ھاتھا علی طول ثدیھا و ریح ابطیھا　　　(تاریخ دمشق ابن عساکر ج ۵ ص۴۰۹)

"لے آ! اسی کو لے آ! اس کی چھاتی کی درازی اور گندہ بغل کے ساتھ"

طائف کے بھٹی خانوں میں جس بازاری عورت کو جاہلیت کے زمانہ میں ـــــ بی بی کرمت ہونے والے مندرجۂ بالا نانوشتہ بہ الفاظ کے ساتھ بلایا کرتے تھے، سُمیہ اس کا نام تھا، طائف کے طبیب حارث بن کلدہ کی وہ باندی تھی، کہتے ہیں کہ ایران کے کسی دہقان (دہقان دہ یعنی زمیندار) نے شفایابی کی خوشی میں بطور فیس کے یہی لونڈی عرب کے اس معالج حارث کو بخش دی تھی، حارث سُمیہ کو طائف لے آیا، کچھ دن بعد اپنے ایک رومی غلام عبید کے ساتھ سمیہ کا عقد بھی کر دیا تھا، لیکن عبید کی منکوحہ ہونے کے بعد بھی بغیہ یعنی (خرچی کمانے والی عورت) کا کام کرتی تھی، خود کرتی تھی، یا اس کے شوہر عبید کا اشارہ اس میں شریک تھا، یا حارث جو سمیہ کا آقا تھا اس ذریعہ سے بھی آمدنی حاصل کرتا تھا، جاہلیت کی تاریکیوں میں جو کچھ ہو رہا تھا اس کو پیش نظر رکھتے ہوئے ان ساری باتوں کی گنجائش ہو، بلکہ ابن خلدون کے بیان سے تو معلوم ہوتا ہو کہ خرچی کمانے یا کموانے کا یہ طریقہ جاہلی دستور کے مطابق کھانے کمانے کا بھی، اور عورتوں سے استفادہ کا بھی کوئی خاص آئینی طریقہ تھا۔[1]

---

[1] عرب کے دور جاہلیت میں نکاح کے اس عام طریقہ کے سوا جو اسلام میں پایا جاتا ہو عورتوں سے استفادے کے متعدد
(بقیہ حاشیہ اگلے صفحہ پر)

کچھ بھی ہو، میں کہنا یہ چاہتا ہوں کہ ایک ایسی عورت جو آزاد نہیں، بلکہ باندی تھی، اس کی رگوں میں عربی خون بھی نہ تھا، عقد میں بھی کسی آزاد آدمی کے نہ تھی بلکہ عبید اس کا شوہر بھی غلام تھا وہ بھی عربی نہیں رومی (شاید یوروپین) تھا۔ شمار اس عورت کا ایام جاہلیت کی بغایا (خرچی کمانے والی بازاری عورتوں) میں تھا، اور بغایا میں بھی یہ غریب ایسی بنی تھی کہ اسی وقت پوچھنے والے اس کو پوچھتے تھے جب اپنی ہوسناکیوں کی تسکین کے لیے طائف میں اس کے سوا کوئی دوسری بازاری عورت کے ملنے کی امید باقی نہ رہتی تھی، اس کی عسرت و فلاکت کا اندازہ اس سے ہوتا ہو کہ اپنی "گندہ بغلی" کے ازالہ کا بھی وہ بے چاری نظم نہیں کر سکتی تھی۔ گویا سمجھنا چاہیے کہ پستی کا آخری درجہ کسی عورت کے متعلق جو تصور کیا جا سکتا ہو، اسی حال میں یہ بے چاری جاہلیت کے زمانہ میں گرفتار تھی۔ کہ اچانک عرب میں اسلام کا آفتاب طلوع ہوا، زندگی کا نیا دور شروع ہوا، پچھڑی اور گری ہوئی انسانیت اٹھنے لگی، اور کیا اٹھان؟ کہ اس کس مپرس عورت کے گودڑوں میں لپٹا ہوا لڑکا،

(حاشیہ صفحہ گزشتہ) انوکھے طریقے مروج تھے جنہیں سن کر آج حیرت ہوتی ہو، مثلاً استبضاع یعنی شوہر کی رضامندی بلکہ حکم سے کسی پہلوان یا بہادر آدمی کا تخم عورت حاصل کرتی تھی، یا متعہ یعنی وقتی طور پر معاوضہ طے کر کے مرد عورت سے متعہ کا لا کیا کرتا تھا، جاہلیت کے زمانہ میں ان سارے طریقوں کی حیثیت آئینی طریقوں کی تھی۔ اسلامی آئین میں بھلا ان بدتمیزیوں کی کیا گنجائش تھی۔ خیبر کی جنگ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو خبر ہوئی کہ گدھوں کو ذبح کر کے ہانڈیوں میں ان کے گوشت کو لوگ پکا رہے ہیں، اور متعہ کا طریقہ بھی بعضوں نے اختیار کیا ہو، اسی وقت ہانڈیوں کے الٹ دینے اور متعہ کی حرمت کا اعلان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے کر دیا گیا، کچھ دن بعد مکہ فتح ہوا، فتح مکہ میں بکثرت لوگ تازہ مسلمان ہوئے، طائف پر فتح مکہ کے بعد چڑھائی کی گئی، اس میں ان تازہ دم نو مسلموں کی بھی کافی تعداد تھی، متعہ کی حرمت سے ان میں جو ناواقف تھے اور اس فعل کے مرتکب ہوئے تھے ان کے لیے دوبارہ متعہ کی حرمت کا اعلان کیا گیا۔ واقعہ کی نوعیت سے تو کل یہی ہو، لیکن تعبیری بے احتیاطیوں کی وجہ سے کچھ ایسا مشہور ہو گیا ہو کہ اسلام میں متعہ دو دفعہ حلال ہوا اور دو دفعہ حرام ہوا جس کی کوئی نظیر اسلامی قانون میں نہیں ہو حالانکہ واقعے کی رو سے گدھے کا گوشت جیسے اسلام میں کبھی حلال نہیں ہوا بلکہ جاہلی دستور کے مطابق خیبر میں بعض لوگ اس کو کھانا چاہتے تھے، ان کیلئے حرمت کا اعلان کیا گیا، یہی صورت متعہ کی بھی ہو، یعنی اسلام میں کبھی حلال نہیں ہوا، البتہ اس کی حرمت کا دو دفعہ اعلان کیا گیا۔ ۱۲

بھی اونچا ہوا، اونچے ہونے کے مواقع اس کے سامنے پیش ہوئے، پیش ہوتے ہی چلے گئے، اس نے پڑھا، لکھا، سترہ اٹھارہ سال کی عمر میں وہ ایسی تقریریں کرنے لگا کہ الخطیب المصقع (ایسا مقرر جو کبھی نہ تھکتا ہو)، کی سند فاروقی دربار سے اس کو حاصل ہوئی[۵۱] ایران کی جنگی مہموں میں اموالِ غنیمت اور فتوحات کے متعلق حساب کتاب کا کام بھی وہی کرتا تھا، اور فوج میں بخشی (فیناس) کی خدمت اسی کے سپرد تھی، اس کے تقریری اور انشائی کمالات کا شہرہ بڑھتے ہوئے یہاں تک پہونچا کہ یکے بعد دیگرے مختلف گورنروں یا ولاۃ اسلام کے سکریٹری (کاتب)، ہونے کی عزت اس کو حاصل ہوئی، لکھا ہو کہ

کتب لابی موسیٰ الاشعری ثم لعبد اللہ بن عامر ثم للمغیرۃ بن شعبہ ثم لعبد اللہ بن عباس۔ (ابن عساکر ص۲۰۶ ج۵)

ابو موسیٰ اشعری عبد اللہ بن عامر مغیرہ بن شعبہ عبد اللہ بن عباس کے سکریٹری ہونے کا کام انجام دیتا رہا[۵۲]

اور خلافت مرتضوی کے دور میں تو ایران کا گورنر ہی بن گیا۔ یہ اسی سمیہ کنیز کا لڑکا زیاد تھا جس نے امیر معاویہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے زمانہ میں یہاں تک عروج حاصل کیا کہ

ان معاویۃ استعمل زیاداً علی البصرۃ وخراسان، وسجستان، ثم جمع لہ الھند والبحرین، وعمان (طبری وغیرہ ص۱۲۳ ج۵)

حضرت معاویہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے زیاد کو بصرہ و خراسان اور سجستان کا عامل مقرر کیا، اسکے بعد ہند یعنی سندھ، اور بحرین و عمان کی حکومت بھی اسی زیاد کے حوالے کردی گئی۔

اور مورخین اسلام نے ایرانیوں کی طرف جو اس قول کو اپنی کتابوں میں منسوب کیا ہو۔ یعنی

---

۵۱ ص۲۰۶ ج۵ ابن عساکر۔

۵۲ جن میں عبد اللہ بن عامر کے سوا سب کے سب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے مشہور صحابیوں میں ہیں، عبد اللہ بن عامر کی ولادت تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد میں ہو چکی تھی لیکن عام خیال یہی ہو کہ صحبت نبویؐ سے استفادہ کا شرف ان کو حاصل نہ ہوا۔ ان ہی عبد اللہ بن عامر کے زمانہ میں جب ایرانی خراسان کے گورنر تھے یزدگرد کجکلاہ ایران خود ایک غیر مسلم کے ہاتھ سے قتل ہوا۔

كان اهل فارس يقولون ما رأينا سيرة اشبه بسيرة كسرىٰ انوشروان من سيرة هذا العربي (طبری ج ۵)

ایران والے کہا کرتے تھے کہ یہ عربی یعنی زیاد کسریٰ نوشیرواں کے ساتھ اپنے چال چلن، رنگ ڈھنگ میں جتنا مشابہ ہو ہم نے ایسا آدمی نہیں دیکھا۔

تو اس کا مطلب یہی ہوا کہ جاہلیت کے زمانہ کی ایک لونڈی کے بچے تک کو کج کلاہ ایران بن جانے کا موقعہ اسلامی دور میں مل گیا، اسلام کا ظہور نہ ہوتا تو کون جانتا ہو کہ ایک باندی اور غلام جو بے چارے عربی النسل بھی نہ تھے ان کے اس بچے کا انجام کیا ہوتا؟ مگر عرب کے جاہل چیخ رہے تھے، چلا رہے تھے، بظاہر اسلام قبول کر لینے کے بعد بھی لکھا ہو کہ فتح مکہ کے موقعہ پر جب کعبہ کی چھت پر بلال حبشی کو رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے اذان دینے کا حکم ہوا تو قریش کے بعض بوڑھے سرداروں کو دیکھا گیا تھا، کہتے تھے

"اچھا ہوا ان رسوائیوں کو دیکھنے کے لیے والد مرحوم زندہ نہ رہے"

حضرت بلال رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی آواز سن کر بے ساختہ ایک قریشی سردار کی زبان سے یہ فقرہ نکلا۔

ما وجد محمد غير هذا الغراب الاسود

محمدؐ کو اس کالے کوّے کے سوا اذان دینے کے لیے اور کوئی نہ ملا۔

کوئی بڑبڑا رہا تھا

والله الحديث العظيم ان يصيح عبد بني جمح ينهق على بنيته. (سیرۃ محمدیہ فتح مکہ)

خدا کی قسم یہ بہت بڑا حادثہ ہو، کہ بنی جمح والوں کا غلام (بلال) کعبہ کی چھت پر چڑھا گدھے کی طرح چیخ رہا ہو۔

مگر ان باتوں کا تو عادی بنانے کے لیے اسلام ظاہر ہوا تھا، قریشی خاتون ام المومنین زینب بنت جحش رضی اللہ تعالیٰ عنہا کا پہلا عقد اپنے مولیٰ (یعنی آزاد کردہ غلام) حضرت زید سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جس وقت کیا تھا، کوئی شبہ نہیں کہ ہزارہا ہزار برس کے رسم و رواج کے مقابلہ میں یہ بے محابا

ایسی ضرب لگائی گئی تھی جس سے مکہ ہی کیا، سارا عرب ہی تلملا اٹھا، زمین کے ساتھ یہ واقعہ ہو کہ آسمان بھی ہل گیا تھا، خود ام المومنین سیدہ زینب رضی اللہ تعالےٰ عنہا بھی زید سے اس رشتہ کو نباہ نہ سکیں، اور اسی کی تلافی بھی غالباً ایک مصلحت اس نکاح کی تھی جو خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت زینب سے کرلیا، لیکن وہی قریش جو پہلی دفعہ اس ضرب کو برداشت نہ کرسکے تھے۔ دیکھا گیا کہ بعد کو یکے بعد دیگرے اپنی لڑکیوں کا عقد حضرت زید ہی سے بخوشی و رضا کر رہے ہیں[۵۱]۔ اور ابن ابی شیبہ وغیرہ کی اگر یہ روایت صحیح ہو یعنی حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کی طرف یہ قول جو منسوب کیا گیا ہو کہ

لو بقی لا ستخلفہ — اگر زید زندہ رہ جاتے تو اپنے بعد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم زید ہی کو اپنا خلیفہ بناتے۔ (اصابہ ص۵۶۳ ج۲)

اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی ہی میں حضرت زید رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی شہادت کا سانحہ نہ پیش آجاتا تو یقیناً اسلام میں غلامی اور غلاموں کی تاریخ اس سے بھی شاندار، بہت زیادہ شاندار ہوتی، جتنی کہ اب ہو، آخر اس سے زیادہ اور کیا چاہا جاتا ہو، کہ زیاد جیسے آدمی کو ایران کے کسریٰ و نوشیرواں بن جانے تک کا موقعہ اسلام میں مل گیا، ان ہی عربوں نے یہ عہدہ اسکے سپرد کیا، جو چند دن پیشتر غلاموں کی موذنی بھی برداشت نہیں کرسکتے تھے، وطنی اور نسلی عصبیت کے نشہ میں جو چور تھے[۵۲]، ان میں یکایک انقلاب

---

[۵۱] حافظ ابن حجر نے اصابہ میں لکھا ہو کہ حضرت زید کا پہلا نکاح تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ام ایمن سے کردیا تھا، جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی موروثی باندی تھیں اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو ام ایمن ہی نے کھلایا تھا، اسامہ بن زید ان ہی کے بطن سے پیدا ہوئے، ام ایمن کے بعد حضرت زید کا نکاح سیدہ زینب بنت جحش سے ہوا تھا، جو نبھ نہ سکا، لیکن ان کے بعد ابو لہب کی صاحبزادی درہ اور عقبی کی لڑکی ام کلثوم، زبیر بن العوام کی ہمشیرہ ہندہ سے زید نے عقد کیا، یہ سب کی سب قریش کے اعلیٰ خاندانوں کی خاتونیں تھیں، ۱۲۔ [۵۲] عرب جاہلیت کی قومی و نسلی عصبیت پیش اسلام کا اندازہ ان تاریخی لطیفوں سے ہوتا ہو، مثلاً مسیلمہ کذاب جو قبیلہ ربیعہ سے تعلق رکھتا تھا، اسی کو خطاب کرکے قبیلہ ربیعہ کے ایک شخص جس کا نام طلحہ النمری تھا، یہ کہا تھا کہ میں جانتا ہوں کہ تو جھوٹا ہو اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم سچے ہیں، لیکن کیا کروں ربیعہ کا جھوٹا مضر کے سچے سے مجھے زیادہ محبوب ہو (طبری ص۲۴۶ ج۱، ۱۲) (باقی دیکھے صفحہ)

تھا کہ جس شخص کی رگوں میں نہ ماں ہی کی طرف سے عرب کا خون پہونچا تھا، اور باپ بھی جس کا سمجھا جاتا تھا کہ عربی نہیں بلکہ رومی غلام عبید نامی ہو۔ وہی قریشی النسل سرداروں، اور عرب کے عام قبائل کا امیر بن جاتا ہو۔

مگر یہ عجیب بات ہو، اور حافظہ کی کمزوری کا یہ کتنا دلچسپ مظاہرہ تھا کہ جوں جوں اسلام کی بدولت بلندی کے زینوں کو سمیہ باندی کا یہ لڑکا طے کرتا جاتا تھا اسی نسبت سے وہ اپنی پستیوں کے پچھلے حالات کو بھولتا یا بھلاتا جاتا تھا، دیکھنے والوں نے اسی زیادؓ کو اس حال میں بھی دیکھا تھا کہ خچر پر سوار ہو، لگام میں بجائے چمڑے کے رسی بندھی ہوئی ہو، بدن پر اس کے پیوند دوز کرتہ ہو، (طبری ص۱۶۲ ج۵) لیکن وہی زیاد لوگوں کے سامنے دیبا یا حریر کی قبا میں خز یا پلین کی چادر اوڑھے ہوئے اس حال میں جب برآمد ہوتا تھا، کہ آگے آگے تیغ برہنہ نقیب کڑکتے ہوئے لوگوں کو راستوں سے ہٹاتے ہوئے چلتے تھے[۱]۔ تو اس زمانہ میں اس کی حسی نزاکت کی کیفیت یہ ہو گئی تھی کہ سمیہ اس کی ماں کی طرف منسوب کرکے نام لینے والوں پر بپھر جاتا، انتہا یہ ہو کہ سیدنا امام حسن علیہ السلام نے اپنے ایک سفارشی خط میں زیاد بن سمیہ کے نام سے اس کو جب مخاطب فرمایا تو غصہ میں جواب دیتے ہوئے، بجائے حسنؓ بن علیؓ کے حسنؓ بن فاطمہؓ کے نام سے حضرت والا کو اس نے موسوم کیا[۲]۔ اس خط میں اس نے اور بھی ایسی ناقابل بیان گستاخیوں سے کام لیا تھا کہ حضرت امیر معاویہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو اس کی اطلاع

(بقیہ حاشیہ صفحہ گزشتہ) ابن عساکر نے ایک لطیفہ نقل کیا ہو کہ کعبہ کا طواف ایک بدوی عرب کر رہا تھا، اپنے لیے اور اپنے باپ کے لیے دعا کرتا تھا، ماں کا نام نہیں لیتا تھا، کسی نے توجہ دلائی کہ ماں کے لیے دعا کر جواب میں جھنجلا کر بدو نے کہا کہ میری ماں کا تعلق بنو تمیم سے ہے، اور بنی تیم کے لیے میرے دل سے دعا نکل ہی نہیں سکتی۔ (ص۳۵۹ ج۵)

[۱] طبری ص۱۶۲ وغیرہ میں آپ کو یہ واقعات مل جائیں گے۔

[۲] ابن عساکر ص۴۱۹ ج۵

امام حسن علیہ السلام کے ذریعہ جب ملی تو کھلا ہو کر

ضاقت علیه الشام — شام کی سرزمین امیر معاویہ پر تنگ ہو گئی۔

اسی وقت غیظ و غضب سے بھرے ہوئے فرمان سے زیاد کو آپ نے ڈانٹ بتائی اور لکھا تھا کہ فاطمہ کیطرف انتساب سے حسن کی عزت میں اضافہ ہوتا ہو یا کمی اس کا بھی اندازہ غصہ میں تجھے نہ ہوا۔ اور بیچاری سمیہ جس کے پیٹ سے پیدا ہونے کے انکار کی کوئی گنجائش نہ تھی، جب اس بے چاری تک کو وہ بھول بیٹھا تھا، اور بھولنا کیا معنے اس کی طرف انتساب زیاد کے لیے جب ناقابل برداشت بن چکا تھا تو اس مشہور واقعہ کے بعد یعنی بعض لوگوں نے امیر معاویہ کی حکومت کے زمانہ میں یہ گواہی دی کہ طائف کے بھٹی خانے میں امیر معاویہ کے والد ابوسفیان نے ایام جاہلیت میں زیاد کی ماں سمیہ باندی کے ساتھ بقول ابن خلدون

اصابها بنوع من انكحة الجاهلية — جاہلیت کے نکاحوں میں سے نکاح کے کسی خاص طریقہ کو اختیار کرکے تمتع حاصل کیا تھا۔ (ص۳ ج۳)

اور اسی بنیاد پر وہی زیاد جو زیاد بن عبید رومی کے نام سے اب تک مشہور تھا، اچانک دیکھا گیا کہ اس باپ کو بھی بھلا بیٹھا اور اپنے نام کے ساتھ زیاد بن ابی سفیان لکھنے لگا۔[۱]

---

[۱] تاریخوں میں اس واقعہ کو خاص اہمیت دی گئی ہو یا یہی باندھا جاتا ہو کہ "زیادہ کا نسب ابوسفیان سے کس طرح ملا دیا گیا"، بظاہر ابن خلدون کے بیان سے یہ پتہ چلتا ہو کہ جن جاہلی نکاحوں کو اسلام نے غیر قانونی قرار دے دیا تھا اسلام کے بعد تو نسب کی تصحیح میں ان سے کام نہیں لیا جا سکتا، لیکن اسلام سے پہلے ایام جاہلیت میں جن لوگوں کے نسب کی تصحیح جاہلی نکاحوں کی بنیاد پر ہو چکی تھی، اسلام نے ان لوگوں کے نسب پر چونکہ اعتراض نہ کیا اسی بنیاد پر ضابطہ شہادت سے زیاد کے نسب کو ابوسفیان کی طرف منسوب کرکے تسلیم کر لیا گیا تو اسکو ان ہی لوگوں میں شمار کرنا چاہیے جنکے نسب کی تلاش و تصحیح کی خواہ مخواہ اسلام کے بعد ضرورت نہ سمجھی گئی، لیکن ابن خلدون کا خیال خواہ کچھ ہی ہو بڑے بڑے صحابہ نے اس فیصلہ کو نہ مانا، زیاد کے ماں جائی بھائی حضرت ابوبکرہ صحابی نے مرتے دم تک زیاد سے بات نہ کی بعض لوگ اسی لیے اسکو زیاد بن ابیہ کہتے تھے، یعنی زیاد اپنے باپ کا بیٹا، باپ جو کوئی ہو، اس موقع پر قدرتاً خیال آتا ہو کہ جاہلیت کے زمانہ میں ابوسفیان سے جو حرکت اسی طائف میں صادر ہوئی اسلام لانے کے بعد اسی طائف میں اپنی ایک آنکھ اللہ کی راہ میں بھینٹ چڑھا دی۔ ۱۲

دولت رہی کی ہستی میں جو اپنی ماں اور باپ تک کو فراموش کر چکا ہو، کیوں تعجب کیجیے اگر سیدنا علی کرم اللہ وجہہ کے سارے احسانات کو بھلا کر کوفہ اور بصرہ کی گورنری کے زمانہ میں زیاد وہ حرکت کر گزرا ہو جس کا ذکر مورخین نے کیا ہو۔ تفصیل تو اس واقعہ کی کتابوں میں پڑھئے، حاصل یہ ہو کر بصرہ، کوفہ یعنی عراق اور ایران، خراسان، سجستان، سندھ، بحرین و عمان کی حکومت پر قابض ہونے کے بعد بھی زیاد کا جی نہ بھرا، اور حضرت امیر معاویہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی خدمت میں اس نے ایک طرف تو یہ درخواست روانہ کی کہ

"اب تک خلافت کی طرف سے جو علاقے میرے سپرد کیے گئے ہیں، ان علاقوں پر تو اپنے بائیں ہاتھ سے میں قابض اور مسلط ہوں، لیکن میرا اپنا ہاتھ یہ دا ہاتھ اس وقت تک یوں ہی خالی پڑا ہوا ہو، اگر حجاز اور حجاز کے ساتھ یمامہ، نجد وغیرہ کے علاقے بھی مجھے سونپ دیے جائیں تو میرے داہنے ہاتھ کے لیے ایک کام نکل آئے گا۔"

ادھر تو بارگاہ خلافت میں زیاد نے یہ عرضداشت روانہ کی اور اپنے خیال میں تیر کو نشانہ پر بٹھانے کیلئے یہ تدبیر اختیار کی کہ کوفہ میں اجتماع عام کا اعلان کیا گیا، لکھا ہو کہ زیاد کے خوف سے لوگ اتنے جمع ہوئے کہ مسجد اور میدان دارالامارہ کا صحن سارے مقامات معمور ہو گئے۔

غرض زیاد کی جیسا کہ مورخین نے لکھا ہو یہ تھی کہ وہی حضرت علی کرم اللہ وجہہ جنھوں نے ایران کے والی بنانے کا شرف اس زیاد کو عطا فرمایا تھا ان کو اور ان کی ساری نوازشوں کو ان کے فضائل و کمالات کو نبوت کبریٰ سے گوناگوں تعلقات جو حضرت والا کے تھے سب ہی کو اپنے حافظہ سے نکال کر اس نے چاہا کہ

يعرضهم على البراءة من علي (ابن عساکر ص۴۲۱)	حضرت علی کرم اللہ وجہہ سے تبرا اور علاحدگی کے مسئلہ کو کوفہ کے باشندوں پر پیش کرے

مطلب یہی تھا کہ قلوب میں سیدنا علی کرم اللہ وجہہ کے ساتھ جو لگاؤ کوفہ والوں کا باقی تھا، اس رشتہ کو بھی ختم کرانے کا سامان اس نے اپنے نزدیک کرنا چاہا تھا، خیال یہی ہوگا کہ اس کی خبر جب دمشق امیر معاویہ کے پاس پہونچے گی تو حجاز اور عرب کے دوسرے علاقوں کی حکومت کی

درخواست بآسانی منظور ہو جائے گی۔

حالانکہ یہی زیاد تھا، ایران کی گورنری کے زمانہ میں بھی کہتے ہیں کہ امیر معاویہؓ کی طرف سے یہ سلسلہ جنبانی کی گئی تھی کہ وہ حضرت علیؓ کی رفاقت ترک کر کے ان کا ہم نوا بن جائے، لیکن اس وقت تک حضرت علی کرم اللہ وجہہ زندہ اور برسر اقتدار تھے، لکھا ہو کہ جواب میں زیاد نے کہا تھا۔

میں اور حضرت علی کی رفاقت چھوڑوں؟

بینی و بینہ ابن عم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم (ابن عساکر ص۴۰۹)	میرے اور معاویہ کے درمیان رسول اللہ کے چچا (ابو طالب) کے صاحبزادے حضرت علی ہیں۔

مگر اب اس کا حافظہ ان ساری باتوں سے خالی ہو چکا تھا، ایسا کیوں ہوا، ایران والے جسے سیاست و تدبر میں کسریٰ انوشیرواں کا نمونہ اور نظیر قرار دیتے تھے، اپنے اقبال و عروج کے دنوں میں عرب جب اپنے بڑے سیاسی مدبروں کا ذکر کرتے تو امیر معاویہ، عمرو بن عاص، مغیرہ بن شعبہ رضی اللہ عنہ کے ساتھ ساتھ زیاد کا نام بھی لیتے تھے، ہمارے مورخین نے اس کا بھی اعتراف کیا ہو کہ سیدنا حضرت علی کرم اللہ وجہہ کے اچانک شہید ہو جانے کی وجہ سے آپکے مقبوضہ علاقوں میں عموماً اور کوفہ و بصرہ کی چھاؤنیوں میں خصوصاً افراتفری کی جو کیفیت پیدا ہو گئی تھی، زیاد نے راستہ جو بھی اختیار کیا ہو، لیکن اس گڑبڑ اور شور و شر کے مٹانے میں جو کامیابی اسکو حاصل ہوئی اور دیکھنے والوں نے زیاد کی حکومت کے زمانہ میں جو کچھ دیکھا تھا شاید اس زمانہ کی بڑی سے بڑی دستوری اور آئینی حکومتوں میں بھی ان تماشوں کے لیے لوگ ترستے ہی رہیں گے۔ طبری میں ہو کہ زیاد نے بطش شدید والی دارو گیر سے یہ رنگ قائم کر دیا کہ

امن الناس بعضہم بعضاً	ہر شخص دوسرے سے اپنے آپ کو محفوظ پانے لگا۔

اور کیسا امن کیسی حفاظت، طبری ہی کے الفاظ ہیں۔

کان الشئی یسقط من الرجل والمراۃ فلا یعرض احد حتی یاتیہ صاحبہ	کسی مرد یا عورت کی کوئی چیز راستہ میں گر پڑتی اسکے اٹھانے کی بھی جرأت کوئی نہیں کر سکتا تھا،

فیاخذہ ۔۔۔ چیز پڑی رہتی تا آنکہ جسکی چیز ہوتی وہی اٹھاتا۔

یہ تاریخ کی شہادت ہو کہ

تبیت المرءة فلا تغلق علیها بابها ۔۔۔ عورتیں گھروں کے دروازوں کو بند کیے بغیر راتیں گزارنے لگیں۔

(طبری صفحہ [illegible] جلد ۵)

یہ اور اس کے سوا زیاد کی حکومت کی خصوصیتوں کو مورخین نے بڑے شاندار الفاظ میں بیان کیا ہو دنیا کے موجودہ لادینی عہد میں زیاد بھی اسی لیے شاید ان لوگوں میں شمار ہو سکتا ہو جنھیں چاہا جائے تو حکمرانی اور جہاں بانی میں نمونہ بنایا جا سکتا ہو، مگر لادینی ذہنیت رکھنے والوں کی نگاہوں میں زیاد کی جتنی قدر و قیمت ہو، میرے نزدیک تو صحیح نتیجہ تک پہونچنے کے لیے جس غلط راستے کو اس نے اختیار کیا تھا، یہ راستہ ہی ایسا ہو جس میں آدمی بھولنا نہ بھی چاہے، جب بھی ایسی ساری چیزیں اس سے بھلادی جاتی ہیں، جن کے متعلق سمجھ میں نہیں آتا کہ وہ حافظہ سے کیسے نکل سکتی ہیں۔

میرا مطلب یہ ہو کہ حکومت کی باگ خصوصاً جب کوفہ و بصرہ کی گورنری کا جائزہ زیاد نے لیا، تو سب سے پہلے جو چیز اس کے دماغ سے نکل پڑی، وہ اپنے خالق اور مالک کی یاد تھی، منبر پر چڑھ کر جس وقت وہ کڑکتا تھا کہ

"خواہ کچھ ہی ہو، لیکن مجرموں کے بدلہ میں غیر مجرموں کو میں پکڑوں گا،"

تو اس وقت ایک مومن عبد نے کہا بھی کہ

"زیاد! خدا کا قانون تو یہ ہو کہ ایک کا بوجھ دوسرے پر ڈالا نہ جائے گا یعنی لا تزر وازرۃ وزر اخری، لیکن تو تو خدا سے بھی بڑھ گیا، دھمکاتا ہو کہ جس نے جرم نہیں کیا ہو اس کو جرم کرنے والے کی جگہ پکڑے گا۔"

جواب میں زیاد نے کہا تھا،

"تم جو راہ مجھے بتا رہے ہو، اب یہ راہ تمھارے سامنے نہ آئے گی جب تک کہ خون کے دریا تم میں نہ بہا دیے جائیں۔" (طبری صفحہ ۱۲۵ جلد ۵)

اور جب تک زیاد زندہ رہا وہی کرتا رہا جو وہ کہتا تھا، معمولی شک وشبہ پر گردنوں کا اڑا دینا، گھروں کو گرا دینا، لوگوں کو پٹوانا، جیل میں ڈال دینا، ان باتوں کی اس کی نگاہوں میں کوئی اہمیت نہ تھی، کہنے والوں نے تو اسی لیے یہاں تک کہہ دیا کہ مسلمانوں کے سب سے بڑے سفاک ظالم۔

"حجاج کے مقتولوں کی تعداد ضرور زیادہ ہے، لیکن مسلمانوں کو بے تحاشا قتل کرنے کی جسارت میں زیاد حجاج سے بہت زیادہ آگے بڑھا ہوا تھا۔"

(ابن عساکر ص)

———— (باقی)

اپنے دوستوں کو ایک بہت ضروری اطلاع

کانپور، بمبئی وغیرہ مختلف مقامات سے ہمیں کئی بار یہ افسوسناک اطلاع ملی ہو کہ بعض دیندار صورت لوگوں نے وہاں کے ہمارے احباب اور متعارفین کے پاس پہونچ کر ہم لوگوں کے ساتھ اپنے بڑے خاص الخاص تعلق کا اظہار کیا، اور اس طرح اعتماد پیدا کر کے اپنے کاروبار کے لیے میدان ہموار کیا اور پھر اس میں دھوکہ بازی کی۔

ہمارے دوستوں کو اس حقیقت سے غافل نہ رہنا چاہیے کہ دھوکہ اور فریب کا ہر پیشہ کرنے والا ہر قسم کی صورت بنا سکتا ہو، اور ہر قسم کی باتیں کر سکتا ہو، آپ جب کسی کے ساتھ کوئی معاملہ کریں تو اپنی بصیرت کو استعمال کر کے، اور امکانی حد تک واقفیت حاصل کر کے کریں۔

جو لوگ یہ حرکت کرتے ہیں ہم انھیں بھی متنبہ کرتے ہیں کہ اگر وہ باز نہ آئے تو تحقیق کر کے مجبوراً اُن کے نام اور پتہ کا بھی اعلان کر دیا جائے گا۔

محمد منظور نعمانی ———— ابوالحسن علی ندوی

موجودہ معاشی کشمکش

اور اس کا اسلامی حل

(از جناب ڈاکٹر محمد آصف قدوائی ایم۔اے، پی۔ایچ۔ڈی)

بیسویں صدی کے بیسوں نام رکھے جا رہے ہیں۔ ڈبلو۔ ایچ۔ آڈین اسے الجھنوں کا دور کہتے ہیں۔ ایک اور امریکی مصنّف اسے ایسپرین (مخدّرات) کا زمانہ بتاتے ہیں جس میں تمام تر توجہ وقتی سکون پر ہے۔ بعض حضرات اسے انسانیت کی شام کا شاعرانہ لقب دینے پر مصر ہیں۔ کہتے ہیں کہ انسانیت کا آفتاب لبِ بام آ چکا ہے بس رات کی سیاہی پھیلنے کی دیر ہے۔ ان کے برخلاف ہنری ولیس کی رائے ہے کہ وہ اسے جمہور یعنی ہمارا آپ کا زمانہ کہتے ہیں۔ نہ خود افسردہ دل ہیں نہ دوسروں کو افسردہ کرنا چاہتے ہیں۔

بہر حال اس پر سب کو اتفاق ہے کہ بیسویں صدی تاریخ کی ایک اہم ترین صدی ہے ابھی اس کا نصفِ اوّل ہی ہمارے سامنے آیا ہے اور ان پچاس برسوں میں دنیا کو جتنے امتحانات اور انقلابات سے گذرنا پڑا ہے وہ غالباً اس کی چوگنی مدت میں بھی اسے کبھی پیش نہیں آئے۔ سارا عالم ایک ہیجان، ایک تشنج میں مبتلا ہے۔ سیاست، معاشرت، معیشت، فلسفہ اور تمدن نے ابتک جو بت کھڑے کئے تھے، وہ تیزی سے منہدم ہوتے چلے جا رہے ہیں۔ ان کی جگہیں نئے بت لے رہے ہیں اور لطف یہ کہ یہ نہیں معلوم کہ ان اصنام نو کا کل کیا حشر ہوگا۔

آخر ایسا کیوں ہے؟ اس کا جواب اُسی ہنری ویلیس کی بات میں ملے گا کہ آزادی جمہور کے دور کا آغاز ہو چکا ہے، ہم اور آپ بیدار ہو چکے ہیں ہم کو اپنی فکر و عمل کی قوتوں اور اپنی اہمیت کا شعور ہو چلا ہے اور ہم اپنے گرد و پیش سے سخت غیر مطمئن ہیں۔ اگر یہ دنیا ہم کو پسند نہیں تو ہم اسے کیوں برداشت کریں جب اس کو بدل ڈالنے پر ہم کو قدرت حاصل ہے۔

گفتند جہانِ ما آیا بہ تو می سازد۔ گفتم کہ نمی سازد گفتند کہ برہم زن

ریاست ہائے متحدہ امریکہ کی جنگِ آزادی اور انقلابِ فرانس کے بعد جب جمہور کی آزادی کے تخیل نے جڑ پکڑنا شروع کیا تو آزادی کا مفہوم محض سیاسی آزادی ہی سمجھا جاتا تھا لیکن رفتہ رفتہ یہ احساس پیدا ہونا شروع ہوا کہ صرف اغیار کے غلبہ اور اقتدار سے رہائی حاصل کر لینا اطمینان بخش اور پر مسرت زندگی کا ضامن نہیں ہو سکتا۔ سیاسی آزادی نہ پیٹ بھر سکتی ہے نہ تن ڈھک سکتی ہے اور پیٹ بھرنے اور تن ڈھکنے کی فکر انسان کو اکثر اس جگہ پہونچا دیتی ہے جہاں شرافت، انسانیت، خودداری (خواہ ذاتی ہو یا قومی) سبھی پر تولنے لگتے ہیں (اسی لئے اسلام فاقہ کشی کی اضطراری حالت میں حرام تک کے استعمال کی اجازت دیتا ہے) مختصر یہ کہ بیسویں صدی کا آغاز ہوتے ہوتے یہ احساس عام ہو چلا تھا کہ بغیر معاشی اطمینان کے سیاسی آزادی ایک بے معنی اور کھوکھلی چیز ہے۔ یہ اور بات ہے کہ بغیر سیاسی آزادی کے معاشی فلاح کی کوششوں کا کارگر ہونا محال ہے۔ گذشتہ عالمگیر جنگوں کی پیدا کردہ اقتصادی ابتری اور روس اور چین کے اشتراکی انقلابات نے اس نظریہ کو اور تقویت بخشی اور اب عوام معاشی نظام کی از سر نو تعمیر کے لئے اسی طرح بیتاب ہیں جیسے کہ وہ کچھ قبل سیاسی نظام کو بدل ڈالنے کے درپے تھے۔ مزاجِ عالم کی برہمی کی یہی وجہ ہے۔

دنیا کے سامنے اس وقت دو معاشی نظریے ہیں۔ (۱) سرمایہ داریت۔ (۲) اشتراکیت جو ہر ملک اور ہر شہر میں دست و گریباں ہیں خواہ کھلم کھلا خواہ چوری چھپے اور اگرچہ اشتراکی اطراف سے وقتاً فوقتاً اس امر کا اعلان کیا جاتا رہتا ہے کہ ان دونوں کا خونریز تصادم ضروری نہیں

اور بغیر ایک دوسرے کو ہڑپ کئے یہ دونوں علیحدہ علیحدہ پھل پھول سکتے ہیں لیکن جاننے والے خوب جانتے ہیں کہ اگر جلد کوئی درمیانی راہ نہ نکل سکی تو دنیا کو اس رقابت کی اتنی مہنگی قیمت ادا کرنی پڑے گی کہ وہ اسے دیوالیہ کر کے ہی چھوڑے گی۔

سرمایہ داریت کے بنیادی اصول ہیں۔ (۱) ذاتی معاشی جد وجہد (۲) مقابلہ بازی۔ (۳) پیشہ اور روزگار کی آزادی۔ ان کی بنا پر سرمایہ داریت پر، جو اعتراضات کئے جاتے ہیں وہ حسبِ ذیل ہیں:۔

(۱) ذاتی معاشی جد وجہد کے نتیجہ میں ملک کی دولت اور وسائل سمٹ کر ایک محدود حلقہ میں چلے جاتے ہیں اور آبادی کا بہت بڑا حصہ ان سے محروم ہو جاتا ہے، دولت کی کمی اور زیادتی کی بنا پر معاشرہ مختلف طبقوں میں تقسیم ہو جاتا ہے جس سے طبقاتی کشمکش پیدا ہوتی ہے اور وہ صرف ملک کے نظم ونسق ہی کو نہیں بلکہ عالمگیر امن کو بھی خطرہ میں ڈال دیتی ہے۔

(۲) مقابلہ بازی کے سبب مال ضرورت سے بہت زیادہ تیار ہونے لگتا ہے۔ ایک چیز کے بیسوں نمونے بنائے جاتے ہیں بے تحاشا اشتہار بازی اور قومی وسائل کی بربادی ہوتی ہے۔ پھر تباہی سے بچنے کے لئے جو اس اندھا دھند مقابلہ بازی کا لازمی نتیجہ ہے کارخانہ دار بڑے بڑے کاروباری گروہ بناتے ہیں تاکہ قیمتیں برقرار رہیں اس سے عام پبلک کو بڑی دشواری ہوتی ہے کارخانہ دار اسی پر اکتفا نہیں کرتے، اپنے فاضل مال کی کھپت کے لئے وہ غیر ترقی یافتہ ممالک پر اقتدار حاصل کرنے کی کوشش کرتے ہیں جس سے سامراجیت کی لعنت پیدا ہوتی ہے۔

(۳) پیشہ اور روزگار کی آزادی اقتصادی اور سماجی افراط وتفریط کا باعث ہوتی ہے۔ اس کی بدولت اجارے دار طبقہ فیل بے زنجیر کی طرح ملک کے معاشیاتی نظام میں تباہی پھیلاتا پھرتا ہے۔ کارخانہ دار وہی مال تیار کرتے ہیں جس سے ان کو زیادہ سے زیادہ منافع کی توقع ہوتی ہے اور مفادِ عامہ یا قومی اقتصادیات کی مطلق پرواہ نہیں کرتے ہیں۔ اس کی ایک مثال ہمارے ملک کی بناسپتی کی صنعت ہے جس نے خالص گھی کو عنقا کر دیا ہے جس سے صرف صحت عامہ

ری کو نہیں نقصان پہنچ رہا ہے بلکہ دیہاتی گھریلو صنعتوں کو بھی دیمک لگ رہا ہے۔ مزید براں کاروباری آزادی سے بازار میں بعض اشیاء کی کثرت اور بعض کی قلت پیدا ہو جاتی ہے جس سے پیداوار اور کھپت کا باہمی تناسب ٹوٹ جاتا ہے۔ سرمایہ دار ممالک، جو جلد جلد اقتصادی الجھنوں میں گرفتار ہوتے رہتے ہیں اس کا یہی راز ہے

سرمایہ داری کے ان نقائص کا اشتراکیت حسب ذیل تدارک پیش کرتی ہے :-

(۱) پیداوار کے ذرائع اور مخازن کی شخصی ملکیت کا خاتمہ کر دیا جائے اور ان کو سلطنت (اسٹیٹ) کے سپرد کر دیا جائے تاکہ وہ ان کو کل آبادی کی فلاح و بہبود کے لئے استعمال میں لائے۔

(۲) جو دولت اس سرکاری ملکیت اور انتظام کے ماتحت پیدا ہو اس کو منصفانہ اور اگر ممکن ہو تو مساویانہ طریقہ پر تقسیم کیا جائے

(۳) اقتصادی منصوبہ بندی اور محاسبہ کے ذریعہ ملک کی ضرورت اور مال و دولت کی پیداوار میں خوشگوار توازن قائم کیا جائے۔

اشتراکیت کے معاشی دستور العمل کی بنیاد کی سب سے جامع اور سہل تشریح ۱۹۳۶ء کے روسی آئین میں موجود ہے یعنی: "ہر شخص سے اس کی صلاحیت کے مطابق، ہر شخص کو اس کے کام کے مطابق اور جو کام نہ کرے اسے کھانے کا حق نہیں"

افلاس زدہ اور ترسی ترسائی دنیا کے لئے ان اصولوں کی کشش کسی تشریح کی محتاج نہیں۔ مگر ریگستان میں پیاس کے مارے مسافروں کو سراب بھی تو حسین معلوم ہوتا ہے۔

اشتراکیت پر اعتراضات کی نوعیت یوں ہے :

(۱) شخصی ملکیت کے تخیل کو ختم کرنے سے قوت عمل مضمحل ہو جاتی ہے ہر شخص کے اندر فطری طور پر ملکیت کا جذبہ کار فرما ہوتا ہے اور اس کی بیشتر جد و جہد اسی کے تحت میں ہوتی ہے۔ اشتراکی ماحول جس میں نہ کوئی چیز میری ہے نہ آپ کی بلکہ سب چیزیں سب کی ہیں اس جذبہ کو پوری طرح موافق نہیں آتا۔ خود اشتراکی ممالک اس حقیقت کے رفتہ رفتہ قائل ہوتے جا رہے ہیں اور نجی

کاروبار کو، وہ چھوٹے پیمانہ ہی پر بھی جاری کر رہے ہیں۔

اس کے علاوہ تخلیقی جوہر جو قدرت نے عین فیاضی کی بنا پر بشر کو عطا کیا ہے اشتراکی نظام میں پوری طرح ابھرنے نہیں پاتا۔

پھر اس کی بھی کوئی ضمانت نہیں کہ اگر لوگ اپنی معاشی آزادی حکومت کے حوالہ کر بھی دیں تو حکومت اس کام کو موثر، مفید اور منصفانہ طریقوں پر ہی چلائے گی۔ اکثر حکومتیں خویش پروری رشوت ستانی، تن آسانی اور دیگر عیوب سے محفوظ نہیں رہ پاتیں۔

(۲) ملک کی پیداوار کی منصفانہ تقسیم اکثر عمل میں بالارادہ یا بلاارادہ غیر منصفانہ ثابت ہوتی ہے۔ ذاتی یا سیاسی تعلقات یا مصالح کے خلل انداز ہو جانے کی گنجائش ہمیشہ رہتی ہے اس کے علاوہ جس طرح تمام انسانوں کے ناپنے اور تولنے کے لئے ایک ہی پیمانہ استعمال نہیں کیا جا سکتا اسی طرح ان کی ضروریات کا تعین بھی کسی اصول واحد کی بنا پر نہیں ہو سکتا ہر شخص کی فطرت جداگانہ ہے "ہر شخص سے اس کی صلاحیت کے مطابق اور ہر شخص کو اس کے کام کے مطابق" بظاہر تو بہت معصوم طریق کار ہے لیکن جب "صلاحیت" اور "کام" کے تعین کا وقت آتا ہے تو جبر و تشدد سے دامن بچانا مشکل ہو جاتا ہے۔

(۳) اقتصادی اور معاشی منصوبہ بندی اور احتساب دور حاضرہ کے پیچیدہ مسائل اور معاشرہ کے بڑھتے ہوئے مطالبات کو خوش اسلوبی کے ساتھ حل کرنے کے لئے ضروری ہیں۔ اس میں کوئی کلام نہیں مگر چونکہ اشتراکیت کی بنیاد ہی جبر پر ہے اس لئے اشتراکی ممالک میں ان تدابیر پر بغیر ظلم و استبداد کے عمل کرنا ممکن نہیں ہو سکا ہے۔ مثلاً جب روس کے پست علاقوں (آذربائیجان وغیرہ) میں میکانیکی زراعت کو فروغ دیا گیا تو ہزارہا بندگان خدا کو موت کے گھاٹ اتر جانا پڑا۔

اس طرح یہ واضح ہو جاتا ہے کہ سرمایہ داریت اور اشتراکیت دونوں ہماری موجودہ معاشی کشمکش کو سلجھانے سے بڑی حد تک قاصر ہیں۔ سرمایہ داری اس وجہ سے کہ وہ خود بیمار ہے اور اشتراکیت یوں کہ جو علاج وہ پیش کرتی ہے وہ بیماری سے زیادہ سخت ہے۔ ضرورت

ایک ایسے معاشی طریقے کی ہے جو ان متضاد فلسفوں کے شدائد سے پاک ہو اور درمیانی اور ہموار راہ اختیار کرتا ہو اور جو عوام کو ایک معقول معیار زندگی کی بھی پیش کش کرتا ہو اور ان سے اس کے معاوضہ میں اخلاقی ذہنی اور روحانی حقوق کی قربانی کا بھی طالب نہ ہو خوش قسمتی سے دنیا کے پاس ایک ایسا حل موجود ہے جس کا نام اسلام ہے۔

بظاہر اسلام کا معاشی نظام سرمایہ داری کے اصول ثلاثہ یعنی ذاتی معاشی جدوجہد مقابلہ بازی اور پیشہ اور کاروبار کی آزادی پر مبنی ہے مگر اس نے اس پر ایسی موثر بندشیں لگائی ہیں اور ایسے جامع قاعدے اور ضابطے مقرر کئے ہیں کہ یہ ان انسانیت سوز حدوں کی طرف رُخ نہیں کرنے پاتے جو مغربی سرمایہ داریوں کا طرۂ امتیاز ہیں۔

اسلامی معاشیات کا مرکزی تصور مفاد عامّہ ہے اور وہ ہر چیز کو اسی ترازو میں تولتا ہے۔ چنانچہ پیداوار کے معاملہ میں اسلام سرمایہ اور مزدوری دونوں کو برابر کا شریک ٹھہراتا ہے اور مزدوری کو بھی ایک قسم کا سرمایہ ہی بتاتا ہے۔ نہ کہ دولتمند کو اور زیادہ دولتمند بنانے کا آلہ جیسا کہ مغربی سرمایہ داریوں کا عام طریقہ ہے۔ اسلامی معاشیات میں سرمایہ داروں اور مزدوروں کے ملے جلے کاروبارانہ مساعی اور امداد باہمی پر بہت زور دیا گیا ہے (ملاحظہ ہو سلطنت عثمانیہ کا ضابطہ دیوانی دفعہ ۱۴۲۸)

اسلامی معاشیات کے چند امتیازی نکات درج ذیل ہیں۔

(۱) دولت کا مسلسل متوسط اور ادنیٰ حصوں میں تقسیم ہوتا رہنا تاکہ اکثریت سے اقلیت کی طرف اس کی پیہم مراجعت جو مغربی سرمایہ داریت کا لازمی نتیجہ ہے ممکن نہ ہو سکے۔ اس مقصد کو اسلام تین طریقوں سے حاصل کرتا ہے۔

(الف) ذخیرہ اندوزی اور ضرورت سے زیادہ دولت جمع کرنے کے خلاف حکم لگا کر "جو لوگ سونا چاندی اکٹھا کرتے ہیں اور اللہ کی راہ میں اسے صرف نہیں کرتے ان کو تم سخت عذاب کی خبر سنا دو"۔ (قرآن)

(ب) ایسا قانون وراثت جاری کر کے کہ مرنے والے کی ساری جائداد منقولہ وغیر منقولہ اس کے تمام ورثار میں تقسیم ہو جایا کرے اور انگلستان وغیرہ کے ایسا حال نہ ہو جہاں متوفی کی جائداد تنہا ایک وارث کو (جو عام طور پر فرزند اکبر ہوتا ہے) مل جاتی ہے جس سے باقی ورثار کا حق بھی مارا جاتا ہے اور جائداد کی سالمیت بھی قائم رہتی ہے جو اجارہ داری کی تولید اور افزائش کی معاون ثابت ہوتی ہے اسلام میں اس کی بھی اجازت نہیں کہ متوفی کی ساری جائداد کسی غیر حقدار یا ایک حقدار کے پاس پہونچ جائے جسے موصی نے کسی مخصوص جذبہ یا کج روذہنیت کے ماتحت نامزد کر دیا ہو۔ ان انتظامات کی حکمت کو قرآن یوں بیان کرتا ہے:-

"تاکہ کوئی چیز ایسی نہ ہو، جو تم میں سے مالدار لوگوں کے بیچ ہی چکر لگاتی رہے" (قرآن: الحشر)

اسلامی معاشیات کے مرکزی تصور کی یہ کتنی صاف وسادہ تشریح ہے اور کتنی مختلف ہے یہ موجودہ سرمایہ داری کی اس کوشش سے کہ دنیا کی ساری نعمتیں ایک مخصوص حلقہ کے لئے وقف ہو کر رہ جائیں۔

(ج) زکوٰۃ یعنی پسماندہ رقم اور سیم وزر پر ٹیکس۔ یہ اسلام ہی کی خصوصیت ہے کہ وہ اندوختہ دولت پر ٹیکس لگاتا ہے۔ اور جو اہمیت وہ اسے دیتا ہے وہ اس سے ظاہر ہے کہ قرآن شریف میں اس کا ذکر عام طور سے نماز کے ساتھ آیا ہے اور اس کو فرض عبادت اور اسلام کا رکن قرار دیا گیا ہے۔

(۲) سود، سٹہ بازی، دلالی، جوا، اور قسمت آزمائی اور قیاس آرائی کے ذریعہ دولت پیدا کرنے کے دوسرے طریقوں کی ممانعت تاکہ صرف محنت ومشقت سے ہی دولت پیدا کی جاسکے۔

(۳) ملکوں کے درمیان آزادانہ تجارت۔ درآمد وبرآمد پر نرخ وغیرہ کی پابندیاں اور مختلف ممالک کے درمیان تفریق جن کے بغیر موجودہ تجارت کا کام معلوم ہوتا ہے کہ چل ہی نہیں سکتا اسلام نے اس کو ممنوع قرار دیا ہے کیونکہ وہ تمام نوع انسانی کو ایک ہی خدا کی مخلوق بتاتا ہے اور اس کو بلا امتیاز رنگ ونسل سب کی بہبود یکساں طور پر عزیز ہے:

"نسلی افتخار آج میرے پاؤں تلے روندا ہوا ہے۔ سب لوگ آدم کی اولاد ہیں اور آدم کی تخلیق

مٹی سے ہوئی تھی" (پیغمبر اسلام)

(۴) منصوبہ بندی اور سرکاری محاسب ۔ مغرب نے تو ابھی حال میں اس کی ضرورت کو محسوس کیا ہے مگر اسلامی معاشیات کا یہ ایک اہم جز ہمیشہ سے رہا ہے۔ چنانچہ سلطنت عثمانیہ ترکیہ میں اس کا معقول انتظام تھا۔ (سلطنت عثمانیہ ضابطہ دیوانی دفعہ ۵)

(۵) زرعی معاملات میں اسلام بحا طور پر کوئی جامد غیر متبدل دستور نہیں پیش کرتا۔ وقت کے مطالبات کے پیش نظر جن تدابیر میں عوام کی بہبودی کی زیادہ سے زیادہ گنجائش ہو وہ اختیار کی جا سکتی ہیں۔ چنانچہ فتح ایران کے بعد حضرت عمرؓ نے وہاں ایسی اصلاحات جاری کیں جو عرب کے مروجہ قاعدے سے بالکل مختلف تھیں اور ان کے بعد حضرت عثمانؓ نے اپنے عہد خلافت میں ان کو بدل کر نئے انتظامات کئے۔

زرعی پیداوار کے ایک حصہ کو اسلام بے بسوں اور محتاجوں کے لئے خیرات کر دینا ضروری ٹھہراتا ہے۔ اور اسلامی شریعت میں اس کا درجہ اور حکم وہی ہے، جو زکوٰۃ کا ہے۔

(۶) مفاد عامہ کی خاطر بعض اہم صنعتوں کو قومی اجارہ داری میں لے لینے سے اسلام میں کوئی چیز مانع نہیں۔

مشہور ماہر اقتصادیات مارشل لکھتے ہیں: "زیادہ دولت دولتمندی اور انتہائی افلاس کو پہلو بہ پہلو برداشت کرنے پر نہ تو کوئی مجبوری ہے اور نہ اس کا کوئی اخلاقی جواز ہی ہو سکتا ہے۔" یہ ہے سرمایہ داری کے نتائج پر ایک محقق کا فیصلہ۔

اب انفرادیت کشی کے بارہ میں جو اشتراکیت کا لازمی ثمرہ ہے۔ ایک اور محقق کی رائے ملاحظہ ہو "استبدادیت بھی اس وقت تک اپنے بدترین اثرات ظاہر نہیں کرتی جب تک اس کے تحت میں انفرادیت کا وجود باقی رہتا ہے اور جو چیز بھی انفرادیت کو فنا کرنے والی ہو وہ استبدادیت ہے خواہ کسی نام سے اُسے پکارا جائے۔" (جان اسٹورٹ مل)

اسلام چونکہ صراط مستقیم اور راہ وسط ہے اس لئے معاشیات میں بھی وہ میانہ روی اختیار کرتا ہے اور رسکن کے ان الفاظ کو عملی شکل اختیار کرنے کی سہولیت بہم پہونچاتا ہے۔

"دولت کی منصفانہ بنا یہ ہے کہ جو شخص محنت کرے اُسے اُس کی محنت کا معقول معاوضہ ملنا چاہئے اور اگر وہ اپنی کمائی کو آج خرچ کرنا پسند نہ کرے تو اسے اس کی آزادی ہونا چاہئے کہ اسے رکھ چھوڑے اور کل خرچ کرے"

اور رزق و معاش کی فراغت اور منصفانہ تقسیم ہی پر اسلام اکتفا نہیں کرتا۔ وہ آگے بڑھتا ہے اور نفس و شکم کے دھندوں میں مستقلاً الجھ کر رہ جانے کے خطرہ سے آگاہ کرتا ہے۔

"بعض لوگ ایسے ہیں جو کہتے ہیں کہ اے ہمارے رب تو ہم کو اس دنیا کی نعمتیں عطا فرما۔ ان کا آخرت میں کچھ حصہ نہ ہوگا"

"اور بعض لوگ ایسے ہیں جو کہتے ہیں کہ اے ہمارے رب تو ہم کو اس دنیا اور اُس دنیا دونوں کی نعمتیں عطا فرما اور ہم کو دوزخ کے عذاب سے محفوظ رکھ۔ اُن کو ان کی کمائی کا پورا حصہ ملے گا۔ خدا بڑا حساب رکھنے والا ہے" (قرآن حکیم)

انسانی فکر و عمل کو اس کے معدہ تک محدود کر دینا بڑا ہی ظلم ہے اور ہمارے معاشرے کی بدحالی اور اس کے اَن گنت امراض کا سبب اسی تنگ نظریہ کی پیدا کردہ غضب و شہوت کی مطلق العنانی ہے۔ انسان کو محض گوشت و پوست کا مجسمہ قرار دیدینا اُسے (شائستہ؟) جانوروں کی صف میں کھڑا کر دینا ہے۔ وہ ایک بے مثل قدرت کا بے مثال تخلیقی شاہکار ہے اشرف المخلوقات ہے مسجود ملائک ہے۔ خلیفۃ اللہ ہے۔ صرف کمانے کھانے اور نفسانی لذت کوشی ہی کے لئے اسکی تخلیق نہیں ہوئی ہے۔ اِس دنیا کے علاوہ اس کے اور بھی نشیمن ہیں۔ اس کی خودی کے سنورنے اور نکھرنے اور پروان چڑھنے کے لئے اور بھی میدان ہیں اور یہی اس کی امتیازی شان ہے۔

اسلام اُسے ذہن اور روح کے اسرار اور امکانات سے روشناس کراتا ہے اور اُس کی توجہ ان کی طرف موڑتا ہے تاکہ اس کا افضلیت کا جذبہ جو فطرت کا ایک لطیف عطیہ ہے دنیا ہی کے کاروبار میں گھر کر کثافت آلود نہ ہو جائے اور خود غرضی، بغض، نفرت اور عداوت کا محرک نہ بنجائے۔ نفسیات کے ماہرین جانتے ہیں کہ تفوق پسندی کم و بیش ہر شخص میں پائی جاتی ہے۔ تاریخ

کے زندہ جاوید کارناموں کا اگر تجزیہ کیا جائے تو وہ اسی بدنام انسانی جوہر کے شوق خودنمائی کا نتیجہ ثابت ہوں گے لیکن دنیا کی تباہیوں اور بدنصیبیوں کے پیچھے بھی اسی فطری تقاضہ کی کارفرمائی نظر آئے گی۔ اس متضاد اثراندازی کی وجہ یہ ہے کہ جب اس کے دائرہ عمل کو تنگ کرکے بقول اقبالؔ "اسی روز و شب" تک محدود کر دیا جاتا ہے اور سرفرازی اور بڑائی کا معیار صرف مادّی وسائل ہی ٹھہر جاتے ہیں تو انسانوں، قوموں اور گروہوں کے مفاد کا تصادم ہونے لگتا ہے، نفسی نفسی کا عالم پیدا ہو جاتا ہے اور انسانیت گھاٹے میں آجاتی ہے چنانچہ یہ ضروری ہے کہ انسان کی جدوجہد کا مرکزی مقام ایسی جگہ مقرر کیا جائے جو نہ تو اتنی بلند ہو کہ انسان کا جسم خاکی اس کے لئے زنجیر پا ثابت ہو اور نہ اتنی پست کہ بس خاک ہی خاک ہو۔

اس مقصد کے حصول کے لئے اسلام فقر کا نظریہ پیش کرتا ہے، جو بدقسمتی سے عام جہالت کے ہاتھوں اتنا مسخ ہو گیا ہے کہ اُسے کاہلی، پست حوصلگی اور گداگری کا پردہ دار سمجھا جانے لگا ہے جبکہ اصل میں وہ ان کا پردہ در ہے۔ فقر پر پیغمبر اسلام کو فخر تھا۔ یہی اس کے عین تونگری ہونے کی کافی دلیل ہے۔ اسلام کا تصوّرِ فقر کسب معاش کی کوششوں کی دل شکنی نہیں کرتا۔ صرف انھیں تربیت اور سلیقہ عطا کرتا ہے۔ تاکہ آدمی محض پیٹ کا سپاہی یا جنگ زرگری کا مجاہد ہو کر نہ رہ جائے۔ فقر آرام و آسائش کی زندگی کو معیوب نہیں ٹھہراتا، وہ صرف اس کو انسانی تگ و دو کا اول و آخر سمجھ بیٹھنے کی مخالفت کرتا ہے۔ "دست بہ کار و دل بہ یار" کے نازک رمز سے آگاہ کراتا ہے، استغنا کی دولت عطا کرتا ہے۔ فقر کے معنی یہ ہیں کہ انسان ایک طرف تو دنیا کی نعمتوں سے مستفید ہونے کا کوشاں ہو اور دوسری طرف رضائے حق کی خاطر ان سب کو ٹھوکر مار کر الگ کر دینے کی بھی جرأت رندانہ رکھتا ہو۔ واضح رہے کہ دنیا سے دست کشی صرف اُسی وقت اور اُسی حد تک مستحسن ہے جب اور جس حد تک اس سے اطاعت الٰہی کے راستہ میں رکاوٹیں پڑتی ہوں ورنہ ترکِ دنیا (جزواً یا کلاً) میں بذات خود کوئی خوبی نہیں بلکہ کفرانِ نعمت کا گناہ عظیم ہے۔ تنگدستی اسلامی نقطۂ نظر سے روحانی بالیدگی

پر دلالت نہیں کرتی جیسا کہ مسیحیت میں عام دستور ہے اور نہ جوگ اور سنیاس ہی کو اسلامی معاشرت میں کوئی مقام حاصل ہے کیونکہ اکثر ان کے پیچھے کاہلی، پست ہمتی، قنوطیت اور بے غیرتی ہی کے عناصر ہوتے ہیں۔

زاہد نہ داشت تابِ جمالِ پری رُخاں کنجے گرفت و ترسِ خدا را بہانہ ساخت

اشتراکی روس کے معمارِ اعظم لینن نے ایک جگہ لکھا ہے کہ:-

مفلسی کی صعوبتوں میں زندگی کاٹنے والوں کو مذہب صبر و رضا کی تلقین کرتا ہے۔ اور آئندہ زندگی میں اجر کبیر کی بشارت دے کر انھیں تسکین دیتا ہے اور جابر دولتمندوں کو مذہب دنیا میں بھلائی کرنے کا درس دیتا ہے کیونکہ اس طرح ان کو اپنے وجود کے استحقاق کا سستا ذریعہ اور جنت الفردوس میں داخلہ کا پاسپورٹ مل جاتا ہے۔ مذہب نوعِ انسانی کی افیون ہے، روح کی شراب ہے جس کا مقصد سرمایہ داریت کے غلاموں کی انسانیت اور اُن کی آرام دہ زندگی بسر کرنے کی خواہش کو سن کرنا ہے۔"

بدقسمتی سے لینن اسلام سے واقف نہ تھے اپنے گرد و پیش کے مذاہب دیکھ جو نتائج اخذ کئے وہ انہوں نے تمام مذہبوں پر چسپاں کر دئے۔ اسلام کوئی روایتی قسم کا مذہب نہیں۔ وہ ایک مکمل درس حیات ہے۔ اس کی روشنی زندگی کے تمام شعبوں پر پڑتی ہے، وہ انسانوں سے نہ تو فرشتوں کی بے نفسی اور معصومیت طلب کرتا ہے اور نہ ان کو جانوروں جیسی بے حس اور بے مقصد زندگی بسر کرنے کی ترغیب دیتا ہے۔ غیر مسلم دنیا نے تو ابھی حال میں ایڈم اسمتھ، ٹوڈ، ریکارڈو، کارل مارکس ولیم جیمس، فرائیڈ اور ینگ وغیرہ کے نظریات کے زیر اثر معاشرہ کی معاشی اور جنسی ضروریات سے آگاہی حاصل کی ہے، اسلام نے اب سے تیرہ سو برس پہلے ان حقائق کا سائنٹفک جائزہ لے کر ان کی تسکین کے مناسب طریقے مقرر کر دئے تھے۔ دراصل مغربی مصنفین نے اسلام پر اعتراضات کے جو انبار لگائے ہیں ان میں زیادہ تر اسی بارہ میں ہیں کہ ان کے مذاہب کی طرح اسلام بھی گوشت اور خون کے مطالبات کی بے دردانہ پامالی کو روحانی ترقی کے لئے لازمی نہیں ٹھہراتا اور یہی

نہیں بلکہ اس ذہنیت کو مذموم اور مکروہ قرار دیتا ہے اور نظام نفسانی سے مناسب طرح پر لطف اندوز ہونے کو مستحسن اور کار ثواب۔

دنیا کی کلفتوں اور مایوسیوں پر آخرت میں اجر ملنا برحق۔ مگر ان کا مردانہ وار مقابلہ تو عین جہاد ہے۔ اسلام کا تصوّرِ وحدت جسم اور روح کی الگ الگ حد بندی کا منافی ہے اور جس طرح کفر، شرک، جھوٹ اور دوسری روحانی ضلالتوں کے خلاف مورچہ بندی ایک مسلمان کی زندگی کا بہترین مصرف ہے اسی طرح ظلم، غریبی، جہالت اور بیماری کا انسداد بھی۔ اسلام میں یاسیت، مظلومیت پسندی اور خود اذیتی کی گنجائش نہیں۔ بات یہ ہے کہ ہر شخص کی قوتِ مدافعت یکساں نہیں ہوتی۔ پھر حالات پر مکمل اختیار نہ انسان کو کبھی حاصل ہوا ہے اور نہ ہونے کی کوئی سبیل ہی نظر آتی ہے۔ کتنے مصائب ایسے ہوتے ہیں جن کے آگے کوئی تدبیر نہیں چلتی۔ بلند اور پاکیزہ مقاصد کے لئے بھی کبھی کبھی بڑی تکلیفیں جھیلنا اور قربانیاں دینا پڑتی ہیں۔ آخرت کے اجر کا تعلق انہی صورتوں سے ہے ورنہ خود کو بلا سبب تکلیف میں ڈالنا یا ایسے ناخوشگوار حالات چپ چاپ برداشت کیے جانا جنھیں تبدیل کیا جا سکتا ہو کج ذہنی اور روحانی غیر صحت مندی کے سوا اور کچھ نہیں۔

اور حرام ذرائع (جن میں جبر، ظلم، ذخیرہ اندوزی، چور بازاری بھی شامل ہیں) سے حاصل کی ہوئی دولت کو مفادِ عامہ کے کاموں مثلاً عبادت گاہوں، مدرسوں اور یتیم خانوں کی تعمیر پر خرچ کر کے آخرت کی بہبودی خرید لینا اسلام میں قطعاً ناممکن ہے ناجائز آمدنی سے جو کام بھی کیا جاتا ہے مذموم اور ناپسندیدہ ہوتا ہے۔ بخشائش کے قواعد غریب اور امیر دونوں کے لئے یکساں ہیں اور دولت کی کمی یا زیادتی سے ان کا کوئی تعلق نہیں ہے۔ جائز طریقوں سے بھی حاصل کی ہوئی دولت سے زیادہ کو لگانے کی مذمت قرآن حکیم میں جن الفاظ میں کی گئی ہے ان کا تذکرہ سابق میں آچکا ہے مندرجہ بالا سطور سے واضح ہو گیا ہو گا کہ اسلام زندگی کی امنگوں کو تھپکیاں دے کر سلانے والا مذہب نہیں ہے۔ وہ تو انسان کو جھنجھوڑ کر جگاتا ہے۔ عزم و حوصلہ کی دولتِ بیدار عطا کرتا ہے اور

تازہ دم بناتا ہے۔ مگر یہ باتیں تو ایک دوسرے مضمون سے تعلق رکھتی ہیں۔

انتخاب

روس میں مذہب

روس کے بارے میں یہ بحث بہت دلچسپ ہو کہ وہاں کے عوام کو کس حد تک مذہبی آزادی حاصل ہو، اس بارے میں بیانات کے بیانات مختلف ہیں، جن میں اپنے اپنے خیالات کی جھلک نظر آتی ہو، مگر مسز اندرا گاندھی جو حال ہی میں روس کا سفر کر کے واپس آئی ہیں۔ ان کا بیان بہت حد تک قرین قیاس معلوم ہوتا ہو، انھوں نے ایک سوال کا جواب دیتے ہوئے کہا کہ روس میں مذہب پر کوئی پابندی نہیں ہو۔ آپ نے کہا کہ میں گرجاؤں میں تو نہیں گئی لیکن ایک مسجد میں جانے کا اتفاق ہوا۔ جہاں بوڑھے قسم کے لوگ نظر آئے، اور جب ان سے پوچھا گیا کہ مسجد میں جوان لوگ کیوں نہیں آتے تو انھوں نے کہا کہ جب سے روس میں مذہبی تعلیم کا سسٹم ختم ہوا ہو نوجوانوں نے مسجدوں میں جانا ترک کر دیا ہو! اس کا مطلب یہ ہو کہ گو روس میں ہر شخص کو مذہبی آزادی حاصل ہو، مگر مذہبی سرچشموں کو اس طرح بند کر دیا گیا ہو کہ آئندہ مذہبی لوگ پیدا نہ ہوں، اور مذہب کی روح خود بخود ختم ہو جائے! اگر روس میں واقعی مذہبی تعلیم کا کوئی انتظام نہیں تو نئی نسل کے لوگ جو لادینی ماحول میں پرورش پا رہے ہیں ان کا رشتہ مذہب سے خود بخود منقطع ہو جائے گا، یعنی نہ رہے بانس نہ بجے بانسری' پھر روس کو کیا غرض پڑی ہو کہ پرانے لوگوں کو عبادت گاہوں میں جانے سے روکے، جب یہ لوگ ختم ہو جائیں گے تو عبادت گاہیں بھی ویران ہو جائیں گی اور لوگوں کو معلوم ہی نہ ہو سکے گا کہ مذہب کیا چیز ہو' اور عبادت گاہوں کا مصرف کیا ہو! اب ہم نہیں کہہ سکتے کہ کہنے والوں نے مسز اندرا گاندھی کو صحیح صورت حال سے آگاہ کیا یا وہ بھی کسی غلط فہمی کا شکار ہوئے؟ ———— (الجمعیۃ دہلی)

سو فیصدی بد چلن

انڈیانا یونیورسٹی (امریکا) کے ماہر جنسیات ڈاکٹر وکنسی کا بیان شکاگو سے ۱۶ر اگست کو ایک پریس کانفرنس میں:-

"ہمارے ملک میں جنسی رویہ سے متعلق جو قانون مقرر ہیں ان کی خلاف ورزی ہماری آبادی میں ۹۵ فی صدی مرد اپنی عمر کے کسی نہ کسی حصہ میں اور ۸۵ فی صدی عورتیں کرتی رہتی ہیں۔ ہمارے قانون اصل زندگی سے اس قدر ہٹ گئے ہیں کہ ان کی خلاف ورزی ہر روز ایک بہت بڑی حد تک ہوتی رہتی ہو۔" (یو، پی، اے)

روس میں جو کچھ ہو چکا یا ہو رہا ہو اسے چھوڑیئے، اب یہ مستند بیان امریکا سے متعلق امریکا ہی کی زبان سے تو آرہا ہو! آبادی میں ۹۵ فیصدی مرد اور ۸۵ فی صدی عورتیں بدچلن، اپنے ہی معیار کے مطابق! اور خود وہ معیار بھی معلوم ہو کر کتنا ڈھیلا اور کتنی گنجائشی ہو! گویا اسلامی معیار سے ۵ ۵ فی صدی اور ۱۵ فی صدی کا استثناء بھی غائب! ____ اسکولوں اور کالجوں اور یونیورسٹیوں کی تعلیم اگر عصمت و عفت کے تحفظ میں کچھ بھی معین ہو سکتی تو آج اتنے "تعلیم یافتہ" ملک میں بدچلنی اور شہوت پرستی کی یہ نوبت ہوتی؟

لیکن بدکار مردوں اور عورتوں کے اعداد کے درمیان یہ ۹۵ اور ۸۵ کا تناسب عورت اتنی بلند بانگ آزادی، بے باکی اور پیش قدمی کے باوجود حرام کاری میں ابھی مرد سے پیچھے ہی ہو؟ یقین کیسے کیا جائے؟ (صدق جدید لکھنؤ)

ماہنامہ الفرقان لکھنؤ

ہماری دعوت

لا الٰہ الا اللہ محمد رسول اللہ

اسی کلمہ پر اسلام کی بنیاد ہے اور ہمارا ایمان ہے کہ یہی انسانیت کی نجات کا کلمہ ہے
لیکن یہ صرف ایک بول ہی نہیں ہے بلکہ ایک شہادت، ایک اصول اور ایک اہم فیصلہ ہے، اور جس پر
اس بات کا عہد ہے کہ ہم صرف اللہ کی عبادت اور بندگی کریں گے اور زندگی کے ہر شعبہ میں اس کی بھیجی ہوئی
اور حضرت محمد صلعم کی لائی ہوئی ہدایت و شریعت کی پیروی کریں گے اور اسی حال میں جئیں گے اور مریں گے۔
جو لوگ اس کلمہ پر ایمان لا چکے ہیں ان کا فرض ہے کہ زندگی اس عہد کے مطابق گزاریں اور اسی ایمانی
زندگی کو دنیا میں رواج دینے کی کوشش کریں، وہ اسی لیے پیدا ہوئے ہیں، ہم اس کا
عہد کرتے ہیں، اسی کی دعوت دیتے ہیں اور اسی پر جینا اور مرنا چاہتے ہیں۔

فاطر السموات والارض انت ولی فی الدنیا والآخرۃ
توفنی مسلما والحقنی بالصالحین۔

"ادارہ الفرقان"

مدیر و مسئول

محمد منظور نعمانی عفا اللہ عنہ

مولانا محمد منظور نعمانی ——— اور ——— مولانا سید ابوالحسن علی ندوی

کی

تبلیغی تقریریں!

جو ہندوستان و پاکستان کے مختلف شہروں کے اہم تبلیغی اجتماعات میں کی گئی تھیں

☆ ان کے مطالعہ سے ہر شخص کو معلوم ہوگا ——— کہ ☆

(۱) دعوت و تبلیغ کی اس جد و جہد کی کیا اہمیت اور ضرورت ہے۔

(۲) اس کا مقصد و نصب العین اور اس کے اصول کیا ہیں، اور وہ کن امتیازات کی حامل ہے۔

(۳) مسلمانوں سے اس کا کیا مطالبہ ہے، اور ان کے لئے اس کا کیا پیام ہے۔

(۴) دنیا اور آخرت میں اس تحریک سے کن نتائج کی توقع ہے۔

(۵) جو لوگ اس دینی دعوت کو صرف کلمہ و نماز کی تحریک یا جامد خانقاہیت کی دعوت کہتے ہیں وہ اصل حقیقت سے کتنے ناواقف ہیں۔

☆ اس تحریک کے کارکنوں کو ان تقریروں کے مطالعہ سے معلوم ہوگا ——— کہ ☆

(۶) مسلمانوں کے مختلف طبقوں کے سامنے اس دعوت کو کس انداز میں پیش کرنا چاہئے۔

(۷) شبہات اور غلط فہمیوں کو کس طرح صاف کرنا چاہئے۔

(۸) اس کام سے تعلق رکھنے والوں کو کن باتوں کی پابندی خاص طور سے کرنی چاہئے۔

(۹) ان میں بعض تقریریں وہ بھی ہیں جو ایسے مجمعوں میں کی گئیں جن میں غیر مسلم بھی خاصی تعداد میں تھے، ان سے معلوم ہوگا کہ غیر مسلم حضرات کیلئے ہماری دعوت اور ہمارا پیام کیا ہے، اور ہم ان سے کیا کہتے ہیں۔

(۱۰) بوقتِ ضرورت ان تقریروں کو اجتماعات میں بھی سنایا جا سکتا ہے۔

اس میں کل ۱۳ تقریریں ہیں — پونے تین سو صفحات — مجلد — خوشنما — مع گرد پوش — قیمت: (عہ۸)

کتب خانہ الفرقان گوئن روڈ لکھنؤ

ہندوستان اور پاکستان سے
سالانہ چندہ:- ۶ر
ششماہی:- ۳ر
فی کاپی ۸ر آنے

ماہنامہ الفرقان لکھنؤ

غیر ممالک سے
سالانہ چندہ
دس شلنگ

جلد ۲۱ | بابتہ ماہ جمادی الاولی ۱۳۷۳ھ مطابق جنوری ۱۹۵۴ء | شمارہ ۵

پاکستان میں چندہ:- سکریٹری ادارہ اصلاح وتبلیغ۔ آسٹریلین بلڈنگس۔ لاہور
کے نام بھیجئے اور ہمیں فوراً اطلاع دیدیجئے

تاریخ اشاعت:- ہر انگریزی مہینے کی ۱۵ ر

سُرخ نشان ○ اگر اس دائرہ میں سُرخ نشان لگا ہے تو مطلب یہ ہے کہ آپ کا چندہ ختم ہو چکا ہے
براہ کرم نئے سال کے لئے چندہ ارسال فرمائیں ورنہ اگلا رسالہ بذریعہ وی۔ پی ارسال کیا جائے گا۔ وی۔ پی ۶ر کا ہوگا۔

(مولوی) محمد منظور نعمانی پرنٹر و پبلشر نے نامی پریس لکھنؤ میں چھپوا کر دفتر الفرقان گوئن روڈ لکھنؤ سے شائع کیا

دو ضروری اعلان

۱۔ گذشتہ سال الفرقان کے اضطراری التوا اشاعت کے عوض میں جس نئی کتاب کے دینے کا وعدہ کیا گیا تھا اس کی تکمیل میں میری بعض مصروفیتوں اور مجبوریوں کی وجہ سے برابر دیر ہوتی چلی جا رہی ہے اور ادھر خریدار صاحبان کی بے چینی روز بروز بڑھتی جا رہی ہے۔ ادارہ الفرقان کی آسانی تو اسی میں تھی کہ یہ قرض اس کتاب ہی سے ادا ہوتا مگر مذکورہ صورت حال کے پیش نظر اس تجویز پر نظر ثانی کرنا پڑی اور یہ طے کیا گیا کہ ایک خاص موضوع پر الفرقان کا ایک خصوصی نمبر نکال دیا جائے چنانچہ اس کی تیاری شروع کر دی گئی ہے اور امید ہے کہ یہ نمبر انشاء اللہ ماہ شعبان میں شائع ہو جائے گا۔

امید ہے کہ یہ سطریں خریداران الفرقان کی بے چینی کم کرنے کے لئے کافی ہوں گی! والسلام

محمد منظور نعمانی عفا اللہ عنہ

۲۔ پاکستان کے جن خریداروں کا چندہ گذشتہ سال ماہ صفر سے ماہ شعبان تک جس مہینے پر بھی ختم ہوا تھا ان کو وی۔ پی نہیں جا سکا تھا اور یہی بات بڑی حد تک التوا اشاعت کا سبب بنی تھی۔ پھر جب اس سال محرم سے رسالہ جاری ہوا تو ایسے تمام حضرات کو وی۔ پی کیا گیا تھا جس کے وصول کرنے کا ہم شکریہ ادا کر چکے ہیں مگر اس وی۔ پی سے چونکہ پچھلے سال کا چندہ وصول ہوا تھا نہ کہ اس سال کا۔ اس لئے دو تین مہینے بعد اس سال کے پیشگی چندہ کے لئے پھر حسب قاعدہ اطلاع دی گئی اور جو حضرات چندہ نہ بھیج سکے ان کو وی۔ پی کیا گیا۔ اس پر بعض حضرات کو تعجب ہوا کہ ابھی تو وی۔ پی وصول کر چکے ہیں یہ پھر کیسا وی۔ پی؟ ان حضرات کو تو خط و کتابت سے یہ بات سمجھا دی گئی مگر یہ سلسلہ چونکہ ابھی کئی مہینے تک شاید اور جاری رہے اس لئے ان سطور کے ذریعہ یہ بات صاف کرنا مقصود ہے کہ محرم کے رسالہ کا وی۔ پی گذشتہ سال سے متعلق تھا اور اس کے بعد جن صاحب کو دوسرا وی۔ پی پہنچ رہا ہے وہ اس سال سے متعلق ہے۔ براہ کرم اس فرق کو ملحوظ رکھئے! اور وی۔ پی واپس نہ فرمائیے!

ناظم الفرقان

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

نگاہِ اولیں

جناب سید الانبیا حضرت محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وسلم کی آمد سے اس عالم کی قسمت جاگی، اس کی مصیبتیں دور ہوئیں، اس کی زندگی کا ایک خوش منظر دور شروع ہوا، اور اللہ کے بندوں کو اللہ کی بندگی کا سیدھا راستہ مل گیا۔ —— اس لیے بجا ہو اگر اس محسن اعظم کی ولادت کے یوم سعید پر احسان شناسوں کے دلوں میں مسرت کی ایک لہر دوڑ جائے، مگر احسان شناسی اور سپاس گزاری کا، وہ کیسا مظاہرہ ہوگا جس میں بہت سی حرکتیں اسکی منشار کے خلاف ہوں، اسکی مقدس روح کو تکلیف پہونچانے والی ہوں اور اس کے حیات آفریں پیغام پر پردہ ڈال دیتی ہوں؟

ابتک ایسی باتوں کا ارتکاب ہمارے کم پڑھے اور بے پڑھے عوام کرتے تھے اور ہم انھیں کو روتے تھے اور ان کے ساتھ ان مولویوں کی جان کو بھی دعا دیتے تھے جو ان باتوں کو کارِ ثواب بتاتے تھے، مگر اب سمجھ میں نہیں آتا کہ "پنبہ" کہاں کہاں رکھا جائے کہ "تن ہمہ داغ داغ شد" —— چند برس سے ایک نئی صورت حال پیدا ہوئی ہو کہ ہمارے تعلیم یافتہ طبقہ نے بھی یہ "جہالت" ذرا "تعلیم یافتہ طریقہ" سے شروع کر دی ہو، یہاں ہم اس اپٹوڈیٹ قسم کے جشن مسرت کے پورے پروگرام سے تو بحث نہیں کرنا ہو کیونکہ اس کے اکثر اجزاء "نئی بوتلوں میں پرانی شراب" کے مصداق ہیں، البتہ اس کا ایک جزو بالکل نیا ہو، وہی گفتگو کا محتاج ہو۔

وہ نیا جزء جو اس پروگرام میں بڑی اہمیت کے ساتھ شامل کیا جا رہا ہو یہ ہو کہ غیر مسلم سیاسیین کو خصوصاً برسر اقتدار گروہ کے معتدد اصحاب کو تقاریر اور پیغامات کے لیے مدعو کیا جاتا ہو، بلکہ بعض جگہ مسند صدارت بھی پیش کی جاتی ہو، چنانچہ یہ حضرات "کمال نیاز مندی" کے ساتھ تقریریں ارشاد فرماتے ہیں اور پیغامات ارسال فرماتے ہیں اور حاضرین —— جن میں نوے فیصدی مسلمان ہوتے ہیں ان کو "باادب باملاحظہ ہوشیار" ہو کر سنتے ہیں۔

برادرانِ وطن کی نفس شرکت یا نفس تقریر سے ہمیں کوئی اختلاف نہیں، بلکہ یہ تو ایک گونہ خوشی کی بات ہو کہ غیر مسلم بھی اس ذات والا صفات کو نذر عقیدت پیش کرنے پر مجبور نظر آویں! مگر اس نذر عقیدت میں نری عقیدت تو نہیں ہوتی، اس میں کچھ اور بھی ہوتا ہو جو عقیدت کی مٹھاس میں بڑی آسانی کے ساتھ مسلمانوں کے حلق سے اتر جاتا ہو اور غیر شعوری طور پر ان کے خیالات کا جزو بن جاتا ہو۔

اس اجمال کی تفصیل یہ ہو کہ ان سارے پیغامات اور تمام تقریروں کی تان وحدت ادیان کی تلقین پر آکر ٹوٹتی ہو اور ان سب میں قدر مشترک یہی ٹیپ کا بند ہوتا ہو کہ

"تمام مذاہب کی تعلیمات یکساں طور پر اچھی اور سچی ہیں، یہ بظاہر مختلف راستے ہیں مگر ہر راستہ خدا تک پہونچتا ہو، اسلیے اس ظاہری اختلاف کی بنیاد پر انسانوں میں کوئی حقیقی اختلاف نہ ہونا چاہیے، ہر مذہب کی روح یہی ہو کہ لوگ پریم اور بھائی چارے کے ساتھ رہیں، تمام مذاہب کے بزرگوں کی تعلیمات کا حاصل یہی باہمی رواداری اور صلح و آشتی ہو، حضرت محمدؐ نے بھی یہی تعلیم بڑے اچھے طور سے دی ہم سب کو ان کی تعلیم سے فائدہ اٹھانا چاہیے۔ تاکہ ہم مکمل رواداری اور بھائی چارے کے ساتھ، یکجہت ہو کر وطن کی خدمت کر سکیں!

یہ وہ تلقین ہو جسکو چند سال پیشتر مسلمان آسانی کے ساتھ سن نہیں سکتا تھا، مگر اب سنانے والوں کو دعو کر کے سنتا ہو، اس قسم کی تلقین کا (قابل ذکر) واقعہ سب سے پہلے غالباً جمعیۃ علماء ہند کے سالانہ اجلاس (۱۹۴۹ء) منعقد لکھنؤ میں پیش آیا تھا، جبکہ وحدت ادیان کے مبلغ اعظم پنڈت سندر لال جی نے اپنی تقریر میں بڑے دھڑلے سے مسلمانوں کو اسکی تلقین کی تھی — اگرچہ یہ واقعہ ہو کہ داعیان اجلاس کے قصد کو اس میں بالکل دخل نہ تھا، اور وہ عجیب کشمکش و پیچ میں پڑ گئے تھے کہ اپنے اس "بے تکلف" مہمان کے ساتھ کیا سلوک کریں — گر دیکھنے والے جانتے ہیں کہ مسلمان پبلک کو یہ لمحات کس قدر شاق تھے، اور خود داعیین کو بھی یارائے ضبط نہ رہا تھا اور وہ برملا کہہ اٹھے تھے کہ "یہ ایک مجذوب کی بڑ ہو، جسکو کوئی وقعت نہ دیجیے" — مگر "یہ باتیں ہیں جب کی جب آتش جواں تھا"! اب مسلمانوں میں یہ وحشت نہیں رہی ہو، اب وہ قریب آرہے ہیں یا خود کو قریب لا رہے ہیں۔ اور اگر ان کے جانے پہچانے لوگ اس پنڈوق کے لیے اپنے کندھے یوں ہی پیش کرتے رہے جیسے کہ اس وقت ہوا چل پڑی ہو تو کون جانے کب ہم اس انقلاب کی یہ حد بھی دیکھ لیں گے۔

همہ آہوان صحرا، سر خود نہادہ بر کف — بامید آنکہ روزے بشکار خواہی آمد

پہلے یہ بتلانے کی ضرورت نہیں تھی کہ یہ باتیں ناقابل سماعت ہیں اور اسلام کی رو سے وحدت ادیان کا یہ فلسفہ بالکل مہمل شے ہو، اللہ کے یہاں سند قبول صرف ایک ہی دین کو حاصل ہو اور وہ اسلام ہو (اِنَّ الدِّیْنَ عِنْدَ اللّٰہِ الْاِسْلَام) مسلمان ہزار گنہگار اور بے عمل ہوتے ہوئے بھی اس بات پر پکا اعتقاد رکھتا تھا کہ نجات کی راہ صرف ایک ہو اور وہ اسلام ہو! — مگر اللہ رے انقلاب زمانہ! کہ وہی مسلمان اب جلسہ

سیرت النبی میں دو زانو بیٹھ کر یہ سبق پڑھتا ہو کہ ہر مذہب راہ نجات ہو اور ہر راستہ سے خدا ملتا ہو، اسلام ہی کی کوئی اجارہ داری نہیں ہو!

ہم اپنے اُن بھائیوں سے جو دانستہ یا نادانستہ طور پر اس فتنہ وحدتِ ادیان کی خدمت انجام دے رہے ہیں، پوچھنا چاہتے ہیں کہ کیا واقعی جنابِ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا پیغام یہی تھا جس کو زندہ رکھنے کے لیے ہم سیرت کے جلسے منعقد کرتے ہیں؟ کیا آپ کی بعثت کی غایت اسی "ہندستانی رواداری" کی تعلیم و تلقین تھی؟ اگر جواب اثبات میں ہو تو پھر کوئی ہمیں سمجھائے کہ آپ نے اپنی قوم اور اپنے خاندان سے کیوں لڑائی مول لی تھی؟ کیا اس طرح کی رواداری میں ان باتوں کا کوئی بھی امکان تھا جو آپ کو تیرہ سال کی مکی زندگی میں پیش آئیں۔ اور بالآخر ہجرت تک لے گئیں؟ قریش کب کہتے تھے کہ آپ اپنے باپ دادا کے دین کو چھوڑ کر اپنی پسندیدہ راہ پر نہ چلیں؟ وہ تو صرف یہ چاہتے تھے کہ آپ باپ دادا کے دین کو غلط نہ کہیں، ان کے معبودوں کو معبودانِ باطل نہ بتلائیں۔ اور لوگوں کو پرانا طریقہ چھوڑنے کی تلقین نہ کریں، گویا وہ آنحضرت سے اسی "ہندستانی ٹائپ" کی رواداری کے طالب تھے ـــــــ جس پر عمل پیرا نہ ہونا ہی آپ کی مخاصمت کی سب سے بڑی بنا تھی! اور اگر جواب اثبات میں نہیں، نفی میں ہو اور ہمارے یہ بھائی الحمد للہ اس تاریخی اور مذہبی گمراہی میں مبتلا نہیں ہیں تو پھر برائے خدا بتلایا جائے کہ اُن کے جلسوں کے پروگرام کے اس جزو کا کیا مقصد ہو؟ کیا اس سے خوشنودیٔ اقتدار اور ارضائے اکثریت مطلوب ہو؟

ـــــــ سوال یقیناً بہت تلخ ہو مگر اس مجبوری کو کیا کیا جائے کہ ان دو کے علاوہ تیسری کسی بات کا امکان نہیں ہو، ان دونوں میں سے ایک نہ ایک بات بہر حال ہو اور جو بھی ہو وہ ہلکی نہیں ہو! پہلی بات نہایت دور رس اثرات کی حامل ضلالت ہو، اور دوسری حد درجہ کی گراوٹ۔

اگر وحدت ادیان کے اس تصور کو صحیح مان لیا جائے تو اس کا سب سے پہلا منطقی نتیجہ یہ ہو کہ غیر مسلموں میں اسلام کی تبلیغ کو قطعاً غیر ضروری سمجھا جائے اور اس میں وقت صرف کرنے کو اضاعتِ وقت سمجھا جائے، کیونکہ جب ہر راہ راہِ نجات ہو تو انسان اپنے لیے جس راہ کو بھی پسند کرے کر لے لیکن دوسروں کو اسکی تلقین کی کوئی حاجت باقی نہیں رہتی اور پھر اسی کو اگر ذرا دور تک سوچیے تو ماننا پڑے گا کہ وہ ذات گرامی جسکو خراجِ عقیدت پیش کرنے کے لیے ہم یہ جلسے منعقد کرتے ہیں (معاذ اللہ) عمر بھر اسی لایعنی کام میں مشغول رہا۔ کوئی قرآن و حدیث اور سیرت طیبہ سے چن چن کر ہزاروں باتیں بھی بزعم خود مذہبی رواداری کے اس تصور کے

ثبوت میں پیش کردے مگر اس تاریخی واقعہ سے تو کوئی انکار نہیں کر سکتا کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم دنیا کے تمام انسانوں کو اپنے لائے ہوئے دین کی دعوت دیتے تھے اور یہی بات قریش مکہ کو آپ کی جان کا دشمن بنائے ہوئے تھی۔ اس کے سوا اور کوئی شکایت انھیں آپ سے نہ تھی، لہٰذا اس منطقی نتیجہ کی زد سے یہ ذاتِ گرامی بھی نہیں بچ سکتی! ـــ تو کیا یہی ہو وہ "خراجِ عقیدت" جسے بارگاہِ رسالت میں پیش کرنے کے لیے ہر سال مسلمانوں کے لاکھوں روپے پانی کی طرح بہا دیے جاتے ہیں؟

اور اگر بفضلِ خدا ہم اس تصور سے بھی کانوں پر ہاتھ دھرتے ہیں تو ہمیں سوچنا چاہیے کہ ہم اس متبرک تقریب کے پروگرام کے اس جزو سے اپنی کس درجہ گراوٹ کا ثبوت پیش کر رہے ہیں۔ ہم یہ جانتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پیغامِ ہدایت کو وحدتِ ادیان کے اس تصور سے کوئی واسطہ نہیں ہو، اس تصور کی رو سے آپ کی اصل دعوت غلط ٹھہرتی ہو اور آپ کی ساری جد وجہد ایک لایعنی چیز بن جاتی ہو۔ مگر ملک کے سیاسی حالات کے پیشِ نظر ہم اس تبلیغ کو صرف سنا ہی گوارا نہیں کرتے، بلکہ اپنے خرچ پر اس کی نشر و اشاعت کا انتظام بھی کرتے ہیں! "کہ غیرت نام ہو جس کا گئی تیمور کے گھر سے" ـــ ہم ابھی تک اتباعِ دین سے تہی دست ہوئے تھے، مگر حمیتِ دین سے ہمارے سینے خالی نہ تھے۔ [illegible]ء کے انقلاب کی نوعیت نے اس چنگاری کو خوب خوب راکھ میں دبایا، مگر دھواں اس سے پھر بھی کبھی کبھی اٹھتا نظر آجاتا تھا، مگر کیا اب اس کی بچی کھچی حرارت کا خاتمہ خود ہمارے ہی ہاتھوں ہونا ہو؟

آخر میں ہم اس وحدتِ ادیان کے دامِ ہمرنگِ زمین کی حقیقت بھی واضح کرنا چاہتے ہیں۔ تاکہ ان جلسوں کی "برکت" سے اگر کوئی ناواقف مسلمان اس کا شکار ہو گیا ہو تو اس کی غلط فہمی کا ازالہ ہو سکے۔ (باقی آئندہ)

اطلاع

جن حضرات کو (محرم کا وی، پی، واپس کر دینے کے باوجود) اب تک رسالہ جاری ہو (جیسا کہ اعلان کیا جا چکا ہو وہ چار مہینے کے التوا کے عوض میں جاری رکھا گیا تھا) پچھلے رسالہ پر وہ چار مہینے پورے ہو چکے، یہ رسالہ صرف اسی اطلاع کے لیے ان کو بھیجا جا رہا ہو، پس اگر وہ چاہتے ہیں کہ رسالہ بند نہ کیا جائے تو ان کا سالانہ چندہ ۱۰ فروری تک دفتر کو پہونچ جانا چاہیے!

ـــ منیجر

معارف الاحادیث

(سلسلہ احادیث رقاق)

(۲۱) عن عمرو بن عوفٍ قال قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فواللہ لا الفقر اخشی علیکم ولکن اخشی علیکم ان تبسط علیکم الدنیا کما بسطت علی من کان قبلکم فتنافسوھا کما تنافسوھا وتھلککم کما اھلکتھم　(رواہ البخاری ومسلم)

(ترجمہ) عمرو بن عوف سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ میں تم پر فقر و ناداری آنے سے نہیں ڈرتا، لیکن مجھے تمھارے بارے میں یہ ڈر ضرور ہے کہ دنیا تم پر زیادہ وسیع کر دی جائے جیسے کہ تم سے پہلے لوگوں پر وسیع کی گئی تھی۔ پھر تم اس کو بہت زیادہ چاہنے لگو جیسے کہ انھوں نے اس کو بہت زیادہ چاہا تھا (اور اسی کے دیوانے اور متوالے ہو گئے تھے) اور پھر وہ تم کو برباد کر دے جیسے کہ اس نے ان اگلوں کو برباد کیا۔　(بخاری ومسلم)

(تشریح) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے بعض اگلی قوموں اور امتوں کا یہ تجربہ تھا کہ جب ان کے پاس دنیا کی دولت بہت زیادہ آئی تو ان میں دنیوی حرص اور دولت کی رغبت وچاہت اور زیادہ بڑھ گئی۔ اور وہ دنیا ہی کے دیوانے اور متوالے ہو گئے، اور اصل مقصد زندگی کو بھلا دیا۔ پھر اس کی وجہ سے ان میں باہم حسد و بغض بھی پیدا ہوا، اور بالآخر ان کی اس دنیا پرستی نے ان کو تباہ و برباد کر دیا ـــــ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو اپنی امت کے بارہ میں اسی کا زیادہ ڈر تھا ـــــ اس حدیث میں آپ نے از راہ شفقت امت کو اس خطرہ سے آگاہ کیا ہے، اور فرمایا ہے کہ تم پر فقر و ناداری کے حملہ کا مجھے زیادہ ڈر نہیں ہے بلکہ اس کے برعکس تم میں بہت زیادہ دولت مندی آجانے سے دنیا پرستی میں مبتلا ہو کر تمھارے

ہلاک و برباد ہو جانے کا مجھے زیادہ خوف اور ڈر ہو۔

آپ کے اس ارشاد کا مقصد و مدعا اس خوشنما فتنہ کی خطرناکی سے اُمت کو خبردار کرنا ہو تاکہ ایسا وقت آنے پر اس کے برے اثرات سے اپنا بچاؤ کرنے کی وہ فکر کرے۔

(۲۲) عَنْ كَعْبِ بْنِ عِيَاضٍ قَالَ سَمِعْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَقُوْلُ اِنَّ لِكُلِّ اُمَّةٍ فِتْنَةً وَفِتْنَةُ اُمَّتِيْ الْمَالُ۔

(رواه الترمذی)

(ترجمہ) کعب بن عیاض سے روائت ہو کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سُنا آپ ارشاد فرماتے تھے کہ ہر امت کے لیے کوئی خاص آزمائش ہوتی ہو اور میری امت کی خاص آزمائش مال ہو۔ (ترمذی)

(تشریح) مطلب یہ ہو کہ میری پیغمبری کے دور میں (جو اب سے لے کر قیامت تک کا زمانہ ہو) مال و دولت کو ایسی اہمیت حاصل ہوگی اور اس کی ہوس اتنی بڑھ جائے گی کہ وہی اس اُمت کے لیے سب سے بڑا فتنہ ہوگا ——

واقعہ یہ ہو کہ عہدِ نبوی سے لے کر ہمارے اس زمانہ تک کی تاریخ پر جو شخص نظر ڈالے گا اُسے صاف محسوس ہوگا کہ مال کے مسئلہ کی اہمیت اور دولت کی ہوس برابر بڑھتی رہی ہے اور بڑھتی ہی جا رہی ہو، اور بلاشبہ یہی اس دور کا سب سے بڑا فتنہ ہو جس نے بے شمار بندوں کو خدا کی بغاوت و نافرمانی کے راستہ پر ڈال کے سعادت سے محروم کیا ہو —— بلکہ اب تو نوبت یہاں تک پہونچ چکی ہو کہ خدا بیزاری اور خدا دشمنی کے علمبردار بھی دولت و معاش ہی کے مسئلہ کی پیٹھ پر سوار ہو کر اپنے دجالی خیالات دنیا میں پھیلاتے ہیں۔

(۲۳) عَنْ كَعْبِ بْنِ مَالِكٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مَا ذِئْبَانِ جَائِعَانِ اُرْسِلَا فِيْ غَنَمٍ بِاَفْسَدَ لَهَا مِنْ حِرْصِ الْمَرْءِ عَلَى الْمَالِ وَالشَّرَفِ لِدِيْنِهٖ (رواه الترمذی والدارمی)

(ترجمہ) کعب بن مالک سے روایت ہو کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ وہ دو بھوکے بھیڑیے جو بکریوں کے ریوڑ میں چھوڑ دیے گئے ہوں، اُن بکریوں کو اس سے زیادہ

خراب نہیں کر سکتے۔ جتنا خراب آدمی کے دین کو مال کی اور عزت و جاہ کی حرص کرتی ہے۔

(ترمذی۔ دارمی)

(تشریح) مطلب یہ ہے کہ حُبِّ مال اور حُبِّ جاہ آدمی کے دین کو اُس سے زیادہ نقصان پہونچاتے ہیں جتنا نقصان کہ بکریوں کے کسی ریوڑ میں چھوٹے ہوئے بھوکے بھیڑیوں سے ان بکریوں کو پہونچ سکتا ہے۔

(۲۴) عَنْ اَبِیْ هُرَیْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ یَقُوْلُ الْعَبْدُ مَالِیْ مَالِیْ وَاِنَّ مَالَهٗ مِنْ مَالِهٖ ثَلٰثٌ مَا اَکَلَ فَاَفْنٰی اَوْ لَبِسَ فَاَبْلٰی اَوْ اَعْطٰی فَاقْتَنٰی وَمَا سِوٰی ذٰلِکَ فَهُوَ ذَاهِبٌ وَ تَارِکُهٗ لِلنَّاسِ۔ (رواہ مسلم)

(ترجمہ) حضرت ابوہریرہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ بندہ کہتا ہے میرا مال، میرا مال. حالانکہ اس کے مال میں سے جو واقعی اس کا ہے وہ بس تین مدیں ہیں، ایک وہ جو اس نے کھا کے ختم کر دیا، دوسرے وہ جو پہن کر پُرانا کر ڈالا، اور تیسرے وہ جو اس نے راہِ خدا میں دیا۔ اور اپنی آخرت کے واسطے ذخیرہ کر لیا۔ اور اس کے سوا جو کچھ ہے وہ بندہ دوسرے لوگوں کے لیے اُس کو چھوڑ جانے والا ہے۔ اور خود یہاں سے ایک دن رخصت ہو جانے والا ہے۔

(مسلم)

(تشریح) مطلب یہ ہے کہ آدمی کے کمائے ہوئے اور جوڑے ہوئے مال میں سے واقعۃً اور حقیقۃً اس کا بس وہی ہے جو اس نے کھانے پہننے کی ضروریات میں یہاں اپنے اوپر خرچ کر لیا۔ یا راہِ خدا میں دے کے آخرت کے واسطے اللہ تعالیٰ کے یہاں جمع کر دیا۔ اس کے سوا جو کچھ ہے وہ درحقیقت اس کا نہیں ہے بلکہ ان وارثوں کا ہے جن کے لیے وہ اس کو چھوڑ جانے والا ہے۔

(۲۵) عَنْ عَبْدِ اللّٰهِ بْنِ مَسْعُوْدٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ اَیُّکُمْ مَالُ وَارِثِهٖ اَحَبُّ اِلَیْهِ مِنْ مَالِهٖ قَالُوْا یَا رَسُوْلَ اللّٰهِ مَا مِنَّا اَحَدٌ اِلَّا مَالُهٗ اَحَبُّ اِلَیْهِ مِنْ مَالِ وَارِثِهٖ قَالَ فَاِنَّ مَالَهٗ

مَا قَدَّمَ وَمَالَ وَارِثِہٖ مَا اَخَّرَ۔ (رواہ البخاری)

(ترجمہ) حضرت عبداللہ بن مسعود سے روایت ہو کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ تم میں سے کون ایسا ہو جس کو اپنے مال سے زیادہ اپنے وارث کا مال محبوب ہو؟ (یعنی اپنے ہاتھ میں مال آنے سے زیادہ محبوب جس کو اپنے وارثوں کے ہاتھ میں مال آنا ہو؟) لوگوں نے عرض کیا ہم میں سے ہر ایک کا حال یہ ہو کہ اس کو اپنے وارثوں کے مال سے زیادہ محبوب اپنا ہی مال ہو۔ (یعنی ہم میں کوئی ایسا نہیں ہو جس کی یہ چاہت ہو کہ مال اس کو نہ ملے بلکہ اس کے وارثوں کو ملے) آپ نے فرمایا جب یہ بات ہو تو معلوم ہونا چاہیے کہ آدمی کا مال بس وہی ہو جس کو اس نے آگے چلتا کر دیا۔ اور جس قدر اس نے بعد کے لیے رکھا وہ اس کا نہیں ہو۔ بلکہ اس کے وارثوں کا ہو۔ (لہذا دانش مند آدمی کو چاہیے کہ وارثوں کے لیے چھوڑنے سے زیادہ فکر اپنی آخرت کے لیے سرمایہ محفوظ کر دینے کی کرے، جس کی صورت یہی ہو کہ سینت سینت کے گھر میں رکھنے کے بجائے خیر کے مصارف میں صرف کرتا رہے۔

(۲۶) عَنْ اَبِیْ هُرَیْرَةَ یَبْلُغُ بِہٖ قَالَ اِذَا مَاتَ الْمَیِّتُ قَالَتِ الْمَلٰٓئِکَةُ مَا قَدَّمَ وَقَالَ بَنُوْ اٰدَمَ مَا خَلَّفَ۔ (رواہ البیہقی فی شعب الایمان)

(ترجمہ) حضرت ابوہریرہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے نقل کرتے ہیں کہ آپ نے فرمایا جب مرنے والا مرتا ہو تو فرشتے کہتے ہیں اور پوچھتے ہیں کہ اس نے اپنے واسطے آگے کیا بھیجا (یعنی کیا اعمال خیر کیے۔ اور اپنی آخرت کے لیے اللہ کے خزانہ میں کیا سرمایہ جمع کیا ہو) اور عام انسان آپس میں کہتے ہیں اور پوچھتے ہیں کہ اس نے کتنا مال چھوڑا؟

(۲۷) عَنْ اَبِیْ هُرَیْرَةَ عَنِ النَّبِیِّ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ قَالَ لُعِنَ عَبْدُ الدِّیْنَارِ وَلُعِنَ عَبْدُ الدِّرْهَمِ۔ (رواہ الترمذی)

(ترجمہ) حضرت ابوہریرہ سے روایت ہو کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ بندہ دینار خدا کی رحمت سے محروم ہو، اور بندۂ درہم خدا کی رحمت سے دور رہے۔ (ترمذی)

(تشریح) جو لوگ مال و دولت اور دینار و درہم کے پرستار ہیں اور انھوں نے دولت ہی کو اپنا محبوب و مطلوب بنا لیا ہو اس حدیث میں اُن سے بیزاری کا اعلان اور اُن کے

حق میں بددعا ہو کہ وہ خدا کی رحمت سے محروم اور دور رہیں ۔

مال و دولت کی پرستش اور بندگی یہ ہو کہ اس کی چاہت اور طلب میں بندہ ایسا گرفتار ہو کہ اللہ کے احکام اور حلال و حرام کی حدود کا بھی پابند نہ رہے ۔

(۲۸) عَنْ جُبَيْرِ بْنِ نُفَيْرٍ مُرْسَلاً قَالَ قَالَ رَسُولُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مَا أُوْحِيَ إِلَيَّ أَنْ أَجْمَعَ الْمَالَ وَأَكُونَ مِنَ التَّاجِرِينَ وَلٰكِنْ أُوْحِيَ إِلَيَّ أَنْ سَبِّحْ بِحَمْدِ رَبِّكَ وَكُنْ مِّنَ السّٰجِدِيْنَ وَ وَاعْبُدْ رَبَّكَ حَتّٰى يَأْتِيَكَ الْيَقِيْنُ ۝

(رواہ فی شرح السنہ)

(ترجمہ) جبیر بن نفیر تابعی سے روایت ہے ۔ وہ بطریق ارسال[1] رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے نقل کرتے ہیں کہ آپ نے ارشاد فرمایا مجھے اللہ کی طرف سے اس کی وحی نہیں کی گئی اور یہ حکم نہیں دیا گیا کہ میں مال و دولت جمع کروں اور تجارت و سوداگری کو اپنا پیشہ اور مشغلہ بناؤں ــ بلکہ مجھے یہ حکم دیا گیا ہے ۔ اور میری طرف یہ وحی کی گئی ہے کہ اپنے رب کی تسبیح و تحمید میں مشغول رہ اور ہو جا اللہ کے حضور میں جھکنے والوں اور گرنے والوں میں سے ، اور کیے جا بندگی اپنے پروردگار کی موت آنے تک ۔

(شرح السنہ)

(تشریح) جن کو شریعت کے اصول و احکام کا کچھ علم ہے وہ جانتے ہیں کہ تجارت اور اس کے ذریعہ دولت کمانا ناجائز نہیں ہے ، اور شریعت کے احکام کا ایک بڑا حصہ تجارت وغیرہ مالی معاملات ہی سے متعلق ہے ، بلکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان تاجروں کی بڑی بڑی فضیلتیں بیان فرمائی ہیں جو امانت داری ، راستبازی اور دیانت داری کے ساتھ تجارت کرتے ہوں ــ لیکن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا جو خاص مقام تھا اور جو کام اللہ تعالیٰ کو آپ سے لینا تھا اس میں تجارت جیسے کسی جائز معاشی مشغلہ میں بھی مشغول ہونے کی گنجائش نہ تھی ــ اسی روشنی میں اس حدیث کا مطلب سمجھنا چاہیے ۔

---

[1] کبھی ایسا ہوتا ہے کہ ایک تابعی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے کوئی حدیث نقل کرتے ہیں اور جن صحابی کے ذریعہ سے وہ حدیث ان کو پہنچی ہوتی ہے ان کا ذکر نہیں کرتے ایسی حدیث مُرسل کہلاتی ہے اور تابعی کے اس طرح حدیث بیان کرنے کو "ارسال" کہتے ہیں ۔ ۱۲

آپ کے امتیوں میں بھی اللہ کے جو بندے خالص متوکلانہ طرز زندگی کو اپنے لیے پسند کریں اور اس راستہ کے شدائد و مصائب پر صبر کی ہمت رکھتے ہوں اور اللہ تعالیٰ پر توکل کی دولت ان کو میسر ہو تو ان کے لیے بلاشبہ یہی افضل ہے، لیکن جن کا یہ حال نہ ہو اُن کو کسی جائز معاشی مشغلہ کا اختیار کرنا ضروری ہے۔

(۲۹) عَنْ اَبِیْ اُمَامَةَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ عَرَضَ عَلَیَّ رَبِّیْ لِیَجْعَلَ لِیْ بَطْحَاءَ مَکَّةَ ذَهَبًا فَقُلْتُ لَا یَا رَبِّ وَلٰکِنْ اَشْبَعُ یَوْمًا وَّ اَجُوْعُ یَوْمًا فَاِذَا جُعْتُ تَضَرَّعْتُ اِلَیْكَ وَذَکَرْتُكَ وَاِذَا شَبِعْتُ حَمِدْتُكَ وَشَکَرْتُكَ۔ (رواہ احمد والترمذی)

(ترجمہ) حضرت ابو امامہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بیان فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے میرے سامنے یہ بات رکھی کہ میرے لیے وہ مکہ کی وادی کو (یا اس کے سنگریزوں کو) سونا بنا دے، اور سونے سے بھر دے (یعنی اللہ تعالیٰ کی طرف سے میرے سامنے یہ بات رکھی گئی کہ اگر تم دولت مند بننا چاہو تو تمہارے لیے مکہ کی وادی کو ہم سونے سے بھر سکتے ہیں) تو میں نے عرض کیا کہ میرے پروردگار میں اپنے لیے یہ نہیں مانگتا، بلکہ میں (ایسی ناداری اور غریبی کی حالت میں رہنا پسند کرتا ہوں کہ) ایک دن پیٹ بھر کھاؤں اور ایک دن بھوکا رہوں، تو جب مجھے بھوک لگے تو آپ کو یاد کروں، اور آپ کے سامنے عاجزی اور گریہ وزاری کروں اور جب آپ کی طرف سے مجھے کھانا ملے اور میرا پیٹ بھرے تو میں آپ کی حمد اور آپ کا شکر کروں۔ (مسند احمد و ترمذی)

(تشریح) معلوم ہوا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فقر و فاقہ کی جس حالت میں زندگی گزاری وہ اپنے لیے خود آپ نے پسند کی تھی اور اپنے اللہ سے آپ نے اس کو مانگا تھا، اور بلاشبہ فضیلت اسی کو ہے، لیکن یہ فضیلت ان ہی بندگانِ خدا کے حق میں ہے، جو اپنے لیے اس حالت کو پسند کریں۔ اور اس کو تقرب الی اللہ کا ذریعہ بنائیں۔

اخلاصِ نیّت

(از جناب مولوی محمد اشرف خاں صاحب)

۴

نیات وارادے ہی اعمال کی جان کا حکم رکھتے ہیں کہ ہر کام کی اچھائی اور برائی ان کے مقاصد کے پیش نظر ہی کی جاسکتی ہو۔ کسی کو لاکھوں روپے اور زر وجواہر کے ڈھیر صرف نام ونمود، شہرت اور ذاتی نفع کے لیے دے ڈالنے سے کسی صاحب حاجت اور بے نوا کو اخلاص نیت سے چند پیسے دے دینے بہتر ہیں کیونکہ ایک صرف اپنے مفاد کے لیے مدد کر رہا ہے اور اس کی اس داد و دہش میں مدد کی اصلی روح مفقود ہے اور دوسرا اپنی ذات کو بھُلا کر لوجہ اللہ انسانی ہمدردی کے لیے کر رہا ہے۔ ظاہر ہو کہ فطرت سلیمہ کی نظر میں یہ دوسرا پہلے سے بدرجہا فائق ہوگا۔ یہی وجہ ہو کہ اخلاص کے ساتھ تھوڑا عمل بغیر اخلاص کے کثیر عمل سے بہتر ہو۔ چناں چہ ابن ابی حاتم نے حضرت معاذ ابن جبل سے روایت کی ہو کہ حضور صلعم نے فرمایا:۔

أَخْلِصْ دِينَكَ يَكْفِيكَ الْقَلِيلُ مِنَ الْعَمَلِ — دین میں اخلاص پیدا کر تو تھوڑا عمل تجھے کافی ہو جائے گا۔

اس دنیا میں بھی نیک نیتوں اور مخلصوں کے اعمال کی قدر کی جاتی ہو۔ اور ریاکاروں کے اعمال کے "بیوت العنکبوت" چند دن میں کالعدم ہو جاتے ہیں کہ روح عمل نیت ہو، نیت جتنی خالص ہوگی اعمال میں اتنا ہی نمو ہوگا۔ نیت اپنی قوت سے اعمال کے بقا کی ضامن ہوتی ہے۔ نیات میں خلوص و حسن سے جتنی قوت پیدا ہوگی۔ اعمال میں اتنی ہی پائیداری آتی چلی جائے گی اور نیت جس قدر تصنع اور ریا سے ملوث ہو کر مضمحل ہو چکی ہوگی۔ اعمال کا ثبات و قرار بھی اسی قدر

کم ہوتا چلا جائے گا۔ یہاں تک کہ وہ لوگ جن کے نخلِ نیت کو کفر و نفاق نے جڑ سے کھوکھلا کردیا ہوگا۔ ان کے اعمال قطعاً بے جان و بے وزن ہو کر تلنے کے قابل بھی نہ رہیں گے۔ گو انھیں اپنے وہ اعمال کتنے ہی خوشنما معلوم ہوتے رہیں، جیسا کہ آیت ذیل سے متبادر ہوتا ہو (واللہ اعلم بالصواب)

قُلْ هَلْ نُنَبِّئُكُمْ بِالْأَخْسَرِينَ أَعْمَالًا ۝ الَّذِينَ ضَلَّ سَعْيُهُمْ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَهُمْ يَحْسَبُونَ أَنَّهُمْ يُحْسِنُونَ صُنْعًا ۝ أُولٰئِكَ الَّذِينَ كَفَرُوا بِآيَاتِ رَبِّهِمْ وَلِقَائِهِ فَحَبِطَتْ أَعْمَالُهُمْ فَلَا نُقِيمُ لَهُمْ يَوْمَ الْقِيَامَةِ وَزْنًا ط (الکہف ع ۱۲)

آپ ان سے کہیئے کہ کیا ہم تم کو ایسے لوگ بتلائیں۔ جو اعمال کے اعتبار سے بالکل خسارہ میں ہیں۔ یہ وہ لوگ ہیں جن کی دنیا میں کی کرائی محنت سب گئی گزری ہوئی۔ اور وہ (بوجہ جہل کے) اسی خیال میں ہیں کہ وہ اچھا کام کر رہے ہیں۔ یہ وہ لوگ ہیں جو اپنے رب کی آیتوں کا (یعنی کتب آلہی کا) اور اس سے ملنے کا (یعنی قیامت کا) انکار کر رہے ہیں۔ سو اس لیے ان کے سارے کام غارت ہوگئے۔ قیامت کے دن ہم ان کے (نیک) اعمال کا ذرا بھی وزن قائم نہ کریں گے۔

وجہ ظاہر ہو کہ جسد بے روح، گل بے رنگ و بو کی قدر بازار میں کچھ بھی نہیں ہوتی اسی طرح وہ اعمال جو للہیت و احتساب یا اخلاص و حسن نیت کے جوہر سے خالی ہیں۔ بے جان لاشوں کی مثل ہیں۔ جو امتداد زمانہ اور مرور ایام سے اپنے خبث باطن کی بنا پر زیادہ سے زیادہ خراب و متعفن ہوتی چلی جاتی ہیں۔ اور ان کا ظاہری حسن و صورت کسی کام نہیں آتا۔ ان کا وجود عدم اور ان کا جسم تو وہ خاک ہو کر رہ جاتا ہو۔ جسے اس عالم میں باد حوادث اڑا لیجاتی ہو۔ اور آنے والے عالم میں حقائق کا انکشاف ہباءً منثورا بنا دے گا۔ ارشاد ہوتا ہے:۔

مَثَلُ الَّذِينَ كَفَرُوا بِرَبِّهِمْ أَعْمَالُهُمْ كَرَمَادٍ اشْتَدَّتْ بِهِ الرِّيحُ فِي يَوْمٍ عَاصِفٍ لَا يَقْدِرُونَ مِمَّا كَسَبُوا عَلَىٰ شَيْءٍ ط ذٰلِكَ هُوَ الضَّلَالُ الْبَعِيدُ۔

(ابراہیم - ۳ -)

جو لوگ اپنے پروردگار کے ساتھ کفر کرتے ہیں ان کی حالت، باعتبار عمل کے یہ ہے، جیسے کچھ راکھ

ہو۔ جس کو تیز آندھی کے دن تیزی کے ساتھ ہوا اڑا لیجائے۔ ان لوگوں نے جو عمل کیے تھے
ان کا کوئی حصہ ان کو حاصل نہ ہوگا۔ یہ بھی بڑی دور دراز کی گمراہی ہو۔ (ترجمہ تھانوی ؒ)

کہ کفر و نفاق کے ساتھ اخلاص و حسن نیت جو کہ اعمال کی جان ہو، جمع نہیں ہو سکتا۔ کہ اخلاص اللہ تعالیٰ کی رضا کے لیے اعمال کی بجا آوری کا نام ہے۔ اور اس میں بھی یہ شرط ہے کہ بجا آوری مطابق اوامر و احکام ہو۔ اسلیے کافر و منافق کا کوئی عمل اخلاص شرعی کا حامل ہو ہی نہیں سکتا اور اسی طرح خلاف شریعت اعمال بھی مطلوبہ اخلاص سے یکسر خالی سمجھے جائینگے۔ گویا اخلاص کا دائرہ حدود اللہ اور سنت نبویہ کے محیط سے باہر نہیں۔ یعنی جس طرح اعمال صالحہ (مامورات شرعیہ) کی قبولیت کے لیے اخلاص ضروری ہو۔ اسی طرح اخلاص کے قبول کے لیے اعمال صالحہ کا ہونا ضروری ہے۔ گویا قبولیت اعمال کے لیے اخلاص و عمل صالح لازم و ملزوم ہیں۔ اور ایک کے بغیر دوسرا نتائج کے اعتبار سے معتبر نہیں۔ غرض اعمال صالحہ کے لیے خلوص نیت روح جسد کا حکم رکھتا ہے۔ جس طرح جسد بے روح کسی کام کا نہیں۔ اس طرح اعمال بغیر حسن نیت کے بے فائدہ بلکہ وبال ہیں۔ اور ان کی بقا اور وزن کے لیے اخلاص کا وجود ضروری ہو۔ اعمال میں نیت کا یہی وزن ہو۔ جس کے متعلق حقیقت اسلامیہ کے ایک بڑے رازداں حضرت شاہ ولی اللہ صاحب محدث دہلوی حجۃ اللہ البالغہ میں تحریر فرماتے ہیں۔

واعلم ان النیۃ روح والعبادۃ جسد ولاحیاۃ للجسد بدون الروح، والروح لھا حیاۃ بعد مفارقۃ البدن ولکن لا یظھر آثار الحیاۃ بدونہ ولذالك قال اللہ تعالیٰ لن ینال اللہ لحومھا ولا دماؤھا ولکن ینالہ التقوی منکم وقال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم۔ انما الاعمال بالنیات وشبّہ النبی صلی اللہ علیہ وسلم فی کثیر من المواضع من صدقت نیتہ ولم یتمکن من العمل لمانع بمن عمل ذالك العمل کالمسافر والمریض لا یستطیعان ورد اداظبا علیہ فیکتب لھما کصادق العزم فی الانفاق

وهو يملق يكتب كافة الفق واعنى بالنية المعنى الباعث على العمل من التصديق بما اخبر به الله على السنة الرسل من ثواب المطيع وعقاب العاصى اور حبا متثال حكم الله فيما امرو نهى ولذلك وجب ان ينهى الشارع عن الريا والسمعة ويبين مساويها اصرح مايكون ضمن ذالك قوله صلى الله عليه وسلم ان اول الناس يقضى عليهم يوم القيمة ثلاثة رجل قتل فى الجهاد ليقال هو رجل جرئ ورجل تعلم العلم وعلمه ليقال هو عالم ورجل انفق فى وجوه الخير ليقال هو جواد فيومر بهم فيسحبون على وجوههم الى النار وقوله صلى الله عليه وسلم عن الله تعالى انا اغنى الشركاء عن الشرك من عمل عملاً اشرك فيه غيرى تركته وشركه اما حديث ابى ذر رضى الله عنه قيل يا رسول الله ارايت الرجل يعمل العمل من الخير ويحمده الناس عليه قال تلك عاجل بشرى المومن فمعناه ان يعمل العمل لا يقصد به الا وجه الله فينزل القبول الى الارض فيحبه الناس وحديث ابى هريرة رضى الله عنه قلت يا رسول الله بينا انا فى بيتى فى مصلاى اذ دخل على رجل فاعجبنى الحال التى رانى عليها قال رحمك الله يا ابا هريرة لك اجران اجر السر واجر العلانية فمعناه ان يكون الاعجاب مغلوبا لا يبعث بمجرده على العمل واجر السر اجر الاخلاص الذى يتحقق فى السر واجر العلانية اجر اعلاء دين الله واشاعت السنة الراشدة (حجۃ اللہ البالغہ جلد دوم مباحث الاحسان)

جان لو کہ عمل کی روح نیت ہو۔ اور عبادت اس کا بدن ہے۔ اور بغیر روح کے بدن کی حیات نہیں ہوتی اور روح کو مفارقت بدن کے بعد (بھی) (ایک قسم کی) زندگی رہتی ہے۔ لیکن زندگی کے آثار بغیر بدن کے پورے طور پر ظاہر نہیں ہوتے۔ یہی وجہ ہے کہ اللہ تعالیٰ (قربانی) کے بارے میں فرماتے ہیں "قربانی کا گوشت اور خون اللہ کو نہیں پہنچتا۔ لیکن تمھاری پرہیزگاری کا جذبہ اس تک پہونچتا ہے۔" (جو کہ اصلی مقصود ہو لیکن یکوں کہ پرہیزگاری جو کہ قلبی انفاق کا نام ہے۔ بغیر ظاہری صورت کے کامل طور پر متحقق نہیں ہو سکتی۔ اس لیے ظاہری قربانی لازم آئی ورنہ اصل مقصود الٰہی تقویٰ و نیت ہی۔) اور (اسی وجہ سے) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ کہ " اعمال کا مدار نیتوں پر ہے' اور (اسی کی بنا پر) آنحضرت صلعم نے بہت سے مواضع میں اس شخص کو جس کی نیت صادق ہو۔ لیکن اس کو عمل کرنے سے کوئی چیز مانع ہو۔ اسے عمل کرنے والے کے ساتھ تشبیہ دی ہو۔ جیسے مسافر و مریض اگر ان کو صحت و اقامت کے وقت میں کسی وظیفہ کا التزام تھا۔ اور اب ان سے سفر و بیماری کی مجبوری کی وجہ سے وہ عمل نہیں ہو سکتا تو بدستور ان کے نامۂ اعمال میں وہ وظیفہ لکھا جاتا ہو۔ یا (اس شخص کی مثال ہو۔) جو اللہ کی راہ میں خرچ کرنے کا پختہ و مستحکم ارادہ رکھتا ہے۔ مگر وہ تنگ دستی کے سبب سے نہیں کر سکتا۔ (اپنی نیت کی بنا پر) وہ شخص خرچ کرنے والے کے برابر لکھا جائے گا۔ اور نیت سے ہماری مراد وہ معنی (مدعا و مقاصد) ہیں جو عمل کا (سبب اور باعث بنتے ہیں۔) اور عمل پر انسان کو برانگیختہ کرتے ہیں۔ جیسے کہ اللہ تعالیٰ نے مرسلین علیہم السلام کی زبانی اطاعت کرنے والوں کا جو ثواب اور نافرمانوں کا جو عذاب بتایا ہے اس کی تصدیق کرنی، یا خدا تعالیٰ کے امر و نہی کی بطیب خاطر بجا آوری سے خوش ہونا کہ انسان میں نیک اعمال کی طرف مبادرت کرنے کا ارادہ پیدا ہونے کی اصل یہی اسباب ہیں۔ انہی کی بنا پر نیکی کی خواہش اور بدی سے نفرت ہوتی ہے۔ اور اللہ تعالیٰ کے لیے امتثال امر پر خوشی حاصل ہونے کی عادت پیدا ہوتی ہے۔) (جو خالص نیت کی جڑ ہے) اسی وجہ سے (یعنی نیت کو صاف کرنے کی ضرورت

کی بنا پر) شارع علیہ السلام کو ریا وسمعہ (دکھاوا اور سنانا) سے روکنا پڑا اور ان کی برائیوں کو صاف طور پر بیان کرنا لازم ٹھہرا چنانچہ انہی وجوہات کی بنا پر (کہ اللہ کو خالص نیت مقبول ومنظور ہو۔ اور اعمال میں حقیقتاً نیت ہی مقصود ہو۔) ریا اور سمعہ کی برائی کے سلسلے میں رسول اللہ صلعم کا ارشاد گرامی ہے کہ لوگوں میں سے اول جن پر قیامت کے دن حکم کیا جائے گا۔ وہ تین شخص ہیں۔ ایک تو وہ شخص جو جہاد میں اس لیے شہید ہوا کہ لوگ اسے دلیر کہیں۔ دوسرا وہ شخص جس نے پڑھ کر علم دوسروں کو اس نیت سے سکھایا۔ تاکہ لوگ اس کو عالم بتائیں۔ تیسرا وہ شخص جو نیکی کے مصارف پر مال خرچ کرتا ہے۔ تاکہ لوگ اسے سخی کہیں۔ ایسے لوگوں کو ان کی فساد نیت کی وجہ سے جہنم میں ڈالے جانے کا حکم کیا جائے گا۔ اور پھر وہ چہروں کے بل دوزخ کی طرف گھسیٹے جائیں گے (ریا وسمعہ کی مذمت میں) دوسری وہ حدیث قدسی ہے۔ جس میں ارشاد باری ہے۔ میں سب شریکوں سے زیادہ بے پرواہ ہوں۔ جس آدمی نے میرے لیے کسی کو شریک کرکے کوئی کام کیا تو میں نے اس کو مع اسکے شریک کے (ناراض ہوکر) چھوڑ دیا۔

(اور نیات کی حقیقت کے بارے میں) جو حدیث ابی ذر رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلعم سے کہا گیا کہ آپ اس آدمی کے متعلق کیا فرماتے ہیں۔ جو نیک عمل کرتا ہے اور لوگ اس پر اسکی تعریف کرتے ہیں۔ آپنے ارشاد فرمایا، ایمان والے کی یہ پہلی نشانی ہے۔"

اس حدیث کا مطلب یہ ہے کہ جو شخص صرف اللہ کے لیے عمل کرتا ہے اور اس کا مقصد نمود ونمائش یا کوئی خواہش نہیں ہوتی۔ زمین پر اس کے لیے قبولیت (اللہ رب العزت ملاء اعلیٰ اور حظیرۃ القدس کی رضامندی کی وجہ سے) نازل ہوتی ہے۔ اور لوگ اس سے محبت کرنے لگتے ہیں۔ اور حضرت ابی ہریرہ کی حدیث ہے (جس میں ابی ہریرہ کہتے ہیں کہ) میں نے عرض کیا یا رسول اللہ صلعم میں اپنے گھر میں اپنی جائے نماز پر بیٹھا تھا کہ اسی اثنا میں ایک آدمی میرے پاس (غیر متوقع طور پر) آ گیا۔ میری طبیعت اس

بات پر خوشی ہوئی کہ اس شخص نے مجھے اس (عبادت کی) حالت میں دیکھا (یا رسول اللہ کیا یہ عجب قبیح تو نہیں) آپ نے فرمایا۔ اے ابا ہریرۃ! تجھ پر اللہ کی رحمت! تیرے لئے دو اجر ہیں۔ ایک پوشیدگی کا اور ایک ظاہر کا۔ اس حدیث کا مطلب یہ ہو کہ عجب (نفسانی جو قبیح ہو) مغلوب ہوا ور صرف عجب نفسانی عمل کا باعث وسبب نہ ہوا ہو۔ (کہ اعمال میں نیت مقدم ہو۔ یعنی اگر نیت شہرت پر خوشی ہونے کی نہ تھی۔ بلکہ صرف اللہ رب العزت کے لیے کام کیا گیا تھا۔ اور بعد میں لوگوں کو معلوم ہوا۔ اور فطرۃً اپنی اس اچھی حالت پر خوشی حاصل ہوئی۔ تو یہ برا نہیں کہ برائی تو اس وقت ہے جب مقصد ہی نیک اعمال سے شہرت طلبی ہو۔) اجرالسر (پوشیدگی کے اجر) سے اخلاص کا ثواب مراد ہو کہ اخلاص ایک پوشیدہ چیز ہی تو ہو۔ اور اجر العلانیہ (اجر ظاہر) سے مراد یہ ہے۔ کہ اللہ کے دین کے بلند کرنے اور سنت راشدہ کی اشاعت کا اجر تجھے ملے گا (کہ اس شخص نے اس حالت میں دیکھ کر یہ معلوم کرلیا ہوگا۔ کہ اللہ والے خلوت وجلوت ظاہر و باطن میں اسی کے ساتھ مشغول رہتے ہیں۔ جو ممکن ہے اس کی اصلاح کا سبب بھی بن جائے۔ اور اگر یہ نہ ہو تو کم از کم اعلان خیر تو ہو ہی گیا۔ جو مقصد ہو۔)

شاہ صاحب قدس سرہ کے مندرجہ بالا مباحث سے یہ حقیقت اچھی واضح ہوجاتی ہو کہ اعمال پر نیت کی ہی روح کلیتاً ساری وطاری ہو۔ اور 'نیت' نے عمل کو نور وظلمت کے جس رنگ میں رنگ دیا ہے۔ افشائے راز کے دن اعمال انھی نیات کے رنگین لبادوں میں ظاہر ہوں گے۔ فاسد نیتوں والے خفاء (پوشیدگی) کے اس اظہار واعلان کے بعد اپنی خبث باطن اور برے کرتوتوں کو چھپانے کی کوئی راہ نہ پائیں گے۔ اور دائمی خسارے اور ٹوٹے میں پڑجائیں گے۔

یوم تبلی السرائر فما لہ من قوۃ ولا ناصر (الطارق - ۱۰)

جس روز سب کی قلعی کھل جائے گی۔ پھر اس انسان کو نہ تو خود (مدافعت) کی قوت ہوگی نہ اس کا کوئی حمایتی ہوگا۔ (ترجمہ مولانا تھانویؒ)

اور جنھوں نے اپنے نیتوں کے سرچشمے کو ہر قسم کی آلائش اور باطنی گندگی سے پاک وصاف رکھا ہوگا۔

اور اپنی نگاہیں۔ ذات قدوس پر جما کر اپنی نیات کا مقصد و محور اسی کو قرار دیا ہوگا۔ ان کے اعمال کی ستھرائی اور پاکی ان صاف شفاف موتی کے دانوں کی طرح ہوگی جن کا ظاہر و باطن اپنی جاذبیت اور حسن و خوبی کی بنا پر دیکھنے والوں کی نگاہیں خیرہ کر رہا ہوگا۔ اور وہ فرحاں و خنداں اپنے اعمال نامے اس ہنگامہ دار و گیر میں انتہائے انبساط اور کمال طمانیت سے لوگوں کو دکھاتے پھریں گے اور پھر سرمدی فوز و کامرانی سے ہمکنار ہو جائیں گے۔

يَوْمَئِذٍ تُعْرَضُونَ لَا تَخْفَىٰ مِنكُمْ خَافِيَةٌ ۔ فَأَمَّا مَنْ أُوتِيَ كِتَابَهُ بِيَمِينِهِ فَيَقُولُ هَاؤُمُ اقْرَءُوا كِتَابِيَهْ ۔ إِنِّي ظَنَنتُ أَنِّي مُلَاقٍ حِسَابِيَهْ ۔ فَهُوَ فِي عِيشَةٍ رَّاضِيَةٍ ۔ فِي جَنَّةٍ عَالِيَةٍ ۔ قُطُوفُهَا دَانِيَةٌ ۔ كُلُوا وَاشْرَبُوا هَنِيئًا بِمَا أَسْلَفْتُمْ فِي الْأَيَّامِ الْخَالِيَةِ ۔ (الحاقۃ۔ ۱)

اس دن سامنے کیے جاؤ گے۔ چھپی نہ رہے گی تمہاری کوئی چھپی بات۔ سو جس کو ملا اس کا لکھا داہنے ہاتھ میں وہ کہتا ہے۔ لیجیو پڑھو میرا لکھا۔ (اعمالنامہ) میں نے خیال رکھا اس بات کا کہ مجھ کو ملے گا میرا حساب سو وہ ہے من مانتے گزران میں اونچے باغ میں۔ جس کے میوے جھکے پڑے ہیں۔ کھاؤ اور پیو۔ بدلہ اس کا جو آگے بھیج چکے ہو۔ تم پہلے دنوں میں۔ (ترجمہ شیخ الہند قدس سرہٗ)

دوسری جگہ ارشاد ہے:۔

إِنَّكُمْ لَذَائِقُو الْعَذَابِ الْأَلِيمِ ۔ وَمَا تُجْزَوْنَ إِلَّا مَا كُنتُمْ تَعْمَلُونَ ۔ إِلَّا عِبَادَ اللَّهِ الْمُخْلَصِينَ ۔ أُولَٰئِكَ لَهُمْ رِزْقٌ مَّعْلُومٌ فَوَاكِهُ ج وَهُم مُّكْرَمُونَ ۔ فِي جَنَّاتِ النَّعِيمِ ۔ عَلَىٰ سُرُرٍ مُّتَقَابِلِينَ ۔ يُطَافُ عَلَيْهِم بِكَأْسٍ مِّن مَّعِينٍ ۔ بَيْضَاءَ لَذَّةٍ لِّلشَّارِبِينَ ج لَا فِيهَا غَوْلٌ وَلَا هُمْ عَنْهَا يُنزَفُونَ ۔ وَعِندَهُمْ قَاصِرَاتُ الطَّرْفِ عِينٌ ۔ كَأَنَّهُنَّ بَيْضٌ مَّكْنُونٌ ۔ (والصّٰفّٰت۔ ۲)

بے شک تم کو چکھنا ہے۔ عذاب دردناک اور وہی بدلہ پاؤ گے جو کچھ تم کرتے تھے۔ مگر جو بندے

اللہ کے ہیں چنے ہوئے۔ وہ لوگ جو ہیں۔ ان کے واسطے روزی ہے مقدر، میوے
اور ان کی عزت ہو۔ نعمت کے باغوں میں تختوں پر ایک دوسرے کے سامنے۔
لوگ لیے پھرتے ہیں۔ ان کے پاس پیالہ شرابِ صاف کا سفید رنگ، مزہ
دینے والی پینے والوں کو، نہ اس میں سر پھرتا ہے۔ اور نہ وہ اس کو پی کر بہکیں
اور ان کے پاس ہیں عورتیں نیچی نگاہ رکھنے والیاں۔ بڑی آنکھوں والیاں
گویا وہ انڈے ہیں چھپے دھرے۔ (ترجمہ شیخ الہند)

سورہ الحاقہ کی مذکورہ بالا آیتوں میں لا تخفیٰ منکم خافیہ کے الفاظ سے گویا اس طرف
اشارہ پایا جارہا ہے کہ جن خوش نصیبوں کو داہنے ہاتھ میں اعمالنامے دے کر لذیذ برکات
وانعامات سے نوازا جائے گا۔ ان کی چھپی باتیں، ان کا اندرون باطن جس وقت روز روشن
کی طرح عیاں ہو جائیں گے۔ تو ان کا اخلاص اور صدق باطن ہی ہوگا۔ جو ان کے اس
اعزاز و اکرام کا باعث ہوگا کہ بغیر اندرون کی سچائی کے کوئی عمل قابل التفات نہیں ——
(واللہ اعلم)، اسی طرح سورہ والصفت کی نقل کردہ آیتوں میں اخروی فوز و کامرانی کے
سزادار وہی چنے ہوئے بندے (مخلصین) ہیں جن کے دل میں اخلاص رچ چکا ہے کہ
اللہ رب العزت کے ہاں ہر نیکی کی قبولیت کی شرط اول اخلاص ہے بلکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم
نے تو اخلاص کی اسی اہمیت کے پیش نظر پورے دین کو ہی اخلاص کا مترادف قرار دیا ہے۔
—— کہ جو طریقۂ زندگی رحمۃ للعلمین صلے اللہ علیہ وسلم کے توسط سے عالم میں بھیجا گیا۔ وہ
اپنے قلبی و روحانی نور سے ہی اجساد و اجسام کو منور بنا کر عالم کو بقعۂ نور بنانے والا ہے۔
یہ قلب و باطن کی صفائی و پاکیزگی سچائی و اخلاص ہی ہے۔ جو انسان کے اعضاء و جوارح میں
خالق کائنات کے اوامر کی قبولیت پیدا کر کے اسے ملاء اعلیٰ کے فیضان قبول کرنے کے قابل
بنانے اور رضا و قرب کی انتہائی منازل تک پہنچانے کا عادی سبب ہے۔

زبان نبوت شہادت دیتی ہے کہ

سن لو! بدن میں گوشت کا ایک ٹکڑا ہے۔ جب وہ درست ہوا تو سارا جسم درست
ہوا جب وہ بگڑا تو تمام جسم بگڑا اور جان رکھو کہ وہ دل ہے۔ (بخاری و مسلم)

الغرض ہادیٔ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم والی زندگی سراپا دل ہی دل تو ہے۔ جس کے منور ہونے میں کاشانۂ عالم کی روشنی اور جس کے بجھنے میں کرۂ ارضی کی تاریکی و ظلمت مضمر ہو قلوب کی اس زندگی کا نور صدق و اخلاص کا ہی وہ عمیق جذبہ ہو جو انسان کو ایقان و عرفان کی دولت سے سرفراز کر کے بارگاہ قدس کی نزدیکی کا سبب بنتا ہے۔ قرب الٰہی کا زینہ نبوی زندگی کی کلید، اخروی فوز و فلاح کا سبب دنیاوی کامیابی کا راز صرف اخلاص ہی تو ہے۔ جس کی عمومیت عالم کو گہوارۂ رحمت اور انسان کو فرشتہ بنا سکتی ہے۔ جس خوش نصیب کو یہ دولت ہاتھ آگئی فوز و کامرانی کے انتہائی مدارج پر جا پہنچا۔ یہی وجہ ہو کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم والی زندگی کی تشکیل میں حسن نیت و اخلاص کو اس قدر اہمیت دی گئی ہے۔ قدم قدم پر اپنی نیتوں کی نگرانی اور قلبی کیفیتوں کی دیکھ بھال کو ضروری قرار دیا گیا ہے۔ آج جب کہ نبوی زندگی کی تشکیل ہماری زندگیوں میں عمومی طور سے ٹوٹ چکی ہے۔ اس مبارک زندگی کی طرف عود اور اس کی عمومیت بھی نیتوں کی اصلاح اور اخلاص پر موقوف ہے کہ علیم و خبیر آقا کی بارگاہ قدس سے جو ملتا ہے۔ قلوب کی کیفیتوں کو ہی (عادتاً) دیکھ کر ملتا ہے۔ پس جس قدر دلوں کے آئینے صدق و اخلاص سے روشن ہوں گے اسی قدر عالم قدس کا فیضان نصیب ہو کر نبوی زندگی کی راہیں کھلیں گی، اور ظاہر و باطن "حقیقت محمدی" سے مستفیض ہوتا چلا جائے گا، کہ کونین کا حاصل حضور صلی اللہ علیہ وسلم والی زندگی ہی تو ہے۔ جس کی ایک ادا بھی جان جا کر بھی نصیب ہو جائے۔ تو خدا کی قسم کامیابی ہی کامیابی ہے۔

(ختم شد)

افاداتِ علامہ ابن جوزیؒ

(سید ابوالحسن علی حسنی، ندوی)

علامہ ابن جوزیؒ (م ۵۹۷ھ) چھٹی صدی ہجری کے مشہور واعظ و مصلح، سحر بیان خطیب، محدث و مفسر اور یگانۂ روزگار مصنف تھے ان کی کتابوں میں ایک کتاب صید الخاطر ہے جس کی حیثیت ایک بیاض کی ہے۔ یہاں قارئین 'الفرقان' کی ضیافت طبع اور علمی و دینی فائدے کے لیے اس کے کچھ اقتباسات و مضامین پیش کیے جاتے ہیں، امید ہو کہ دلچسپی سے پڑھے جائیں گے۔

صید الخاطر صید الخاطر ایک کشکول ہے جس میں مصنف نے اپنے قلبی تاثرات، بے تکلف خیالات، زندگی کے تجربات اور منتشر افکار و حوادث قلمبند کیے ہیں، اور اپنی بہت سی کمزوریوں اور غلطیوں کا بے تکلف اعتراف کیا ہو، اسی کتاب میں جا بجا نفس سے مکالمے، سوال و جواب، ذہنی کشمکش کی روداد، معاشرتی زندگی کے تجربے، عورتوں، نوکروں، اور دوستوں کے متعلق تجربہ کی باتیں اور مفید ہدایات، روزمرہ کے واقعات کی تحلیل، امراض نفسانی کا بیان، مختلف طبقات پر تنقید، نفس کا احتساب اور صدہا کام کی باتیں ہیں اس کتاب کی ایک بڑی خصوصیت صداقت اور سادگی و بے تکلفی ہے، پوری کتاب اپنے زمانہ کے ادباء اور مصنفین کے طرز کے خلاف نہایت رواں و بے تکلف عبارت میں لکھی گئی ہے، اور اپنے موضوع پر غالباً ایک عبقری عالم و مصنف کی پہلی کتاب ہو۔

عام واقعات سے بڑے بڑے نتائج ابن جوزی اس کتاب میں چھوٹے چھوٹے واقعات اور روزمرہ کے مشاہدات سے بڑے بڑے نتائج نکالتے ہیں

اور یہی ایک عامی اور ایک صاحب نظر میں فرق ہے۔

ایک جگہ لکھتے ہیں:۔

"میں نے دو مزدوروں کو دیکھا کہ ایک بھاری شہتیر اٹھا کر لے جا رہے ہیں اور دونوں کچھ گا رہے ہیں، ایک ایک مصرعہ پڑھتا ہے دوسرا ترنم کے ساتھ اس کا جواب دیتا ہے، ایک پڑھتا ہے تو دوسرا کان لگا کر سنتا ہے، پھر دوسرا اس کو دہراتا ہے یا اسی طرح کے مصرعہ سے جواب دیتا ہے، مجھے خیال ہوا کہ اگر وہ ایسا نہ کریں تو انکو محنت اور بوجھ کا احساس زیادہ ہو، لیکن اس ترکیب سے انکا کام آسان ہو جاتا ہے۔ میں نے غور کیا تو معلوم ہوا کہ اس کا سبب یہ ہو کہ ذہن اتنی دیر دوسرے کام میں لگ کر ستا لیتا ہے اور کچھ سرور حاصل کر لیتا ہے اور جواب کی فکر میں مشغول ہو کر اسمیں تازگی پیدا ہو جاتی ہے اور اس طرح راستہ طے ہو جاتا ہے اور بوجھ کے احساس سے غفلت ہو جاتی ہے، اس سے میرا ذہن اس طرف منتقل ہوا کہ انسان نے شرعی ذمہ داریوں اور فرائض کا بڑا بوجھ اٹھا رکھا ہے، اور سب سے بڑا بوجھ اپنے نفس کی سیاست ہے، بڑا کام یہ ہو کہ اسکو اس کے مرغوبات سے روکا جائے، اور جن چیزوں سے اس کو رغبت نہیں ان پر اس کو قائم رکھا جائے۔ میں نے یہ نتیجہ نکالا کہ صبر کے راستہ کو تسلی اور نفس کی جائز دلداری کی مدد سے قطع کیا جائے جیسا کسی شاعر نے کہا ہو کہ "رات بھر چلنے سے سواریاں تھک جائیں اور فریاد کریں تو صبح کی روشنی کی امید دلاؤ اور دن چڑھے آرام کرنے کا وعدہ کر لو"۔ اسی طرح کی ایک حکایت بشر حافی سے منقول ہے کہ وہ اور ان کے ایک ساتھی کہیں جا رہے تھے ساتھی کو پیاس لگی، اس نے کہا کہ اس کنویں سے پانی پی لیں، بشر نے کہا کہ اگلے کنویں سے پئیں گے۔ جب وہ کنواں آیا تو بشر نے آگے کے کنویں کیطرف اشارہ کیا کہ وہاں تک صبر کرو، اسی طرح وہ اس کو تسلی دیتے ہوئے بہت دور لے آئے، پھر اس سے کہا کہ اسی طرح دنیا کا سفر طے ہو جاتا ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ جس نے اس نکتہ کو سمجھ لیا وہ اپنے نفس کو بہلائے گا اور اس کی دلجوئی کرے گا اور اس سے وعدہ کرتا رہے گا

تاکہ وہ اپنے بوجھ کو سنبھال سکے اور اس پر صبر کرے، بعض بزرگان سلف فرماتے تھے کہ اے نفس میں تجھے تیری مرغوب چیز سے جو روکتا ہوں تو محض شفقت اور خوف کی بنا پر۔ بایزید بسطامی کا قول ہو کہ میں اپنے نفس کو خدا کی طرف بڑھائے لے جاتا اور وہ روتا ہوتا تھا، پھر رفتہ رفتہ ہنستا کھیلتا اللہ کی طرف بڑھنے لگا، یاد رکھنا چاہیے کہ نفس کی خاطرداری اور ملاطفت ضروری ہو اور راستہ اسی طرح طے ہوتا ہے۔" ؎

ایک دوسری جگہ لکھتے ہیں:۔

"میں نے دیکھا ہے کہ شکاری کتے جب محلہ کے کتوں کے پاس سے گزرتے ہیں تو محلہ کے کتے تو ان کو بھونکتے ہیں، اور بہت شور مچاتے ہیں اور ان کے پیچھے دوڑتے ہیں وہ دیکھتے ہیں کہ ان کتوں کی بڑی عزت ہے ان پر جھول پڑی ہے تو ان کو ان پر حسد آتا ہے، لیکن اس کے برخلاف شکاری کتے ان کی طرف توجہ ہی نہیں کرتے اور ان کو خاطر میں نہیں لاتے اور ان کے بھونکنے کی کچھ پرواہ نہیں کرتے، اس سے ایسا معلوم ہوا کہ شکاری کتے گویا ان کتوں کی قوم ہی میں سے نہیں ہیں، اس لیے کہ مقامی کتے، موٹے موٹے بدن اور بھدے اعضا کے ہیں، ان میں امانت کی صفت نہیں، لیکن شکاری کتے نازک اور پھرتیلے ہیں اور جیسا ان کا بدن نازک اور پھرتیلا ہو اسی طرح انکی عادات مہذب ہیں وہ جب شکار کرتے ہیں تو کیا مجال کہ اس کو منہ لگائیں، مالک کے ڈر سے یا اسکے احسانات کے شکریہ میں وہ اس شکار کو جوں کا توں پہونچا دیتے ہیں اس سے ایک بات تو میں یہ سمجھا کہ بدن اور اخلاق میں خاص مناسبت ہوتی ہے۔ اگر وہ لطیف ہو تو یہ بھی لطیف ہو، دوسرے یہ معلوم ہوا کہ آدمی کو اس پر حسد نہیں آتا جس کو وہ اپنے طبقہ یا اپنی سطح کا نہیں سمجھتا، اسی طرح جس کو اللہ تعالیٰ ایمان و عقل کی دولت سے سرفراز کرے اس کو اپنے اس حاسد پر حسد نہیں ہوتا جو ایمان و عقل سے محروم ہو اور وہ اس کو قابل التفات نہیں سمجھتا

؎ صید الخاطر ص ۷۵-۷۶

اس لیے کہ وہ دوسرے عالم میں ہے اور یہ دوسرے عالم میں وہ دنیا کی بنا پر حسد کرتا ہو اور اس کا مطمح نظر آخرت ہو اور دونوں میں بعد المشرقین ہے۔" [1]

واقعات زندگی اور نفس سے مکالمہ

وہ واقعات کی پوری تحلیل کرتے ہیں، اور خود اپنی زندگی کے واقعات میں نفس سے حکیمانہ مکالمہ کرتے ہیں، ایک مرتبہ انھوں نے دعا کی، ایک دوسرے صالح بزرگ دعا میں شریک تھے، دعا قبول ہوئی، لیکن کس کی دعا قبول ہوئی؟ اس پر ان کا اپنے نفس سے مکالمہ ہوا۔

"مجھے ایک مرتبہ ایک ایسا معاملہ پیش آیا جس میں اللہ سے مانگنے اور دعا کی ضرورت تھی میں نے دعا کی اور اللہ سے سوال کیا، ایک صاحب صلاح و اہل خیر بھی میرے ساتھ دعا میں شریک ہوگئے، میں نے قبولیت کے کچھ آثار دیکھے، میرے نفس نے کہا کہ یہ اس بزرگ کی دعا کا نتیجہ ہے، تمہاری کا نتیجہ نہیں، میں نے کہا کہ مجھے اپنے ایسے گناہوں اور کوتاہیوں کا علم ہے جن کی وجہ سے واقعی مجھے اس کا حق نہیں کہ میری دعا قبول ہو لیکن کیا تعجب ہو کہ میری ہی دعا قبول ہوئی ہو اس لیے کہ یہ مرد صالح ان گناہوں اور تقصیرات سے محفوظ ہے جن کا مجھے اپنے متعلق علم ہے، لیکن مجھ میں اور ان میں ایک فرق ہے، مجھے اپنی تقصیر کی بنا پر دل شکستگی اور ندامت ہے اور اس کو اپنے معاملہ پر فرحت و سرور ہے۔ اور کبھی اعتراف تقصیر ایسی ضرورتوں کے موقع پر زیادہ کارآمد اور موثر ہوتا ہے، اور ایک بات میں ہم اور وہ مساوی ہیں وہ یہ کہ ہم دونوں میں سے کوئی اپنے اعمال کی بنا پر فضل کا طالب نہیں، تو اگر میں ٹوٹے ہوئے دل کے ساتھ ندامت سے گردن جھکا کر اور اپنے گناہوں کا اعتراف کرتے ہوئے کہوں کہ خدایا مجھے محض اپنے فضل سے عطا فرما میں بالکل خالی ہاتھ ہوں تو مجھے امید ہے کہ میری سن لی جائے گی، اور ممکن ہے کہ اسکی نظر اپنے حسن عمل پر پڑے اور یہ اس کے لیے رکاوٹ بن جائے تو اے میرے نفس میرا دل زیادہ نہ توڑ وہ پہلے ہی بہت ٹوٹا ہوا ہے، مجھے اپنے حالات کا ایسا علم ہے جس کا تقاضا ادب اور تواضع ہے پھر اپنی تقصیروں کا اقرار ہے، جس چیز کا میں نے

[1] صفحہ ۳۸۷

سوال کیا ہے اس کا بیحد محتاج ہوں اور جس سے سوال کیا ہے اس کے فضل کا یقین ہے اور یہ سب باتیں اس عابد کو حاصل نہیں تو اللہ اکی عبادت میں برکت کرے میرا تو اعتراف تقصیر بڑے کام کی چیز ہے [1]

ایک جگہ لکھتے ہیں :۔

ایک مرتبہ ایک ایسے معاملہ میں جو شرعاً مکروہ تھا مجھے کچھ کش مکش درپیش تھی نفس کچھ تاویلیں سامنے لاتا تھا اور کراہت کو نظر سے ہٹاتا تھا، اور درحقیقت اس کی تاویلات فاسد تھیں اور کراہت کی کھلی ہوئی دلیل موجود تھی، میں نے اللہ کی طرف رجوع کیا اور دعا کی کہ اس کیفیت کو دور فرمادے اور قرآن مجید کی تلاوت شروع کی میرے درس کے سلسلہ میں سورۂ یوسفؑ شروع ہو رہی تھی میں نے وہیں سے شروع کیا، وہ خیال دل پر مستولی تھا مجھے کچھ خبر نہ ہوئی کہ میں نے کیا پڑھا، جب اس آیت پر پہونچا قال معاذ اللہ انه ربي احسن مثواى تو میں چونکا اور مجھے ایسا معلوم ہوا کہ گویا میں ہی اس آیت کا مخاطب ہوں، مجھے دفعتاً ہوش آیا اور آنکھوں سے غفلت کا پردہ دور ہوا میں نے اپنے نفس سے کہا" تونے خیال کیا؟ حضرت یوسف آزاد تھے وہ زبردستی اور ظلم سے غلام بنا کر بھیجے گئے انھوں نے اس شخص کا اتنا حق مانا جس نے ان کے ساتھ سلوک کیا تھا، اور اس کو اپنا آقا کہا حالاں کہ نہ وہ غلام تھے نہ ان کا کوئی آقا تھا پھر اپنی اس حق شناسی کی وجہ بیان کی کہ احسن مثوای مجھے اچھی طرح سے رکھا، اب ذرا اپنے اوپر غور کر تو حقیقتاً غلام ہے ایسے آقا کا جو تیرے وجود کے وقت سے برابر تیرے ساتھ احسانات کرتا رہا اور اتنے بار اس نے تیری پردہ پوشی کی جن کا کوئی شمار نہیں، تجھے یاد نہیں کہ اس نے کس طرح تیری پرورش کی، تجھے سکھایا، پڑھایا، تجھے روزی دی، تیری حفاظت کی، خیر کے اسباب مہیا کیے، بہترین راستہ پر تجھے ڈالا، اور ہر کر دشمنی سے تجھے بچایا، اور حسن صورت ظاہری کے ساتھ باطنی ذکاوت وجودت طبع عنایت فرمائی علوم کو تیرے لیے سہل بنا دیا، یہاں تک کہ مختصر سے عرصہ میں تجھے وہ علوم حاصل

[1] ص ۳-۸۴

ہوئے جو دوسروں کو طویل عرصہ میں نصیب نہیں ہوئے، تیری زبان پر علوم کو رواں کیا اور فصاحت وبلاغت کے ساتھ انکی تعبیر کی قوت عطا فرمائی اور مخلوق سے تیرے عیوب کو چھپایا ان کا معاملہ تیرے ساتھ حسن ظن کا رہا، تیرا رزق بغیر اہتمام اور تکلف کے تجھ تک پہونچایا اور کسی کا احسان مند نہیں بنایا اور وہ بھی فراغت واطمینان وکشائش کے ساتھ، بخدا میری سمجھ میں نہیں آتا کہ اس کے کس کس احسان کا تذکرہ کیا جائے حسن صورت کا، یا صحت اعضا کا، یا سلامت مزاج یا اعتدال ترکیب کا یا لطافت طبع اور دنائت وابتذال سے بری ہونے کا، یا بچپن ہی سے سیدھے اور معتدل راستہ کی توفیق کا، یا بے حیائیوں اور لغزشوں سے حفاظت کا، یا منقولات کی ترجیح اور حدیث وسنت کے اتباع اور تقلید جامد سے نجات کا، یا مبتدع کی پیروی اور اس کے سلسلہ میں شمولیت سے محفوظ رہنے کا (وان تعدوا نعمة الله لا تحصوها) کتنے دشمنوں نے تیرے لیے جال بچھایا اور اللہ نے اس سے بچایا، کتنے مخالفوں نے تجھ کو سبک کرنا چاہا اور اس نے تجھے سربلندی عطا فرمائی، کتنی نعمتوں سے دوسرے محروم رہے اور تو ان سے سیراب کیا گیا، کتنے آدمی دنیا سے نامراد چلے گئے اور تو شاد کام اور فائز المرام ہو، اس حالت میں تیرے دن گذر رہے ہیں کہ تیرا جسم صحیح سالم، دین محفوظ، علم روز افزوں دلی مقاصد پورے، اگر کوئی مقصد بر نہیں آتا تو اس کی طرف سے صبر پیدا کر دیا جاتا ہے اور تجھے معلوم ہوتا ہے کہ اس کے پورا نہ ہونے ہی میں حکمت الٰہی تھی یہانتک کہ تجھے یقین آجاتا ہے کہ یہی تیرے حق میں بہتر تھا، اگر میں پچھلے احسانات کو گنانا شروع کروں تو دفتر کے دفتر سیاہ ہوجائیں اور وہ ختم نہ ہوں اور تجھے معلوم ہے کہ جن احسانات کا تذکرہ میں نے نہیں کیا ہے وہ ان سے کہیں زیادہ ہیں، اور جن کا ذکر میں نے کیا ہے ان کی طرف بھی میں نے صرف اشارہ کیا ہے۔ اس سب کے ساتھ تجھ کو ایسا فعل کرنا کیسے زیب دیتا ہے جو اس کی مرضی کے خلاف ہے معاذ اللہ انہ ربی احسن مثوای انہ لا یفلح الظالمون۔ [1]

---

[1] ص ۱۶۲-۱۶۳

ایک دوسری جگہ لکھتے ہیں :-

میں نے ایک مرتبہ ایک ایسے مسئلہ پر عمل کیا جس کی بعض مذاہب (فقہیہ) میں گنجائش تھی اور دوسرے مذاہب میں وہ جائز نہ تھا، اس پر عمل کرنے سے مجھے اپنے قلب میں بڑی قساوت محسوس ہوئی اور ایسا معلوم ہوا کہ گویا میں راندۂ درگاہ اور معتوب ہو گیا اور کچھ محرومی اور گہری تاریکی محسوس ہوئی، میرے نفس نے کہا کہ یہ کیا بات ہے، تم تو دائرہ فقہاء سے نکلے نہیں میں نے کہا کہ اے نفس بد! تیرے سوال کا جواب دو طرح سے ہے، اول تو یہ کہ تو نے اپنے عقیدہ کے خلاف تاویل کی، اگر خود تجھ سے فتویٰ لیا جاتا تو تو اس کا فتویٰ نہ دیتا، اس نے کہا کہ اگر میں اس کے جواز کا قائل نہ ہوتا تو کرتا کیوں؟ میں نے کہا کہ تو اپنے اس خیال کو دوسرے کے لیے بھی فتویٰ کے طور پر پسند نہیں کرتا، دوسری بات یہ ہے کہ تجھے ظلمت کے اس احساس پر خوش ہونا چاہیئے اس لیے کہ اگر تیرے دل میں نور نہ ہوتا تو تجھ پر اثر ہی نہ پڑتا، اس نے کہا کہ بہر حال مجھے اس ظلمت سے جو پلٹ پلٹ کر آتی ہے وحشت ہے، میں نے کہا کہ پھر اس فعل کے ترک کا عزم کرے اور فرض کرے کہ تو نے جس کو ترک کیا ہے وہ بالاجماع جائز ہو تب بھی بربنائے ورع و تقویٰ اس کو چھوڑنے کا وعدہ کر، چنانچہ اس عمل سے اس کیفیت سے اس کو نجات ملی[1]

سلف صالحین کے حالات کے مطالعہ کی ضرورت

وہ باوجود محدث و فقیہ ہونے کے اس حقیقت سے بے خبر نہ تھے کہ قلب کی اصلاح اور ذوق و شوق پیدا کرنے کے لیے موثر واقعات اور سلف صالحین کے حالات کے مطالعہ کی ضرورت ہے، تلبیس ابلیس اور صید الخاطر دونوں میں فقہاء و محدثین اور طلبہ و علماء کو وہ اس کا مشورہ دیتے ہیں اور اپنا تجربہ بیان کرتے ہیں، صید الخاطر میں ایک جگہ لکھتے ہیں :-

میں نے دیکھا کہ فقہ اور سماع حدیث میں انہماک و مشغولیت قلب میں صلاحیت پیدا کرنے کے لیے کافی نہیں، اس کی تدبیر یہی ہے کہ اس کے ساتھ موثر واقعات اور

---

[1] ص ۱۳۳

سلف صالحین کے حالات کا مطالعہ بھی شامل کیا جائے، حلال و حرام کا خالی علم قلب میں رقت پیدا کرنے کے لیے کچھ زیادہ سودمند نہیں، قلوب میں رقت پیدا ہوتی ہے، موثر احادیث و حکایات سے اور سلف صالحین کے حالات سے اس لیے کہ ان نقول و روایات کا جو مقصود ہے وہ ان کو حاصل تھا، احکام پر ان کا عمل شکلی اور ظاہری نہ تھا، بلکہ ان کو انکا اصلی ذوق اور لب لباب حاصل تھا، اور یہ جو میں تم سے کہہ رہا ہوں وہ عملی تجربہ اور خود آزمائش کرنے کے بعد، میں نے دیکھا ہے کہ عموماً محدثین اور طلبہ فن حدیث کی ساری توجہ اونچی سند کی حدیث اور کثرت مرویات کی طرف ہوتی ہو اسی طرح عام فقہاء کی تمامتر توجہ جدلیات اور حریف کو زیر کرنے والے علم کی طرف ہوتی ہے، بھلا ان چیزوں کے ساتھ قلب میں کیا گداز اور رقت پیدا ہو سکتی ہے، سلف کی ایک جماعت کسی نیک اور بزرگ شخص سے محض اس کے طور طریقہ کو دیکھنے کے لیے ملنے جاتی تھی، علم کے استفادہ کے لیے نہیں اسلیے کہ یہ طور طریقہ اس کے علم کا اصلی پھل تھا، اس نکتہ کو اچھی طرح سمجھ لو اور فقہ و حدیث کی تحصیل میں سلف صالحین اور زہاد امت کی سیرت کا مطالعہ ضرور شامل کرو تاکہ اس سے تمھارے دل میں رقت پیدا ہو۔[1]

صلحاء امت کی سیرت

ابن جوزی نے اسی غرض کے لیے سلف صالحین اور صلحاء امت میں سے بہت سے متقدمین اور مشاہیر کی مستقل سیرتیں لکھی ہیں، مثلاً حضرت حسن بصری، سید نا عمر بن عبد العزیز، حضرت سفیان ثوری، حضرت ابراہیم بن ادھم، حضرت بشر حافی، امام احمد بن حنبل، حضرت معروف کرخی[2] ان مستقل تذکروں کے علاوہ ایک جامع تذکرہ صفۃ الصفوۃ لکھا جو چار جلدوں میں ہے، یہ دراصل ابو نعیم اصبہانی کی مشہور کتاب حلیۃ الاولیاء کی تہذیب و تنقیح ہے جس کو ابن جوزی نے مناسب حذف و اضافہ اور تلخیص کے ساتھ محدثانہ و مورخانہ طرز پر مرتب کیا ہے۔ اس کتاب میں جو حالات و واقعات آئے ہیں وہ موثر دل گداز ہونے کے ساتھ ساتھ تاریخی حیثیت سے مستند بھی ہیں اور مبالغہ آمیز روایات اور حشو و زوائد سے پاک ہیں۔

---

[1] صفحہ ۱۷۴، ۱۷۵ [2] اپنی ان مستقل تالیفات کا تذکرہ انھوں نے خود صید الخاطر میں کیا ہو ملاحظہ ہو صفحہ ۱۷۵ ان میں سے دو اول الذکر چھپ چکی ہیں۔

تاریخ کی اہمیت

ابن جوزی علوم دینیہ میں اشتغال اور فقہ وحدیث میں کمال کیساتھ ساتھ فن تاریخ کی اہمیت وضرورت کے بھی بڑے قائل اور اسکی تعلیم کے مبلغ ہیں۔ ان کے نزدیک تاریخ سے ناواقفیت کی بنا پر علماء وفقہاء سے اپنی کتابوں میں بعض بڑی افسوس ناک فروگزاشتیں ہوئی ہیں جو ان کے منصب اور علم وفضل کے شایان شان نہیں، اس لیے وہ طالب علم کو مشورہ دیتے ہیں کہ ہر فن سے فی الجملہ واقف ہو اور تاریخ سے اتنی واقفیت رکھتا ہو کہ کوئی بڑی تاریخی غلطی نہ کر بیٹھے جو اس کی خفت کی باعث ہو، صید الخاطر میں لکھتے ہیں:۔

"فقیہ کو چاہیے کہ ہر فن کے ضروری حصہ سے واقف ہو، تاریخ ہو یا حدیث لغت ہو یا دوسرا فن، اس لیے کہ فقہ تمام علوم کا محتاج ہے اسلئے ہر فن کے ضروری حصہ سے اس کو واقف ہونا چاہیئے، میں نے بعض فقہا کو کہتے سنا ہے کہ شیخ شبلیؒ اور قاضی شریک ایک مجلس میں جمع ہوئے، مجھے سن کر تعجب ہوا کہ اس کو دونوں بزرگوں کے زمانہ کا فاصلہ نہیں معلوم! ایک عالم نے ایک مباحثہ کے دوران میں کہا کہ سیدہ فاطمہؓ کی وفات سے حضرت علیؓ اور سیدہ فاطمہ کے درمیان زوجیت منقطع نہیں ہوئی تھی اس لیے حضرت علی نے سیدہ کو غسل وفات دیا، میں نے کہا کہ خدا تمہارا بھلا کرے پھر حضرت علی نے حضرت فاطمہ کے بعد ان کی حقیقی بھانجی امامہ بنت زینب سے نکاح کیسے کیا۔ اسی طرح میں نے غزالیؒ کی کتاب "احیاء علوم الدین" میں ایسی تاریخی فروگزاشتیں دیکھیں جس سے مجھے سخت حیرت ہوئی کہ انھوں نے کس طرح مختلف واقعات اور تواریخ کو آپس میں ملا دیا، میں نے ان تاریخی اغلاط کو ایک مستقل کتاب میں جمع کیا ہے، اسی طرح انھوں نے اپنی کتاب "مستظہری" میں لکھا ہے (جس کو انھوں نے مستظہر باللہ کی خدمت میں پیش کیا تھا) کہ سلیمان بن عبد الملک نے ابو حازم سے کہلایا کہ مجھے اپنے ناشتہ میں سے کچھ تبرکاً بھیجو، انھوں نے ان کے پاس ابلا ہوا جو کر بھیجا، سلیمان نے اس کا ناشتہ کیا پھر اپنی بیوی سے ہم بستر ہوا اور اس سے عبد العزیز پیدا ہوئے، عبد العزیز سے عمر بن عبد العزیز پیدا ہوئے، یہ سخت مغالطہ ہے، اس لیے کہ انھوں نے عمر بن عبد العزیز کو سلیمان

بن عبد الملک کا پوتا قرار دیا حالاں کہ وہ اس کے ابن عم تھے، اسی طرح شیخ ابو المعالی جوینی نے اپنی کتاب الشامل کے آخر میں جو اصول فقہ میں ہے لکھا ہے کہ اہلِ باطن کی ایک جماعت ناقل ہو کہ حلاج، جبائی، قرمطی اور ابن المقنع نے سلطنتوں کے نظام کے الٹنے، مملکت کی تخریب اور عوام کی استمالت کی سازش کی اور ہر ایک نے ایک ایک ملک کی ذمہ داری لے لی، جبائی نے احساء میں سکونت اختیار کی ابن المقنع ترکستان کے حدود میں جا بسا اور حلاج نے بغداد کو اپنا مرکز بنایا، اس پر اس کے دونوں ساتھیوں نے فیصلہ کر دیا کہ وہ ہلاک ہو جائے گا اور اپنے مقصد میں ناکام رہے گا اس لیے کہ اہلِ بغداد دھوکہ نہیں کھاتے اور بڑے مردم شناس اور فہیم ہیں، میں کہتا ہوں کہ اگر ناقل کو یہ معلوم ہوتا کہ حلاج نے ابن المقنع کا زمانہ ہی نہیں پایا اس لیے کہ ابن المقنع کے قتل کا منصور نے حکم دیا تھا اور یہ سنہ ۱۶۳ھ کا واقعہ ہے، درانحالیکہ ابو سعید الجبائی کا ظہور سنہ ۲۸۶ھ میں ہوا ہے اور حلاج سنہ ۳۰۹ھ میں مقتول ہوا، اسی بنا پر قرمطی اور حلاج کا زمانہ قریب قریب ہے لیکن ابن المقنع بہت متقدم ہے اس کے ان دونوں سے ملنے اور سازش کرنے کا کوئی امکان نہیں، اس سے معلوم ہوا کہ ہر صاحب علم کو چاہیے کہ دوسرے علوم سے بھی تعلق رکھے اور اس کا کچھ نہ کچھ مطالعہ ہو اس لیے کہ ہر علم کا دوسرے علم سے تعلق ہے، ایک محدث کے لیے یہ بات کتنی معیوب ہے کہ کسی واقعہ کے متعلق اس سے فتویٰ لیا جائے اور وہ جواب نہ دے سکے اس لیے کہ وہ طرقِ حدیث کے جمع کرنے میں مشغول رہا، اس کو مسائل و جزئیات کے علم کی فرصت ہی نہیں ہوئی، اسی طرح ایک فقیہ کے لیے یہ بات کتنی نامناسب ہو کہ اس سے ایک حدیث کا مطلب پوچھا جائے اور وہ حدیث کی صحت اور اس کے مفہوم سے بالکل ناواقف ہو، اللہ تعالےٰ سے دعا ہے کہ ایسی بلند ہمت عطا فرمائے جو پست اور بے ہمتی کی باتوں کو گوارا نہ کرے۔[1]

(باقی ص ۵۵ پر)

---

[1] ص ۳۶۵-۳۶۶

حضرت مولانا سیّد محمد انور شاہ کشمیری قدس اللہ سرہٗ

(از محمد منظور نعمانی)

(۲)

بعض مسائل میں آپ کی خاص تحقیق

وسعت علم و نظر اور خاص فقیہانہ فکر کا ایک نتیجہ یہ بھی تھا کہ بعض مسائل میں آپ کی تحقیق ہمارے زمانہ کے عام علماء احناف سے الگ تھی، بلکہ شاید واقعہ کی زیادہ صحیح تعبیر یہ ہو گی کہ عام علما و اہل فتوی کے لئے فقہ حنفی میں وہ ایک نئی علمی دریافت ہوتی تھی، اس کی کئی ایک مثالیں اس عاجز کو یاد ہیں لیکن اُن میں سے ایک ایسی ہے جس کا ذکر اُردو کے اس مقالہ میں بھی نامناسب نہ ہو گا۔

فقہ حنفی کا یہ مسئلہ مشہور ہے کہ اگر دنیا کے کسی بھی گوشہ میں چاند دیکھا جائے تو دوسرے تمام مقامات پر اس کا اعتبار کیا جائے گا، مثلاً اقصائے مغرب میں رمضان کا چاند ایک دن دیکھا گیا تو اگر شرعاً قابل اعتبار ذریعہ سے اس کی اطلاع اقصائے مشرق میں رہنے والوں کو پہنچ جائے تو اُن کو بھی اسی حساب سے روزہ رکھنا ہو گا، خاص علمی اور فقہی تعبیر اس مسئلہ کی یہ کی جاتی ہے کہ حنفیہ کے یہاں اختلاف مطالع کا اعتبار نہیں اور دوسرے ائمہ کے یہاں اس کا اعتبار ہے، جیسا کہ میں نے عرض کیا عام طور سے علمی اور فقہی حلقوں میں حنفیہ کا یہی مذہب معلوم و مشہور ہے اور عموماً اسی پر فتویٰ دیا جاتا ہے اور حنفی فقہ و فتاویٰ کی کتابوں میں کچھ ایسا ہی لکھا ہوا بھی ہے —— حالانکہ ہیئت کے حساب سے یہ بالکل ناقابل فہم ہے۔

حضرت اُستاذ قدس سرہٗ کی تحقیق اس مسئلہ میں یہ تھی کہ عام مصنفین سے اس کی تعبیر میں لغزش ہو گئی ہے اور اصل مسئلہ حنفیہ کا یہ ہے کہ ایک اقلیم میں اختلاف مطالع کا اعتبار نہیں، فرماتے تھے کہ مشرق و مغرب کے درمیان اختلاف مطالع کا اعتبار نہ کرنا بداہتہً غلط ہے اور حضرت استاذ اپنی اس تحقیق کے سلسلہ میں جہاں تک اب یاد پڑتا ہے ابن رشد کی بدایۃ المجتہد اور فقہ حنفی کی کتابوں میں سے بدائع کا حوالہ بھی دیتے تھے۔

[واضح رہے کہ پہلے تو یہ صرف ایک قابلِ غور علمی مسئلہ تھا جو محض معقولیت پسندوں کے لئے اشکال اور خلجان کا باعث ہوتا تھا لیکن اب یہ واقعاتی مسئلہ ہو گیا ہے۔ کیونکہ اکثر ممالک عربیہ میں عموماً ہندوستان سے ایک دن پہلے چاند نظر آجاتا ہے ــــــ اور ہیئت کے اصول پر ایسا ہی ہونا بھی چاہئے ــــــ اور ہوائی جہاز جدہ سے پرواز کر کے ۸-۹ گھنٹے میں بمبئی آجاتا ہے اور ۱۲ گھنٹے سے کم میں دہلی آسکتا ہے، پس یہ ہو سکتا ہے کہ مثلاً ۲۹ رمضان کی شام کو کچھ لوگوں نے جدہ میں عید کا چاند دیکھا اور اسی شب کو وہ ہوائی جہاز سے روانہ ہو کر صبح کو بمبئی پہنچے تو اگر اختلاف مطالع کا اعتبار نہ کیا جائے تو اُن لوگوں کی شہادت پر ہندوستان والوں کے لئے اُس دن روزہ ختم کر کے عید منانے کا حکم دیا جائے گا حالانکہ یہاں اُس روز انتیسواں[۲۹] بلکہ کبھی تو اٹھائیسواں[۲۸] ہی روزہ ہوگا ــــــ اپنے زمانہ کے بعض اکابر علماء اہل فتویٰ کے متعلق سُنا ہے کہ جب اُن کے سامنے یہ واقعاتی اشکال اس مسئلہ کے متعلق پیش کیا گیا تو انھوں نے فرمایا کہ اگر ایسی صورت پیش آجائے پھر اس کے سوا چارہ نہیں کہ دوسرے ائمہ کے قول پر فتویٰ دیا جائے گا جیسا کہ اس قسم کی ناگزیر صورتوں میں کیا جاتا ہے ــــــ یہ عاجز عرض کرتا ہے اگر اُن بزرگ کو اس مسئلہ کے متعلق حضرت اُستاذ کی مندرجہ صدر تحقیق و تنقیح پہنچی ہوتی تو اس مسئلہ میں فقہ حنفی کو چھوڑ کے دوسرے ائمہ کے قول پر فتویٰ دینے کو وہ ناگزیر نہ سمجھتے]

علم اسرار و حقائق حضرت استاذ علم اسرار و حقائق میں بلاشبہ اس دور کے شیخ اکبر تھے، شیخ ممدوح کے علوم سے خاص مناسبت بھی تھی، اور شیخ کے بہت سے نہایت اعلیٰ اور قیمتی افادات زیادہ تر اُن کی مشہور کتاب "فتوحات مکیہ" کے حوالہ سے درس میں بیان بھی فرمایا کرتے تھے اور بلاشبہ بعض مشکل دینی حقیقتوں کے بارہ میں اُن سے بڑا انشراح اور اطمینان حاصل ہوتا تھا۔

حضرت استاذ کے شاگرد رشید مولانا بدر عالم صاحب میرٹھی (مقیم حال مدینہ طیبہ) کو اللہ تعالیٰ جزائے خیر دے پہلے انھوں نے فیض الباری[۱] میں بھی حضرت کے اس سلسلہ کے افادات کا خاصا حصہ

۱؎ مولانا بدر عالم صاحب نے مسلسل کئی سال حضرت استاذ کے درس بخاری میں بیٹھ کر حضرت کے درسی افادات کو خاص محنت اور جانفشانی سے مرتب کیا اور مجلس علمی ڈابھیل نے بڑے اہتمام سے مصر میں چھپوا کر اس کو شائع کیا۔ گویا صحیح بخاری کے سلسلہ میں یہ حضرت استاذ کے امالی ہیں اسی کا نام فیض الباری ہے۔ چار ضخیم جلدیں ہیں۔ حضرت کی علمی و درسی خصوصیات کا ایک خاص حد تک اس سے اندازہ ہو جاتا ہے، مولانا بدر عالم صاحب اور مجلس علمی کا بلاشبہ یہ بڑا کارنامہ اور ہم لوگوں پر بڑا احسان ہے کہ کاش یہ کتاب حضرت کی زندگی میں مرتب ہو کر نظر انور سے بھی گزر چکی ہوتی ۱۲

لے لیا تھا اور اب حدیث کی جو ایک نئی جامع کتاب وہ خود مرتب فرما رہے ہیں ـــــ جو اُن ہی کے اُردو ترجمہ اور مفصل تشریحی نوٹوں کے ساتھ "ندوۃ المصنفین دہلی" سے "ترجمان السنہ" کے نام سے شائع ہو رہی ہے اور پہلی دو جلدیں شائع بھی ہو چکی ہیں ـــــ اُس میں بھی انھوں نے حضرت استاذ کے اس خاص الخاص علمی شعبہ کے نہایت گراں قدر افادات کو اُردو میں منتقل کرنے کی اور غیر عالم اُردو خوانوں کو بھی سمجھا دینے کی بڑی مبارک اور کامیاب کوشش کی ہے، واقعہ یہ ہے کہ شیخ اکبر کے مضامین کو صحیح سالم اور محتاط طریقہ پر اُردو جیسی کسی زبان میں منتقل کر دینا یقیناً بڑا مشکل کام ہے۔ مگر ترجمان السنہ کے ابتدائی ابواب ہی کے مطالعہ سے معلوم ہو جاتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے مولانا بدر عالم صاحب کے لئے اس کو کس حد تک آسان فرما دیا ہے

جدید مغربی علوم پر بھی نظر مصر والوں نے جدید مغربی علوم پر عربی میں جو کتابیں شائع کی ہیں اور مختلف مغربی زبانوں سے جو تراجم کئے ہیں حضرت استاذ اُن کے ذریعہ ان نئے علوم اور نئی تحقیقات سے بھی کافی واقفیت رکھتے تھے۔ خاص طور سے طبعیات میں یورپ نے جو علمی ترقی کی ہے اُس کے معترف اور اُس کے افادی پہلو کے قدر دان تھے اور اسی وجہ سے مشہور مصری فاضل طنطاوی جوہری کی تفسیر جواہر القرآن کے مطالعہ بلکہ اُس سے علمی استفادہ کا مشورہ دوسرے اہل علم کو بھی دیتے تھے، حالانکہ اُس میں بہت سی چیزیں ایسی بھی ہیں جو سخت ناپسندیدہ ہیں۔

سلسلۂ درس کی بعض قابلِ ذکر چیزیں جو طلبہ صرف و نحو کی خامی اور عربی استعداد کی کمزوری کی وجہ سے حدیث صحیح نہیں پڑھ سکتے تھے اور اعراب میں غلطیاں کرتے تھے حضرت استاذ اُن کے لئے حدیث پڑھنا جائز نہیں سمجھتے تھے۔ اسی طرح اگر طالب علم سے سبق کی قرأت میں کسی ایسے راوی کے نام میں غلطی ہوتی جو سلسلہ سند میں بار بار اور بکثرت سے آتا تو اس سے بھی آپ کو بڑی سخت اذیت ہوتی تھی اور گویا یہ تکلیف آپ کے لئے ناقابل برداشت تھی ـــــ ایک دن ترمذی شریف کا سبق ہو رہا تھا، ایک طالب علم نے عبارت پڑھنی شروع کی، شاید پہلی یا دوسری حدیث تھی، سلسلہ سند میں آیا عَنِ الشَّعبِی، اس بے چارہ نے بجائے شَعْبِی کے شُعْبِی پڑھا، حضرت استاذ نے تصحیح فرماتے ہوئے فرمایا "عَنِ الشَّعْبِی" لیکن اس بندہ خدا نے سمجھا نہیں اور پھر پڑھا "عَنِ الشُّعْبِی" حضرت نے پھر فرمایا "عَنِ الشَّعْبِی" لیکن اس بندہ خدا کی زبان سے پھر وہی نکلا "عَنِ الشُّعْبِی" ـــــ حضرت نے اسی وقت سبق سے اٹھا دیا اور فرمایا جو لوگ اتنے ناقص الاستعداد اور کم فہم ہوں کہ روزانہ سند میں آنے والے راویوں کے صحیح ناموں سے بھی واقف نہ ہوں اور بار بار بتلانے

ے بھی نہ سمجھ سکیں اُن کو دورۂ حدیث میں شریک نہیں ہونا چاہیئے۔

صحیح قسم کے طالب علمانہ سوالات سے حضرت بہت خوش ہوتے تھے اور بڑی بشاشت کے ساتھ جواب مرحمت فرماتے تھے لیکن مہمل قسم کے اور لایعنی یا غیر متعلق سوالات کی بالکل گنجائش اور اجازت نہ تھی — جس سال یہ عاجز دورۂ حدیث میں تھا اُس سال دورہ میں تقریباً سو طالب علم تھے، ان میں سے صرف ۴-۵ کو حضرت نے خود متعین فرمایا تھا کہ صرف یہی سوال کیا کریں اور ان کے علاوہ جس کو سبق کے سلسلہ میں کچھ پوچھنا ہو وہ پہلے ان کو بتلادے، اگر یہ اس کو پیش کرنے کے قابل سمجھیں تو پیش کریں، حضرت کے اس طرز عمل کی وجہ سے کسی فضول اور لایعنی بات میں بالکل وقت ضائع نہیں ہوتا تھا — میں نہیں کہہ سکتا کہ حضرت کا یہ ہمیشہ کا رویہ تھا یا اُسی سال یہ طرز عمل اختیار فرمالیا تھا۔

حضرت استاذ قدس اللہ سرہ کے متعلق اس مقالہ میں ذکر کرنے کے لائق علمی اور درسی سلسلہ کی جو باتیں اس وقت یاد آئیں وہ یہی تھیں جو حوالۂ قلم ہوچکیں — اب زندگی کے بعض دوسرے شعبوں کے متعلق اسی طرح کی بعض جستہ جستہ چیزیں جو حافظہ میں ہیں وہ بھی ہدیۂ ناظرین کرام ہیں۔

دو فتنوں کا شدید احساس

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے لائے ہوئے دین اور آپکی امت کے بارہ میں آپ کو دو فتنوں کی طرف سے بڑی گہری فکر تھی — خارجی فتنوں میں الحاد و مادہ پرستی کا مغربی فتنہ جو اقوام مغرب کے سیاسی غلبہ اور علوم و فنون میں اُن کی بالاتری کی وجہ سے تمام عالم پر چھایا چلا جارہا ہے — اور داخلی و اندرونی فتنوں میں مسیلمۂ پنجاب مرزا غلام احمد قادیانی کی نبوت کا فتنہ! — ان دونوں فتنوں کی شدت احساس سے آپ بے چین رہتے تھے اور ان کے مقابلہ اور اُمت کی اِن سے حفاظت کرنے کے واسطے تیاری کرنے کے لئے آپ طلبہ کو بڑے درد کے ساتھ ترغیبیں دیتے تھے اور اس کے لئے درس کے علاوہ آپ مستقل تقریریں بھی کرتے تھے بلکہ اُس زمانہ میں حضرت کی تقریروں کا موضوع عموماً یہی ہوتا تھا۔

قادیانی فتنہ سے آپ کی غیر معمولی بے چینی

خاص طور سے موخر الذکر قادیانی فتنہ کے بارہ میں آپ کی فکر اور بے چینی کا جو حال تھا جن لوگوں نے دیکھا نہیں وہ اُس کا اندازہ نہیں کرسکتے — رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد

عرب کے مختلف علاقوں میں مختلف شکلوں میں ارتداد کی جو وبا پھیلی تھی اور خاص کر مسیلمہ کذاب کی جھوٹی نبوت پر ایمان لانے کا فتنہ جو اُس وقت ایک دم زور پکڑ گیا تھا اُس موقع پر حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کی غیر معمولی بے چینی اور حرارت ایمانی کا ذکر جو روایات میں آتا ہے، حضرت استاذ قدس سرہ کے احوال میں بالکل اُس کی جھلک نظر آتی تھی اور اُس زمانہ میں حضرت اپنی اکثر تقریروں میں اُس فتنۂ ارتداد کے زمانہ کے سیدنا صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کے جوش ایمانی سے بھرے ہوئے خطبات اور کلمات اکثر دُہرایا کرتے تھے خاص طور سے حضرت صدیق اکبر کا وہ ایمان افروز جملہ جو آپ نے حضرت عمرؓ سے اُس وقت فرمایا تھا جب مرتدین کے خلاف جنگ کے بارہ میں مصلحت اندیشی سے کام لینے کا حضرت صدیق اکبر کو انہوں نے مشورہ دیا تھا وہ جملہ کتب حدیث و سیر میں آج تک محفوظ ہے اور حضرت ابوبکر کے مقام صدیقیت کی شہادت دے رہا ہے۔ اس کے الفاظ جو حضرت استاذ اُس زمانہ میں اکثر دہرایا کرتے تھے یہ ہیں:۔ "اجبار فی الجاھلیۃ وخوار فی الاسلام، انہ قد انقطع الوحی وتم الدین، اینقص وانا حیّ"[1]

بہر حال قادیانی فتنہ کی فکر حضرت اُستاذ کی سب سے بڑی فکر تھی اور اس معاملہ میں آپ کا حال وہ تھا جو اُن بندگانِ خدا کا ہوتا ہے جن سے اللہ تعالیٰ اپنا کوئی خاص کام لینا چاہتا ہے اور پھر اس کی فکر اور اُس کیلئے بے چینی اُن پر طاری کر دیتا ہے۔

ایک دفعہ حضرت استاذ نے قادیانیت کے متعلق اپنے تین خواب سنائے تھے جو آپ نے دس دس سال کے فاصلہ سے دیکھے تھے ـــــ اپنی اس نالائقی پر آج سخت رنج و افسوس ہے کہ نہ کہیں ان کو نوٹ کیا اور نہ یاد رکھا۔ اجمالاً صرف اتنا یاد ہے کہ پہلا خواب آپ نے قیام دہلی کے زمانہ میں دیکھا تھا، دوسرا اس سے ٹھیک دس سال کے بعد، اور تیسرا اُس کے ٹھیک دس سال بعد دیکھا تھا۔ ان تینوں خوابوں میں آپ کو پنجاب کے اس متنبی کذاب کے فتنہ سے امت محمدیہ کے ایمان کی حفاظت کے لیے جد وجہد کی طرف توجہ دلائی گئی تھی اور اس راستہ میں اللہ تعالیٰ کی مدد کی بشارت تھی ـــــ مجھے اجمالاً اتنا ہی یاد رہ گیا ہے حضرت نے ایک موقع پر پوری تفصیل سے یہ تینوں خواب سنائے تھے، شاید حضرت کے خدام اور تلامذہ میں سے کسی اور کو یاد ہو۔

اس فتنہ کے سلسلہ میں اللہ تعالیٰ نے جو کام حضرت استاذ سے لیے اُن کا ذکر اچھی خاصی تفصیل کے ساتھ

---

[1] مطلب یہ ہے کہ تم جاہلیت میں تو بڑے سخت اور زور آور تھے اور آج اسلام کی حالت میں ایسی کمزوری اور نامردی کی باتیں کرتے ہو۔ نبوت ختم ہو چکی، وحی کی آمد کا سلسلہ بند ہو چکا اور دین ہر طرح مکمل ہو گیا، یہ نہیں ہو سکتا کہ میں دنیا میں زندہ ہوں اور دین میں قطع و برید ہو۔

جناب مولانا مفتی محمد شفیع صاحب اپنے ایک مستقل مضمون میں کر چکے ہیں ـــــ (جو غالباً اس مجموعۂ مضامین میں بھی شامل ہو گا جس کے لئے یہ سطریں یہ عاجز لکھ رہا ہے) ـــــ تاہم اس سلسلہ میں دو تین باتیں ذکر کرنے کو جی چاہتا ہے۔

(۱) قادیانی فتنہ کے ظہور نے جن مسائل اور مباحث پر گفتگو کا سلسلہ پیدا کر دیا ہے اُن میں دو مسئلے مختلف وجوہ و اسباب سے علمی طور پر کچھ مشکل ہیں یعنی ان میں لوگوں کے لئے مغالطہ کھانے کی گنجائش بہ نسبت دوسرے مسئلوں کے کچھ زیادہ ہے ـــــ ایک مسئلہ حیات مسیح علیہ السلام ـــــ اور دوسرا ایمان و کفر کے حدود کا مسئلہ۔

یہ دوسرا مسئلہ اگرچہ فی نفسہٖ مشکل نہیں ہے بلکہ سیدھی سادی بات ہے لیکن کچھ تو مسئلہ کے بعض پہلوؤں کی بعض مبہم اور غیر واضح تعبیروں نے اور کچھ تکفیر جیسے سنگین معاملہ میں بعض لوگوں کی بے احتیاطیوں نے مسئلہ کو اچھا خاصا مشکل بنا دیا ہے اور اُس میں ایسی اُلجھنیں پیدا کر دی ہیں کہ بہت سے لوگ خواہ مخواہ اُس میں اُلجھ جاتے ہیں ـــــ حضرت استاذ نے ان دونوں مسئلوں کی طرف خود توجہ مبذول فرمائی۔

مسئلہ حیات مسیح پر پہلے ایک رسالہ "عقیدۃ الاسلام فی حیوٰۃ عیسےٰ علیہ السلام" لکھا۔ اس کے بعد بطور اُس کے حواشی یا ضمیمہ کے دوسرا رسالہ "تحیۃ الاسلام" تالیف فرمایا ـــــ یہ دونوں عربی زبان میں ہیں اور جیسا کہ میں پہلے بھی کہیں عرض کر چکا ہوں کہ حضرت کا طرز فکر اور طرز بیان و استدلال متاخرین کا سا نہیں ہے جس کا سمجھنا ہم جیسوں کے لئے زیادہ آسان ہوتا ہے بلکہ ائمہ متقدمین کا سا ہے اس لئے افسوس ہے کہ ہر عربی داں کے لئے بھی اِن دونوں رسالوں کو پوری طرح سمجھ لینا آسان نہیں ہے لیکن اس میں شبہ نہیں کہ جو سلیم القلب ان دونوں رسالوں کو سمجھ کر پڑھ لے اس کو انشاء اللہ اس میں ذرہ برابر شبہ نہیں رہے گا کہ قرآن مجید کی قطعی شہادت قادیانیوں کے دعوئے "ممات مسیح" کے خلاف ہے اور قادیانیوں کی طرف سے جو سیکڑوں بلکہ ہزاروں صفحات اس مسئلہ پر لکھے گئے ہیں اُن کی بنیاد یا لکھنے والوں کی جہالت پر ہے یا علمی خیانت اور دھوکہ بازی پر۔

جس سال یہ عاجز دار العلوم دیوبند میں دورۂ حدیث کا طالب علم تھا اُسی سال ممالک عربیہ میں سے غالباً مصر کے ایک بڑے وسیع النظر عالم اور ممتاز فاضل جو مغربی علوم میں بھی خاص دستگاہ رکھتے تھے اور جرمنی میں ایک عرصہ تک ان کا قیام بھی رہا تھا دیوبند تشریف لائے تھے اور دار العلوم میں

چند روز قیام فرمایا تھا، اُن کی تشریف آوری کا باعث جیسا کہ اُس وقت سنا تھا صرف یہ ہوا تھا کہ حضرت استاذ کے رسالہ "عقیدۃ الاسلام" کا نسخہ کہیں اُن کی نظر سے گزرا اُس کو دیکھنے کے بعد اُنھوں نے ضروری سمجھا کہ اِس علم کا آدمی اگر دنیا میں کہیں زندہ موجود ہے تو مجھے اُس سے ضرور ملنا چاہیئے۔

دوسرے مسئلہ کفر و اسلام کے حدود پر حضرت استاذ نے رسالہ "اکفار الملحدین فی شیئی من ضروریات الدین" تالیف فرمایا، یہ بھی عربی میں ہے اور ہر عربی داں کے لئے یہ بھی سہل الفہم نہیں ہے لیکن کفر و اسلام کے حدود کی ایسی تنقیح غالباً اس سے پہلے نہیں ہوئی، اس کو سمجھ کر پڑھنے کے بعد اس میں کوئی شک شبہ باقی نہیں رہتا کہ مرزا غلام احمد قادیانی نے نبوت کا دعویٰ کرکے اور اس کی امت نے اُس کو نبی مان کے اپنے کو اسلام کے وسیع دائرہ سے اس طرح نکال لیا ہے کہ جو شخص محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے لائے ہوئے دین پر ایمان رکھتا ہو وہ اب کسی طرح ان لوگوں کو مسلمانوں میں شمار نہیں کر سکتا اور اگر وہ (قادیانیت سے اور قادیانیوں سے اچھی طرح واقف ہونے کے باوجود ایسا کرے گا تو اس کو محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے لائے ہوئے دین کے بعض اہم حصوں کی تکذیب یا آپ کی بعض واضح تعلیمات میں تحریف کرنی پڑے گی اگرچہ وہ اپنی کج فہمی یا نادانی کی وجہ سے اپنی اس پوزیشن کو سمجھتا نہ ہو۔

"اکفار الملحدین" کا تعلق چونکہ کفر و اسلام کے مسئلہ سے تھا اور اس میں مرزا غلام احمد قادیانی اور اس کی امت پر کفر کا حکم لگایا گیا تھا اور بلا شبہ یہ بہت اہم معاملہ تھا اس لئے حضرت نے یہ مناسب سمجھا کہ اس زمانہ کے دوسرے اکابر اور مشاہیر اہل علم کی آرا بھی اُس کے بارہ میں حاصل کی جائیں چنانچہ کچھ اکابر اہل علم مثلاً حکیم الامت حضرت مولانا تھانوی، حضرت مولانا خلیل احمد صاحب سہارنپوری وغیرہ کی آرار تو پہلے ہی اڈیشن میں شامل کردی گئی تھیں اور اس عاجز کے پاس اسی اڈیشن کا نسخہ ہے لیکن دوسرے حلقوں کے بعض علماء و فاضل کی رائیں اور تصدیقیں بعد میں حاصل ہوئی تھیں، مثلاً مولانا حبیب الرحمان خاں صاحب شروانی (صدر یار جنگ) مرحوم کے متعلق راقم سطور کو معلوم ہے کہ پہلے اڈیشن کی اشاعت کے کافی عرصہ بعد موصوف کی تصدیق موصول ہوئی تھی، مگر مجھے معلوم نہیں کہ بعد کے اڈیشنوں میں بعد والی وہ تصدیقات شامل ہوئیں یا نہیں اگر نہیں شامل ہوئی ہیں اور کہیں محفوظ ہیں تو ان کو شامل ہونا چاہیئے!

الغرض قادیانی فتنہ کی غارت گری سے محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی امت کے ایمان کی حفاظت کے سلسلہ میں ایک کام تو آپ نے یہ کیا کہ ان دو مسئلوں کو خود صاف کیا لیکن چونکہ اُردو میں لکھنے کی حضرت کو عادت نہ تھی اس لئے مجبوراً یہ دونوں رسالے عربی میں لکھے اور اس امید پر لکھے کہ خود علماء کے ذہن جب ان دونوں مشکل مسئلوں کے بارہ میں ان رسالوں سے صاف اور مطمئن ہو جائیں گے تو اللہ تعالیٰ جن کو توفیق دے گا وہ ان کے مضامین کو حسب ضرورت اُردو وغیرہ دوسری زبانوں میں بھی منتقل کر دینگے۔

ایک رسالہ آپ نے مسئلہ ختم نبوت پر "خاتم النبیین" کے نام سے فارسی زبان میں بھی تحریر فرمایا اور یہ آپ نے خصوصیت سے اپنے وطن کشمیر کی ضرورت کو سامنے رکھ کر لکھا کیونکہ وہاں کے جس طبقہ کو آپ سمجھانا چاہتے تھے اُس کے لئے آپ کے نزدیک فارسی زبان ہی اچھا ذریعہ بن سکتی تھی۔

---

(۲) ان رسالوں کے علاوہ آپ کی فکر اور بے چینی نے آپ کے تلامذہ کی ایک اچھی خاصی تعداد کو اس طرف متوجہ کر دیا اور اللہ تعالیٰ نے اُن سے اس فتنہ کے انسداد میں مختلف شکلوں میں بہت کچھ کام لیا۔ جناب مولانا مفتی محمد شفیع صاحب کے جس مضمون کا ابھی اوپر میں نے تذکرہ کیا ہے اُس سے ناظرین کو اسکی کچھ تفصیل معلوم ہوگی۔

سلوک و تصوف

میں عرض کر چکا ہوں کہ علمی شغف و انہماک اور علمی کمال کا آپ پر اتنا غلبہ تھا کہ دوسرے تمام کمالات اور زندگی کے دوسرے پہلو اس کے نیچے بالکل دبے ہوئے تھے، چنانچہ آپ کی زندگی کا وہ بلند ترین پہلو بھی جس کو "سلوک و تصوف" سے تعبیر کرنا چاہیے، اس علمی کمال اور شغف علمی سے دبا ہوا تھا، اسی وجہ سے بہت سے لوگ آپ کی زندگی کے اس رُخ سے بالکل ناواقف ہیں، یہ عاجز بھی کچھ زیادہ واقف نہیں ہے لیکن اجمالاً اتنا ضرور جانتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے آپ کو اس دولت سے بھی حصہ وافر عطا فرمایا تھا اور یقیناً آپ آراستہ باطن اصحاب احسان میں سے تھے۔ حضرت گنگوہی نور اللہ مرقدہٗ سے مجاز بھی تھے لیکن اس لائن کی باتیں کرنے کی عادت نہ تھی، البتہ ایک دفعہ ایک واقعہ سنایا اور اُس سلسلہ میں کچھ جوش آگیا تو ایک آدھ بات ہم لوگوں کو ایسی بھی سننی میسر آگئی جس سے کچھ سمجھا جا سکا کہ اس فضا میں بھی حضرت استاذ کی پرواز کتنی بلند ہے۔ —— جو واقعہ حضرت نے سنایا وہ یہ تھا۔

فرمایا کہ ایک دفعہ میں کشمیر سے یہاں کے لئے چلا، راستہ کی کافی مسافت گھوڑے پر سوار ہو کر طے کرنی پڑتی تھی، راستہ میں ایک صاحب کا ساتھ ہو گیا۔ یہ پنجاب کے ایک مشہور پیر صاحب کے مرید تھے اور ان ہی

کے پاس جا رہے تھے، یہ مجھ سے اپنے ان پیر صاحب کا اور اُن کے کمالات اور کرامات کا تذکرہ راستہ بھر کرتے رہے، ان کی خواہش اور ترغیب یہ تھی کہ میں بھی اُن پیر صاحب کی خدمت میں حاضر ہوں، اور اتفاق سے وہ مقام میرے راستہ میں بھی پڑتا تھا، میں نے بھی ارادہ کر لیا۔۔۔ جب ہم دونوں پیر صاحب کی خانقاہ پر پہنچے تو اُن صاحب نے مجھ سے کہا کہ نئے آدمیوں کو اندر حاضر ہونے کے لئے اجازت کی ضرورت ہوتی ہے اس لئے میں پہلے جا کر آپ کے لئے اجازت لے لوں، چنانچہ وہ اندر تشریف لے گئے اُن بزرگ نے اطلاع پاکر خود اپنے صاحبزادے کو مجھے لینے کے لئے بھیجا اور اکرام سے پیش آئے، خود ایک تخت پر بیٹھے ہوئے تھے باقی سب مریدین و طالبین نیچے فرش پر تھے مگر مجھے اصرار سے اپنے ساتھ تخت پر بٹھایا۔۔۔ کچھ باتیں ہوئیں اس کے بعد اپنے مریدین کی طرف متوجہ ہو گئے اور اپنے طریقہ پر اُن پر توجہ ڈالنی شروع کی اور اُس کے اثر سے وہ بے ہوش ہو ہو کر لوٹنے اور تڑپنے لگے، میں یہ سب دیکھتا رہا، پھر میں نے کہا کہ میرا جی چاہتا ہے کہ اگر مجھ پر بھی یہ حالت طاری ہو سکے تو مجھ پر آپ توجہ فرمائیں۔۔۔ انھوں نے توجہ دینی شروع کی اور میں اللہ تعالیٰ کے ایک اسم پاک کا مراقبہ کر کے بیٹھ گیا بے چاروں نے بہت زور لگایا اور بہت محنت کی لیکن مجھ پر کچھ اثر نہیں ہوا۔۔۔ کچھ دیر کے بعد انھوں نے خود ہی فرمایا کہ آپ پر اثر نہیں پڑ سکتا۔

حضرت استاذ نے یہ واقعہ اتنا ہی نقل فرمایا اور اُس کے بعد ایک غیر معمولی جوش کے ساتھ فرمایا

"یہ کچھ نہیں ہے لوگوں کو متاثر کرنے کے لئے ایک کرشمہ ہے اور کچھ مشکل بھی نہیں معمولی مشق سے ہر ایک کو حاصل ہو سکتا ہے ۔۔۔ ان باتوں کا خدا رسیدگی سے کوئی تعلق نہیں"

پھر اُسی سلسلہ میں اور اُسی جوش کی حالت میں فرمایا۔

"اگر کوئی چاہے اور استعداد ہو تو انشاء اللہ تین دن میں یہ بات پیدا ہو سکتی ہے کہ قلب سے اللہ اللہ کی آواز سنائی دینے لگے، لیکن یہ بھی کچھ نہیں، اصل چیز تو بس احسانی کیفیت اور شریعت و سنت پر استقامت ہے"

اس ایک موقع کے سوا حضرت سے کبھی کوئی ایسی بات سننا اس عاجز کو یاد نہیں جس سے حضرت کے اس باطنی کمال کا کچھ سراغ ہم کو ملا ہو۔

اپنے بعض اکابر سے خصوصی تاثر | جیسا کہ میں عرض بھی کر چکا ہوں سلوک و تصوف کے

سلسلہ کی باتیں کرنے کی حضرت استاذ کی عادت نہیں تھی، کم از کم اس عاجز کا علم و تجربہ تو یہی ہے۔ اسی لئے اس سلسلہ کے اپنے اکابر کے خاص احوال و واقعات یا اُن کی زندگی کے خاص اس شعبہ کے متعلق اپنے تاثرات حضرت استاذ رحمۃ اللہ علیہ سے سننے کا ہم نیاز مندوں کو کبھی شاذ و نادر ہی اتفاق ہوتا تھا، ایک ہی دفعہ کی یاد ہے درس ہی میں کسی سلسلہ میں فرمایا :-

"ہم یہاں آئے (یعنی کشمیر سے ہندوستان) تو دین حضرت گنگوہی کے یہاں دیکھا، اُس کے بعد حضرت استاذ (یعنی حضرت شیخ الہندؒ) اور حضرت رائے پوری (یعنی حضرت شاہ عبدالرحیم صاحبؒ) کے یہاں دیکھا اور اب جو دیکھنا چاہے وہ حضرت مولانا اشرف علی صاحب کے یہاں جا کر دیکھے۔"

اپنے سلسلہ کے ان اکابر کے علاوہ ہمعصر مشائخ میں سے دو اور بزرگوں کے بارہ میں بھی حضرت استاذ کے بہت بلند کلمات اس عاجز کو یاد ہیں، ایک حضرت مولانا حسین علی شاہ صاحب مجددی نقشبندی اور دوسرے حضرت مولانا احمد خاں صاحب مجددی نقشبندی ان دونوں بزرگوں کے متعلق حضرت فرماتے تھے کہ اس عصر میں یہ نقشبندی سلوک کے امام ہیں۔

یہ دونوں بزرگ ضلع میانوالی کے تھے، دونوں کے وصال کو عرصہ ہو چکا ہے دونوں ایک ہی شیخ کے تربیت یافتہ اور مجاز تھے لیکن بعض مسائل میں نقطۂ نظر کے فرق کی وجہ سے درمیان میں کچھ بعد پیدا ہو گیا تھا، لیکن حضرت استاذ دونوں کو سلوک کا امام مانتے تھے۔ یہ عاجز بھی ان دونوں بزرگوں کی زیارت سے مشرف ہوا ہے، وللہ الحمد والمنۃ۔

بعض شمائل نبوی کی جھلک

اگرچہ شمائل و اخلاق میری اس تحریر کا موضوع نہیں ہیں اور غالباً ان چیزوں پر کوئی اور صاحب مستقلاً لکھیں گے لیکن یہاں پہنچ کر حضرت استاذ کی دو تین عادتیں ذکر کرنے کو بھی بے اختیار جی چاہتا ہے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے جو اخلاق و شمائل کتب حدیث میں روایت کئے گئے ہیں ان میں ایک یہ عادت مبارکہ بھی نقل کی گئی ہے کہ آپ بہت زیادہ خاموش رہتے تھے، (گویا بلا ضرورت بولتے ہی نہ تھے) حدیث کے الفاظ ہیں "کان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم طویل الصمت" یہ عاجز عرض کرتا ہے کہ اس مبارک عادت کا جیسا کامل نمونہ حضرت استاذ کو دیکھا ایسا کوئی اور دیکھنا یاد نہیں، معلوم ہوتا تھا کہ اُن کو صرف علمی و دینی افادہ و استفادہ کے لئے اور ناگزیر ضروری باتوں ہی

کے لئے زبان دی گئی ہے۔

اور اس خاموشی میں تنفس کی منضبط کیفیت اور ایک خاص نوعیت سے محسوس کرنے والے صاف محسوس کر لیتے تھے کہ پاس انفاس[لہ] کے شغل میں برابر مشغول ہیں۔

اسی طرح حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی عادات مبارکہ میں صحابہ کرام ذکر فرماتے ہیں کہ:۔

"مسکرانے کی تو بہت زیادہ عادت تھی لیکن کھل کھلا کر ہنستے کبھی نہیں دیکھا"

بالکل یہی حال حضرت استاذ کا تھا۔

اس زمانہ میں غیبت کی بیماری کس قدر عام اور متعدی ہوگئی ہے اور اس سے اور اس کے اڑتے ہوئے جراثیم سے محفوظ رہنا کتنا مشکل ہوگیا ہے، اس کا اندازہ بہت سے حضرات کو شاید نہ ہو لیکن اس عاجز کو خوب ہے اور اس لئے میرا یقین ہے کہ اللہ کا جو بندہ اس دور میں غیبت سے محفوظ ہو وہ اللہ کی خاص حفاظت میں ہے اور یہ اس کی بڑی کرامت ہے ——— مگر حضرت استاذ قدس سرہ کو الحمد للہ دیکھا کہ اللہ تعالیٰ نے غیبت سے زبان کو ایسا محفوظ کیا تھا کہ کبھی اشارۃً کنایۃً بھی غیبت کی قسم کی کوئی بات سننا یاد نہیں بلکہ یہ یاد ہے کہ حضرت کے سامنے کسی نے غیبت کی قسم کی کوئی بات شروع کی اور حضرت نے فوراً روک دیا۔

حضرت استاذ کے متعلق بس یہی کچھ منتشر باتیں اس وقت اس مقالہ میں ذکر کے قابل یاد آئیں جو حوالۂ قلم و قرطاس کر دی گئیں۔

لہ صوفیہ کے اشغال میں سے صرف پاس انفاس کے متعلق آپ کا خیال تھا کہ اس کی اصل حدیث و سنت سے کچھ معلوم ہوتی ہے اس لئے خود اپنا شغل بھی تھا اور رجوع کرنے والے نیازمندوں کو تلقین بھی فرماتے تھے ۱۲

روضۂ انور کے سامنے ـــــ!

(جنرل محمد نجیب صدر جمہوریہ مصر)

گذشتہ سال جمہوریہ مصر کے صدر جنرل محمد نجیب نے حج اور زیارت روضۂ انور کا شرف حاصل کیا، زیارت کے موقع پر جو تاثرات ان کے قلب پر وارد ہوئے وہ مصر کے "السٹرٹیڈ ویکلی" میں شائع ہوئے ہیں۔ یہ تاثرات بعض لحاظ سے اس قابل تھے کہ ایک دینی رسالہ کے ناظرین کی دلچسپی کا باعث بن سکتے، چنانچہ برادر عزیز مولوی محمد رابع صاحب حسنی ندوی نے اس کا ترجمہ کر کے عنایت فرمایا ہے جو ہدیۂ ناظرین ہے۔　　　(عتیق الرحمٰن)

مجھے روضۂ نبوی کی زیارت کا شرف حاصل ہوا، میں جس وقت روضہ کے سامنے کھڑا تھا، ایک سلسلۂ خیالات شروع ہوا اور میرے ذہن کو مسلمانوں کے ماضی و حال کی طرف کھینچ لے گیا، میں نہایت ادب کے ساتھ کھڑا اپنی عظمت رفتہ کے تصور میں ڈوبا رہا، اور آج کی حالت سے اس حالت کا مقابلہ کرتا رہا ـــــ پھر میں نے اپنے دل سے سوال کیا، کیا وجہ ہے کہ ہم دنیا کی نظر میں اتنے بے حقیقت ہو گئے ہیں کہ جو جس کے جی میں آتا ہے ہمارے ساتھ کر گزرتا ہے اور ہر مغرورِ قوت کو اپنی فتوحات کے لئے ہم ہی نظر پڑتے ہیں۔

اس سوال کے جواب تک پہونچنے میں مجھے زیادہ دیر نہ لگی! جواب فوراً ہی مل گیا اور وہ یہ تھا:-

اپنی اس حالت کے ذمہ دار ہم خود ہی ہیں، اس کا اصل سبب ہمارا سیدھے راستہ سے ہٹ جانا ہے، ہمارا انتشار اور باہمی اختلاف ہے! ہماری شخصی اغراض کی کشاکش ہے! ہم میں سے کسی کو اپنے سوا دوسرے کی فکر نہیں ہوتی، نہ ان کی جن کے ساتھ ہماری صبح و شام گزرتی ہے اور نہ ان کی جن سے ہمارا ماحول بنتا ہے

ہم میں کا ہر شخص ہر وقت دوسروں کا حق کھا جانے کی تاک میں رہتا ہے، نہ اپنے سوا کسی کی عزت کا خیال ہے نہ کسی کے استحقاق کا!

دوسرا سوال پھر میں نے اپنے دل سے دوسرا سوال کیا کہ اللہ تعالیٰ نے کعبہ کو قبلہ کیوں بنایا ہے؟ مشرق و مغرب کے مسلمانوں کو اپنی اپنی نمازوں میں اسی کے رخ کا کیوں حکم دیا گیا ہے؟ مجھ کو اس سوال کا جواب بھی فوراً مل گیا کہ اس میں اللہ تعالیٰ کی ایک بڑی حکمت ہے، وہ ہم میں یک جہتی پیدا کرنا چاہتا ہے، اور حقیقت میں یک جہتی ہی کسی قوم کی کامیابی کی پہلی بنیاد ہے!

روضۂ رسولِ پاک کے سامنے یہی میرے دل میں آیا کہ ہم مذہب سے بیگانہ ہو گئے ہیں اس کے اوامر و نواہی سے روگردانی کرنے لگے ہیں ہم اپنے مذہب سے تغافل برتنے میں اس خطرناک حد تک پہونچ گئے ہیں جس پر نظر کرتے ہوئے میں قطعی طور پر کہہ سکتا ہوں کہ ہمارے انحطاط شکست خوردگی ضعف اور بے وقعتی کی وجوہ میں سے سب سے بڑی وجہ یہی ہے۔

خیالات کا یہ سلسلہ مجھ کو عہد ماضی کی طرف لے گیا جب ہماری زندگی ابتدائی مراحل میں تھی اور ہم تعلیم حاصل کر رہے تھے، اس وقت ہم قرآن مجید پڑھتے تھے درس و مطالعہ شروع کرنے سے پہلے بھی اور درس و مطالعہ ختم کرنے سے پہلے بھی! اس کا نتیجہ یہ تھا کہ اس کتاب مقدس کے پاک حقائق ہمارے دلوں میں اتر گئے اور انھوں نے ہمارے دلوں پر ایسا قبضہ کر لیا جو مشکل سے ہوا کرتا ہے، اور آج کی حالت پر جو ہم نظر ڈالتے ہیں تو دیکھتے ہیں کہ اکثر مسلمان نوجوانوں کو قرآن مجید کی ایک آیت بھی یاد نہیں ہوتی، وہ اس چشمۂ حیات کے ایک قطرہ سے بھی مستفید نہیں ہوتے۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ ان کے دل یقین سے خالی ہیں اور ان کے دلوں میں ایمان کی بنیادیں اتنی ہل گئی ہیں کہ ہر دھکا ان کو اپنی جگہ سے ہٹا دیتا ہے اور ہر مصیبت کے سامنے وہ آسانی سے ہتھیار ڈال دینے کے لئے آمادہ ہو جاتے ہیں۔

آنحضرت کا تحمل شدائد میں خیالات اور تصورات کے اسی سلسلہ سے گزرتا ہوا ان شدائد اور مصائب تک جا پہونچا جن کا جناب رسول برحق صلی اللہ علیہ وسلم کو اپنی رسالت و دعوت کے سلسلہ میں سامنا کرنا پڑا تھا— میں کھڑا سوچنے لگا کہ حضور نے کس صبر و ایمان کے ساتھ ان سختیوں کو جھیلا اور کس طرح ان تمام جفاؤں اور درشتیوں کو خندہ پیشانی

کے ساتھ انگیز کیا جو آپ کو قریب ترین لوگوں سے پہونچیں۔ میں نے محسوس کیا کہ اس بات سے میں ایک ایسی روحانی مدد حاصل کر رہا ہوں جس کی مجھ کو اور تمام مسلمانوں کو سخت احتیاج ہے۔

میری آنکھوں میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی اس تواضع اور فروتنی کا نقشہ پھر گیا جو آپ اپنی انتہائی عظمت و بلندی کے باوجود کیا کرتے تھے اور اس حد تک کرتے تھے کہ معلوم ہوتا تھا کہ اپنے عظیم الشان مرتبہ کا انکار ہی فرما دیں گے ـــــ میں نے یہ پر عظمت سبق یاد کئے اور دل سے اللہ تعالیٰ کی طرف متوجہ ہو کر ملتجی ہوا کہ مجھ کو میرے دو زبردست دشمنوں (عجب و تکبر) سے محفوظ رکھے اور اپنے سے میرا تعلق اس قدر قوی بنا دے کہ کبھی ٹوٹنے نہ پاوے۔ دوسروں کے حقوق شناسی میں ترقی عطا فرمائے اور اپنے حقوق کے بارے میں چشم پوشی کا عادی بنائے! میں یہی پسند کرتا ہوں کہ اللہ سبحانہ وتعالیٰ سے اس حال میں ملوں کہ میرے ذمہ کوئی ایسا حق نہ ہو جو میں نے صاحب حق کو ادا نہ کر دیا ہو اور نہ میرے کانوں میں کسی مظلوم کی کوئی آواز باقی ہو جس کا میں نے جواب نہ دیا ہو اور نہ کسی فریادی کی فریاد ایسی رہی ہو جس کی دادرسی میں میں نے کوتاہی کی ہو۔

صاحبین مکرمین

پھر میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے دونوں ساتھیوں کی آرام گاہوں کی طرف ادب سے نظر اٹھائی اور میرے خیالات کا رُخ آپ کے ان دونوں عظیم ساتھیوں کے یادگار کارناموں کی طرف پھر گیا، کہ کس طرح پہلے ساتھی نے مرتدوں اور نفاق پسندوں کی سرکوبی کر کے اسلام کو از سر نو طاقت اور غلبہ بخشا اور کس طرح دوسرے ساتھی نے اسلام کا عدل و انصاف دنیا میں پھیلایا حتی کہ امن اس قدر عام ہو گیا کہ ایک سرِ راہ سو رہنے والا بے خطر مزے کی نیند لے سکتا تھا ـــــ میں نے اس مقامِ پاک میں اللہ سے دعا کی کہ مصر کو موقع عطا فرمائے کہ وہ ایمان و اور امن میں اس غایت عُلیا تک پہونچ سکے!

مثالی ایثار

پھر میرا طائر خیال مجھے اس دن کی طرف لے کے پہنچا جس دن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کا وہ پہلا ساتھی (صدیق اکبرؓ) ہجرت کے ارادہ سے مکہ سے نکلے تھے میں نے دیکھا کہ کس طرح کفار نے ان کا پیچھا کیا تا حق کی آواز کو خاموش کر دیں اور نور خدا کو بجھا دیں! اور کس طرح اپنے رفیق مکرم کے لئے ابوبکر کی فکر مندی اپنی انتہا کو پہنچ رہی تھی کہ انھوں نے نہ اپنی ذات کا خیال کیا نہ گھر کی فکر کی اور نہ اولاد کے دام محبت میں دل کو پھنسنے دیا بلکہ صرف حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو دیکھا اور

آپ کی دعوت کو دیکھا کہ ان کو کسی طرح کی گزند نہ پہونچ جائے ــــــ پھر مجھے یاد آیا کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کا اپنے رب پر کیسا ایمان اور کتنا اعتماد تھا! (جس کا مظاہرہ اس واقعہ میں ہوا) میں نے اپنے رب سے دعا کی کہ بار الٰہا! ہمارے قلوب پر بھی اس عظیم قربانی کے نور کی ایک کرن ڈال دے اور ہمارے اخلاق میں بھی اس نادر المثال اخلاص کو سمو دے! ــــــ ہم اس بات کے کس قدر حاجت مند ہیں کہ ہر ایک شخص اپنے ساتھی کے ساتھ اخلاص کا برتاؤ کرے تاکہ ہم خودغرضی کے مرض کو ایثار کی طاقت سے مغلوب کر سکیں۔

عظیم ورثہ اسی جا مجھے خیال آیا کہ ہمارے پاس اخلاق کا ایک عظیم القدر ورثہ ہے! زندگی کا مثالی نمونہ ہے جو یقیناً ایک بے بہا سرمایہ ہے! اس میں شرافت ہے، شجاعت ہے، شوکت ہے، فیاضی ہے، مردانگی ہے، ایثار ہے، اخلاص ہے اور تمام وہ گہر ہائے اخلاق ہیں جو اسلام نے ہمارے اسلاف میں ودیعت کئے تھے، جن کی وجہ سے دنیا کی ہر سعادت ان کی قدم بوس رہی ــــــ لیکن ہم اس عظیم ورثہ کو ضائع کر رہے ہیں! اس ضیاع کی وجہ نہ یہ ہے کہ ہم تعداد میں کم ہیں، نہ یہ کہ ہماری عقلیں ناقص ہیں اور نہ یہ کہ ہمارے ادراک کی قوت پرواز کم ہے بلکہ وہ صرف اس لئے ضائع ہوتا جا رہا ہے کہ ہمارے ایمان میں ضعف ہے ہمارے یقین میں خامی ہے اور ہم پر اللہ تعالیٰ کے جو حقوق ہیں ان کی طرف سے ہمارا رویہ بہت کوتاہی اور لاپروائی کا ہے اور بخدا اس خطرناک انجام سے نجات ــــــ جس کی طرف ہم سب عرب بڑھے چلے جا رہے ہیں ــــــ صرف اسی طرح ممکن ہے کہ ہم اپنے قلوب کو ایمان سے معمور کریں، اپنے سینوں کو یقین سے آباد کریں اور اچھی طرح سمجھ لیں کہ ہم اپنی ذات اور اپنے وطن کی تعمیر ایک وقت میں نہیں کر سکتے بلکہ ضروری ہے کہ ذات کو بھول کر وطن کی تعمیر میں لگ جائیں جس کو غلامی کے فساد نے بربادی کے کنارے لگا دیا ہے!

یہ خیالات تھے جو چند لمحوں میں میرے دل میں گزرے ــــــ خیالات کتنی تھوڑی دیر میں برسوں کی سیر کر لیتے ہیں اور کتنی جلدی آفاق میں گھوم لیتے ہیں! ــــــ پھر میں نے اپنے آپ کو دیکھا تو میں اپنی جگہ ہی کھڑا تھا ــــــ روضۂ پاک کے سامنے ــــــ اور اپنے ہاتھ الحاح و تضرع کے ساتھ اللہ کے حضور میں اٹھا رہا تھا کہ میرے لئے وہ وسائل مہیا فرما دے جن سے ہم پر اس کا قول (کُنتُمْ خَيْرَ أُمَّةٍ أُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ الآیۃ) صادق ہو جائے!

تعارف و تبصرہ

مکاتیب حضرت مولانا محمد الیاس رح

مرتبہ مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندوی ضخامت ۱۴۴ صفحات مجلد، قیمت عہ، شائع کردہ کتب خانہ انجمن ترقی اردو جامع مسجد دہلی۔

صاحب مکاتیب حضرت مولانا محمد الیاس رح اور مرتب مکاتیب مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندوی دونوں شخصیتیں ناظرین الفرقان کی جانی پہچانی ہیں۔ ان کے افکار و خیالات الفرقان کے سیکڑوں صفحات پر ثبت ہیں۔ اکثر مکاتیب خود مرتب مدظلہ کے نام ہیں باقی کچھ خاص رفقاء اور کارکنوں کے نام۔ ان مکاتیب میں حضرت مرحوم نے اپنے دل کی باتیں کہی ہیں، اور ان کے دل کی باتیں کیا تھیں؟ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے لائے ہوئے دین کی فکر، دوسروں کو اس فکر پر ابھارنا، پوری دل سوزی کے ساتھ اس کی دعوت دینا، اس دعوت میں مرنے اور کھپنے کو محبوب بنانا، اس کام کی بلندی ظاہر کرنا اور اس کے فضائل اور اللہ تعالیٰ کی نگاہ میں اس کی قدر و منزلت ذہن نشین کرنا۔

الغرض یہ خطوط ایک آئینہ ہیں جس کے سامنے مولانا مرحوم نے اپنا دل کر دیا ہے۔ پڑھنے والا اس آئینہ میں ان کے دل کا اصلی حال دیکھ سکتا ہے! قدرتی طور پر اس عکس میں کچھ رموز بھی آ گئے ہیں جن کا سمجھنا ہر ایک کے بس کی بات نہیں۔ تشریحی نوٹ اور "فوائد" تقریباً ہر صفحہ پر ہیں مگر اس باب میں وہ بھی کسی اجنبی کی پوری مدد نہیں کرتے۔

فتوائے دیوبند کا تحقیقی جائزہ

از مولوی ابو محمد امام الدین رام نگری ضخامت ۱۱۸ صفحات قیمت عہ۔ ناشر مکتبہ تحفظ اردو۔ رام نگر بنارس اسٹیٹ

پچھلے دنوں حلقۂ دیوبند کی جانب سے جماعت اسلامی کی بہت سخت مخالفت شروع ہوئی تھی

اس سلسلہ میں بہت سے فتوے اور بیانات شائع ہوئے ایک بہت مفصل فتویٰ "آئینہ تحریک مودودی" کے نام سے مولانا مہدی حسن صاحب صدر مفتی دارالعلوم دیوبند نے تحریر فرمایا تھا یہ کتاب اس فتوے کا رد ہے۔ پیش لفظ میں کافی تیزی ہے۔ جو ایسی "شدید جنگ" کا قدرتی نتیجہ ہے مگر اصل جواب میں مصنف کا قلم طنز و تعریض اور پھبتی بازی سے زیادہ اثبات مدعا کی طرف متوجہ رہا ہے اور جواب کو مدلل کرنے کی اپنی حد تک زیادہ سے زیادہ کوشش کی گئی ہے۔

اعتراض و جواب کا تقابل بڑی تفصیل چاہتا ہے جس کا ان محدود صفحات میں کوئی موقع نہیں، البتہ ایک بہت دلچسپ بات جو اس جواب میں ہم نے نوٹ کی ہے، وہ تو سن ہی لیجیے۔ مصنف نے مولانا محمد منظور صاحب نعمانی زید مجدہم کو جماعت کے دفاع کے لیے جگہ جگہ استعمال کیا ہے ——— اور ہم انہیں کہتے کہ بے جا استعمال کیا ہے ——— مگر یہ بات کتنی عجیب ہے کہ جس شخص کی بات آپ اپنے حق میں وزنی قرار دیتے ہیں اسی کی دوسری بات کا اپنے اوپر کوئی وزن ماننے کے لئے تیار نہیں ہیں، "میٹھا میٹھا ہپ ہپ" کر لینے کے بعد جہاں کڑوا آتا ہے وہاں کھٹ سے "تھو تھو" کر دیتے ہیں! ——— جماعت اسلامی اور علماء دیوبند کے مناقشہ کے سلسلہ میں مولانا موصوف کا بھی ایک مضمون الفرقان میں شائع ہوا تھا۔ اس میں مولانا نے پہلے علماء کرام کے رویہ پر کچھ تنقید کی تھی، اس کے بعد جماعت اسلامی کے طرز فکر و عمل کی کمزوریوں کی طرف جماعت کے ذمہ داروں کو توجہ دلائی تھی۔ اس کتاب کے خاتمہ میں اس مضمون کے پہلے حصہ کا ایک اقتباس پیش کیا گیا ہے، اور اس کو ختم کر کے دفع دخل مقدر کے طور پر یہ حاشیہ دیا گیا ہے۔

"اس مضمون میں مولانا نعمانی نے جماعت اسلامی کے بارے جو کچھ تحریر فرمایا ہے اس کی تنقید مولانا ابواللیث نے نومبر و دسمبر ۱۹۵۱ء کے ماہنامہ زندگی میں کر دی ہے۔"

اس طرز عمل کے بعد کیا فاضل مصنف امید رکھتے ہیں کہ مولانا نعمانی کی تحریروں کے اقتباسات جماعت اسلامی کے مخالفین کے لئے حجت بن سکیں گے؟ ایک شخص کو اتنا متوازن، انصاف پسند اور فراخ دل ماننے کے بعد جب آپ خود اس کی کوئی بات ماننے کے لئے تیار نہ ہوں تو دوسروں کو کس امید پر اس کی باتیں سنا رہے ہیں!

بھارت کی نئی تعمیر اور ہم — از مولانا ابواللیث صاحب اصلاحی ندوی۔ قیمت ۶؍
ملنے کا پتہ، مکتبہ جماعت اسلامی ہند رام پور۔ یو۔ پی۔

نومبر ۱۹۵۲ء میں حیدرآباد دکن میں جماعت اسلامی ہند کا سالانہ اجتماع منعقد ہوا تھا۔ اس میں

امیر جماعت نے جو عام خطاب فرمایا تھا اس کو اس نام سے کتابی شکل میں شائع کیا گیا ہے۔ اس میں انھوں نے اپنی دعوت کو اس پہلو سے پیش کیا ہے کہ وہ ملک کی تعمیر نو میں کس درجہ مفید ہو سکتی ہے۔

جو اصحاب جماعت اسلامی ہند کی دعوت، اس کے مقصد اور طریقہ کار کو سمجھنا چاہیں ان کیلئے اس رسالہ کا مطالعہ مفید ہوگا۔

سود (حصہ دوم) از مولانا سید ابو الاعلیٰ صاحب مودودی ضخامت ۲۴۲ صفحات مجلد قیمت عہ/ مکتبہ جماعت اسلامی ہند رام پور یو۔پی۔

سود انسانی سوسائٹی کی وہ "خوش نصیب" برائی ہے، جو اسلام کے سوا ہر نظام زندگی میں ناگزیر سمجھ کر برداشت کی جاتی رہی ہے اور انتہا یہ ہے کہ آج کے جدید نظامہائے حیات میں بھی جن کی ساری آہ و بکا عوام کی خوش حالی، آزادی اور ایک ویلفیر اسٹیٹ کے قیام کے لئے ہے، اس لعنت کو بلا کسی ناگواری کے برداشت کیا جا رہا ہے، اس پر تو کبھی بحث ہوتی ہی نہیں کہ سود خواری باقی رکھی جائے یا ختم کر دی جائے! زیادہ سے زیادہ بحث اگر ہوتی ہے تو اس پر کہ شرح سود کیا ہونی چاہئے، کتنی شرح سود منصفانہ ہے اور کتنی غیر منصفانہ؟ اور اس سے بھی زیادہ حیرت انگیز بات یہ ہے کہ بعض علماء اسلام بھی بینکوں کے سود کو جائز سمجھنے لگے ہیں!

اس کتاب میں اس مسئلہ پر سیر حاصل بحث کی گئی ہے، سود کی قدیم و جدید صورتوں کو سامنے رکھ کر ان کے مجوزین کے تمام دلائل کا جائزہ لیا گیا ہے اور عقل و استدلال کی روشنی میں ثابت کیا گیا ہے کہ اس ملعون سسٹم کی برائی اس سے حبہ بھر بھی کم نہیں ہے جتنی اسلام نے بتلائی ہے! چاہے اس کی صورت انفرادی ساہوکاری (مہاجنی) کی ہو یا بینکنگ کی! چاہے قرضہ دفع ضرورت کے لئے لیا گیا ہو یا حصول منفعت کے لئے اور چاہے قرضے لینے والے افراد ہوں یا حکومت! بہر صورت، نہ صرف یہ کہ یہ ایک انتہا درجہ کی دنائت اور خساست ہے بلکہ ایسی متعدی برائی ہے کہ معاملہ بظاہر چند آدمیوں کے درمیان ہوتا ہے مگر اس کے انسانیت کش اثرات ملک کی پوری آبادی پر پڑتے ہیں اور اگر غور سے دیکھا جائے تو پستے ہوئے عوام کی تباہی میں سب سے بڑا ہاتھ انھیں مہاجنوں اور بینکوں کے سود کا ہے۔

کتاب کا نام تو "سود" ہے مگر کتاب کی ترتیب اور مباحث کی تقسیم سے معلوم ہوتا ہے کہ کتاب کا موضوع تنہا حرمت سود نہیں بلکہ "ایک متوازن نظام معیشت" ہے جس کا ایک رکن حرمت سود ہے، اسی وجہ سے کتاب کے نصف اول میں ان مختلف نظامہائے معیشت کا جائزہ لیا گیا ہے جن پر مغربی اقوام پانچویں صدی

سے اب تک کے عرصہ میں عمل پیرا رہی ہیں. مثلاً جاگیرداری، لبرلزم، سرمایہ داری، سوشلزم، کمیونزم اور فاشزم اور ان کے نفع نقصان کا میزانیہ بھی سامنے آتا چلا گیا ہے۔ پھر حاصل مطالعہ کے طور پر اس تاریخ کا سبق سامنے آتا ہے اس کے بعد ان الجھنوں کا اسلامی حل پیش کیا گیا ہے جن کے حل کرنے کے لئے تاریخ اتنی بے قراری سے کروٹیں بدلتی رہی. اور اسی منظر کو دیکھ کر ہیگل اور مارکس یہ سمجھ بیٹھے کہ انسانی تمدن کے ارتقار کی فطری چال یہی ہے"۔

"اسلامی حل کی تفصیلات میں" مالیات" کے عنوان کے تحت ص۲۱۱ پر مولانا نے لکھا ہے کہ :-

علیٰ ہذا القیاس یہ بھی جائز نہیں ہے کہ نقد خریداری کی صورت میں ایک مال کی قیمت کچھ ہو اور قرض خریدنے کی صورت میں اس سے زیادہ ہو"

یہ بات کتب فقہ کی صراحت کے خلاف ہے، اگر مولانا کا اپنا اجتہاد تھا تو اس کی تصریح ہونی چاہئے تھی۔

"حرمت سود (سلبی پہلو) کے زیر عنوان متوازن معیشت کے نقشہ کے جو چار ارکان گنائے گئے ہیں. ان میں تیسرے اور چوتھے نمبر کی ترتیب غالباً اُلٹ گئی ہے اس لئے کہ تشریح میں تیسرے رکن کے نام سے قانون وراثت کو یاد کیا گیا ہے حالانکہ نمبر شمار کے لحاظ سے وہ چوتھا رکن ہے۔

سوسائٹی کے کاروبار میں چونکہ اس سودی نظام کی جڑیں بہت گہری ہو چکی ہیں اس لئے آدمی اس کی خناعتوں کو تسلیم کرتے ہوئے بھی سوچتا ہے کہ اس کے بغیر کام کیسے چلے گا اور مالیات کی گاڑی بغیر سود کے کیسے کھنچے گی؟ کتاب کے آخری تیس صفحے اسی سوال کا جواب ہیں. مگر یہ حصہ باقی حصہ کے مقابلہ میں کچھ کمزور سا ہے اور مولانا کو خا[illegible] یہ احساس خود بھی ہے چنانچہ مولانا نے شروع ہی میں لکھ دیا ہے کہ اس بات کا پورا جواب کار گہ عمل میں دیا جا سکتا ہے کاغذ پر نہیں اور یہ حقیقت بھی ہے کہ جب تک حب آخرت اور انسانی اخوت کی بنیاد پر اسلام کی مطلوبہ اخلاقی فضا قائم نہ ہو تنہا ذہن واستدلال سے اسلامی نظام معیشت کی کامیابی کا قائل کر دینا بہت مشکل ہے، ایثار واخوت کی اس فضا کو دیکھ کر ہی آدمی کو یقین آسکتا ہے کہ بغیر مادی منفعت کے لالچ کے بھی قرضے مل سکتے ہیں۔

اپنے موضوع پر نہایت بصیرت افروز تصنیف ہے. ہر تعلیم یافتہ مسلمان کے مطالعہ میں آنی چاہئے!

تاریخ دیوبند

از جناب سید محبوب صاحب رضوی، ۰۸ا صفحات کتابت وطباعت بہتر مجلد قیمت دو روپے. شائع کردہ ادارہ "تاریخ دیوبند"۔ دیوبند۔ یو۔ پی

قصبہ دیوبند خود کوئی تاریخی مقام نہیں مگر دار العلوم دیوبند نے اُسے شہرت دوام بخشدی ہے، اس

کتاب میں اسی خوش نصیب قصبہ کی تاریخ بیان کی گئی ہے اور چونکہ اس کی ساری قدر و منزلت اور تمام تر شہرت صرف اس دارالعلوم کی رہین منت ہے اس لئے قدرتی طور پر کتاب کا دو تہائی حصہ دارالعلوم کے تذکرہ کی نذر ہے جس میں تاسیس مدرسہ سے لے کر موجودہ اوقات تعلیم تک کا ذکر پوری شرح و بسط کے ساتھ آپ کو ملے گا، گویا کوئی چیز حتی الامکان چھوٹی نہیں ہے۔ دارالعلوم سے متعلقہ تعمیرات، دارالعلوم کا عملہ اساتذہ و طلباء، ان کی تعداد، ان کا طرز بود و باش، آمد و صرف، نصاب تعلیم خصوصیات تعلیم نتائج امتحانات تقسیم انعامات و اسناد مختلف تعلیمی انتظامی شعبہ جات، ان کے دفاتر، اب تک کے حضرات صدر المدرسین اور مہتمم خاص خاص فضلاء دارالعلوم وغیرہ وغیرہ۔

فضلاء دارالعلوم کی فہرست میں مولانا سید ابوالحسن علی صاحب حسنی ندوی کا اسم گرامی بھی درج ہے، یہ کوئی سہو معلوم ہوتا ہے۔ مولانا موصوف دارالعلوم کے فاضل تو کیا معنیٰ اس کے باقاعدہ طالب علم بھی نہیں رہے ہیں، ہاں چند مہینے بعض اسباق میں سامع کی حیثیت سے شریک رہے ہیں!

حقیقت نفاق

از مولوی صدرالدین صاحب اصلاحی۔ ۵۲ صفحات قیمت ۴؍
مکتبہ جماعت اسلامی ہند رام پور۔ یوپی۔

یہ ایک بہت پرانا مضمون ہے جو ماہنامہ ترجمان القرآن میں شائع ہوا تھا اور اب مکتبہ جماعت اسلامی ہند نے کتابی صورت میں شائع کیا ہے۔ اس کا مقصد یہ ہے کہ لوگ اسلام کیا ہے کے ساتھ اسلام کیا نہیں ہے سے بھی واقف رہیں تحریر میں "تلخی احساس" اور "شدت درد" اس قدر بے پناہ ہے کہ مقدمہ میں مصنف کو اس کی معذرت کرنا پڑی ہے لیکن سمجھ میں نہ آیا کہ اس معذرت میں واعظ بیچارے کی مٹی پلید کرنے کی کیا ضرورت تھی؛ لفظ واعظ جس طرح علی الاطلاق بولا گیا ہے، وہ تو اس بات کا ثبوت ہے کہ مصنف کا مشاہدہ احوال امت حد درجہ ناقص ہے، خدا کے فضل سے اس امت میں ابھی ایسے ایسے واعظ موجود ہیں جو ایسی کھری کھری سناتے ہیں کہ سننے والوں کی پیشانیاں شرم سے عرق آلود ہو جاتی ہیں۔ اور اگر واعظوں کی کوئی خاص قسم مراد ہے جو بیشک بکثرت پائی جاتی ہے، جو وعظ نہیں کہتے بلکہ دھندا کرتے ہیں تو کوئی علامت اس تخصیص کی ہونا ضروری تھی۔

بہر کیف آپ اصل کتاب کا تعارف حاصل کیجئے!

اس میں نفاق کی ممکنہ صورتیں اور علامتیں قرآنی آیات کا تتبع کر کے بیان کی گئی ہیں بعض احادیث سے بھی مدد لی گئی ہے اور اس کی روشنی میں ان لوگوں کی صورت پہچنوانے کی سعی کی گئی ہے۔ جو اقامت دین کی تحریک میں کام آنے کے قابل نہیں ہیں اور جن پر اس جدوجہد میں اعتبار نہیں کیا جا سکتا اور ان کا سوشل بائیکاٹ

کرنا چاہیے ـــــ چاہے وہ اعتقادی منافقین ہوں یا عملی!

"دورِ حاضر میں نفاق عقیدہ وعمل کی جو شہادتیں مصنف نے فراہم کی ہیں ان کے نتیجہ میں فیصلہ اس کے سوا کچھ نہیں ہو سکتا کہ اس وقت امت کے کم از کم ۹۵ فیصدی حصہ پر احکام نافذ ہونے چاہئیں! بس اسی کی بنیاد پر ہم یہ عرض کرنا چاہتے ہیں کہ کاش مصنف کم از کم اسی فرق کو ملحوظ رکھتے جو دورِ نبوی کے اور دورِ حاضر کے منافقین اور مخلصین کے تناسب میں اور دونوں زمانوں کے مخلصین کی مرکزیت اور لا مرکزیت میں ہے۔ اگر وہ صرف اتنا ہی کرتے تو نہ قیاس مع الفارق کے مرتکب ہوتے اور نہ وہ بے احتیاطیاں انکے قلم سے سرزد ہوتیں جن کو وہ دعوتی زبان سے تعبیر کرتے ہیں۔

قانون بین الممالک

از جناب ڈاکٹر محمد حمید اللہ صاحب ۲۶۲ صفحات مجلد قیمت درج نہیں۔ مکتبہ ابراہیمیہ حیدرآباد (دکن)

یہ سلطنتوں کے باہمی برتاؤ کا دستور العمل ہے جس میں مسالمانہ تعلقات، مخاصمانہ تعلقات اور غیر جانبداری کے اصول اور نظائر بیان کئے گئے ہیں۔ آخر میں ایک ضمیمہ ہے جس میں موجودہ مجلس اقوام متحدہ کا دستور درج ہے۔ بین الممالکی تعلقات سے دلچسپی رکھنے والوں کے کام کی چیز ہے۔ عام لوگ اس میں شاید کوئی دلچسپی اپنے لئے نہ پائیں گے ـــــ تصنیف بہت پہلے کی ہے ہمارے سامنے طبع ثانی ہے جو خود بھی کافی دنوں کا ہے۔

ماہنامہ صبح صادق

ادارہ تحریر: مولانا محمد ادریس صاحب ندوی نگرامی۔ مولوی ارشد حسین ندوی۔ ۴۸ صفحات سالانہ چندہ چار روپئے۔ دفتر صبح صادق مکارم نگر لکھنؤ

یہ دینی و اصلاحی ماہنامہ ڈیڑھ سال سے نکل رہا ہے "قرآن کا پیام" اور "کلام خیر الانام" اس کے مستقل عنوان ہیں جن کے ذریعہ ہر ماہ عام مسلمانوں کے ایمانوں کو تازہ اور ان کے اعمال کو اسوۂ حسنہ سے قریب کرنے کی سعی مشکور کی جاتی ہے۔ آخر میں عورتوں اور بچوں کے لئے چند صفحات مخصوص ہیں جن میں مسلمان گھرانوں کو نور اسلام سے منور کرنے کا خاصا سامان ہوتا ہے اس کے علاوہ کئی ایک اور آسان، دلچسپ اور موثر مضامین حسن مقصد اور حسن ترتیب کے آئینہ دار رہتے ہیں۔

کلام خیر الانام کے زیرِ عنوان احادیث کی تشریح کے سلسلہ میں جس احتیاط اور ناپ تول کی ضرورت ہے وہ نوجوان مضمون نگار سے مخفی نہ ہوگی اس لئے ضرورت ہے کہ وہ اس میں کسی حد پر قناعت نہ کریں۔

ہماری دعا ہے کہ یہ پودا پھلے پھولے اور اللہ تعالیٰ اس سے مسلمانوں کی اصلاح کا بیش از بیش کام لیں۔

انتخاب

از ——— ادارہ

سچی باتیں ۱۰ر دسمبر۔ بنگلور۔ آج شہر میں کیسی چہل پہل اور کیسا جشن ہے؟ اور کیوں نہ ہو، راج پرمکھ میسور کے آگے ہندوستان کا ایک نامور ترین ہواباز کپتان ناجوشی اپنے کرتب کل ہی تو دکھانے والا ہے۔ صرف ایک شب درمیان ہے اور عین اس وقت بھی ان کرتبوں اور قلابازیوں کی مشق فضا میں کر رہا ہے۔ مشاق ہواباز بار بار کی بازیاں مارے ہوئے اور انعام پائے ہوئے۔ اور سیلون میں اس کا یہ کارنامہ اسی جولائی میں دکھایا ہوا تو ابھی بہتوں کی یاد میں تازہ ہے کہ یہ مدت تک جہاز کو اُلٹا اُڑاتا رہا۔ جس طرح انسان سر کے بل کھڑا ہو جائے ——— لیکن ارے یہ کیا! یہ آج دیکھتے ہی دیکھتے اس کا کرتبی جہاز اُلٹتا ہے، اور ہواباز سر کے بل باہر گرتا ہے، معاً مغز پاش پاش ہو جاتا ہے اور شاہی ہواباز کو دنیا کی تماشا گاہ سے رخصت ہوتے منٹوں کی بھی دیر نہیں لگتی! ——— متحیر و بے خود دنیا ابھی اپنے حواس بھی درست نہ کرنے پائی کہ کل ۴۸ گھنٹے بعد خبر ناگپور سے آتی ہے کہ مدراس کے لئے جو جہاز ۱۲ر دسمبر کو رات کے پچھلے حصہ میں اُڑا، اس کا ایک انجن تو کہنا چاہئے معاً بیکار ہو گیا اور دوسرا انجن جس پر پورا بھروسا تھا اس میں اسی وقت آگ لگ گئی! جہاز ہوائی اسٹیشن سے صرف چند میل کے فاصلہ پر تھا کہ ایک بیہڑ مقام میں گرا، اور ۲۸ مسافروں اور اہل عملہ میں سے کُل ایک متنفس (خود جہاز راں) زندہ جل مرنے سے نیم جاں حالت میں بچا! ——— اور مرنے والوں میں ایک مشہور و مقتدر اخباری ایجنسی کا ایک نوجوان رپورٹر بھی تھا جو اپنے باپ کے جنازے میں شریک ہونے مدراس کے قریب کہیں جا رہا تھا!

یہ خبریں ساری دنیا کی نہیں۔ سارے ایشیا کی بھی نہیں۔ صرف ایک ملک ہندوستان سے متعلق ہیں۔ اور وہ بھی ہفتہ بھر کی نہیں، پورے نصف ہفتہ کی بھی نہیں، صرف تین دن کی ہیں!! اس پر قیاس

سارے ملکوں کا، اور پورے کا ہفتہ کا از خود کر لیجئے ـــــ ساری بشری تدبیروں، ساری انسانی احتیاطوں عقل کی ساری کارگزاریوں کے بعد بھی کسی ایک لمحہ یا پل کا بھی فرق اس وقت میں اب تک بڑھ سکا یا آئندہ بڑھ سکتا ہے، جو ہر ایک روح کا اپنے وطن کی واپسی کے لئے مقرر ہو چکا ہے؟ الزام ہر دفعہ انسان، انسان ہی پر لگائے گا کہ فلاں حادثہ جو پیش آیا۔ وہ فلاں انسان کی غفلت یا نااہلی سے ہے۔ ذمہ دار ہر حال میں انسان انسان ہی کو ٹھہرائے گا ـــــ نادانی و خود بینی کا ایک مسلسل چکر ہے، جو انسان کو بے طرح جکڑے ہوئے ہے!

(صدق جدید)

(صفحہ ۳۲ کا بقیہ)

تاریخی تصنیفات انھوں نے صرف اس تنقید اور مشورہ پر اکتفا نہیں کی بلکہ ایک مبسوط کتاب المنتظم فی تاریخ الملوک والامم لکھی جو دس جلدوں میں ہے اور جو ابتدائے اسلام سے لیکر ۵۷۴ھ تک کے حالات پر مشتمل ہے مصنف پہلے سنہ لکھتے ہیں پھر اس سنہ کے اہم واقعات وحوادث کا تذکرہ کرتے ہیں، پھر اس سنہ میں جن ممتاز اور قابل ذکر اشخاص کا انتقال ہوا ہے ان کے حالات بیان کرتے ہیں اس طرح یہ کتاب حالات اور تذکرہ دونوں کی ایک جامع تاریخ ہے[1]

اسی طرح انکی ایک مختصر کتاب، تلقیح فھوم اھل الأثر فی عیون التاریخ والسیر ہے جو ایک تاریخی بیاض کی حیثیت رکھتی ہے جس میں بہت سے تاریخی معلومات یکجا کر دیے گیے ہیں[2]

ادبیت وخطابت ابن جوزی کی فصاحت وبلاغت اور حسن خطابت پر مورخین کا اتفاق ہے انکی مجالس وعظ کی مقبولیت اور لوگوں کے ازدحام کا یہ بھی ایک بڑا سبب تھا، انھوں نے صید الخاطر ہی میں اپنی اس ذہنی کشمکش کا بھی ذکر کیا ہے کہ نفس نے ان کو اس کی ترغیب دی کہ وہ اس کا اہتمام بالکل چھوڑ دیں اور الفاظ کی طرف بالکل توجہ نہ کریں یہ سب تکلف اور تصنع ہی لیکن انھوں نے اپنے علم اور تفقہ سے اس خیال کو دفع کیا اور اپنے نفس کو سمجھا لیا کہ یہ حسن کلام ایک خداداد قابلیت، ایک ہتھیار اور ایک کمال کی بات ہے، نہ کہ نقص اور عیب، اس لیے انکو دعوت وتبلیغ میں

---

[1] اس کتاب کے آخری پانچ حصے دائرۃ المعارف حیدرآباد کیطرف سے شائع ہوئے ہیں [2] یہ کتاب ہندوستان میں شائع ہو چکی ہے

اس سے کام لینا چاہیئے اس کی ناقدری نہیں کرنی چاہیئے۔[1] اسی طرح ان کے دل میں کبھی بار بشدت اس کا خیال پیدا ہوا کہ وہ اس وعظ گوئی اور دعوت و تبلیغ کو چھوڑ کر زہد و انقطاع کی زندگی اختیار کر لیں اور لوگوں سے بالکل یکسو ہو کر گوشہ نشین ہو جائیں مگر انھوں نے دلائل و براہین سے اور اپنے نفس سے مفصل مباحثہ و مناظرہ کر کے اس خیال کو ہٹایا اور اس کو قائل کیا کہ یہ القاء شیطانی ہے شیطان یہ دیکھ نہیں سکتا کہ ہزاروں آدمی اس کے جال سے نکل کر ہدایت کے راستہ پر پڑ جائیں، انبیاء علیہم السلام کا راستہ دعوت و تبلیغ کا تھا اور ان کی زندگی اجتماع و اختلاط کی تھی، اس میں نفس کا چور یہ ہے کہ وہ بیکاری اور تعطل کو پسند کرتا ہے اور جد و جہد سے بھاگتا ہے، دوسرے اس میں جاہ طلبی بھی ہے اس لیے کہ عزلت و گوشہ نشینی اور زہد و انقطاع کی زندگی عوام کے لیے زیادہ باعث کشش اور جاذب توجہ ہے۔[2]

غرض یہ کہ شیطان ان کو افادۂ عوام اور عمومی دعوت کے کام سے ہٹا نہیں سکا، انھوں نے اپنی ساری دماغی صلاحیتیں اور خدا کی بخشی ہوئی طاقتیں اصلاح پر لگا دیں اور نصف صدی سے زیادہ پورے انہماک و قوت کے ساتھ اصلاح و افادہ کے کام میں مشغول رہے۔

[1] و [2] ص ۱۲۶، ۱۲۷

Regd. No —(A 353.)

Printed at:—NAMI PRESS, Lko

ماہنامہ

الفرقان لکھنؤ

ہماری دعوت

لا الٰہ الا اللہ محمد رسول اللہ

اسی کلمہ پر اسلام کی بنیاد ہے اور ہمارا ایمان ہے کہ یہی انسانیت کی نجات کا کلمہ ہے
لیکن یہ صرف ایک بول ہی نہیں ہے، بلکہ ایک شہادت، ایک اصول اور ایک اہم فیصلہ ہے، دراصل یہ
اس بات کا عہد ہے کہ ہم صرف اللہ کی عبادت اور بندگی کریں گے، اور زندگی کے ہر شعبہ میں اس کی بھیجی ہوئی
اور حضرت محمد صلعم کی لائی ہوئی ہدایت اور شریعت کی پیروی کریں گے اور اسی حال میں جئیں گے اور مریں گے۔
جو لوگ اس کلمہ پر ایمان لا چکے ہیں ان کا فرض ہے کہ زندگی اس عہد کے مطابق گزاریں اور اسی ایمانی
زندگی کو دنیا میں رواج دینے کی کوشش کریں، وہ اسی لیے پیدا ہوئے ہیں۔ ہم اس کا
عہد کرتے ہیں اسی کی دعوت دیتے ہیں اور اسی پر جینا اور مرنا چاہتے ہیں۔

فاطر السمٰوٰت والارض انت ولیی فی الدنیا والآخرۃ
توفنی مسلما والحقنی بالصالحین

"ادارہ الفرقان"

مدیر و مسئول

محمد منظور نعمانی عفا اللہ عنہ

جلد ۲۱	ماہ جمادی الاخریٰ ۱۳۷۳ھ مطابق فروری ۱۹۵۴ء	شمارہ ۶

پاکستان میں چندہ :- سکریٹری ادارہ اصلاح و تبلیغ آسٹریلین بلڈنگس لاہور کے نام بھیجئے اور ہمیں فوراً اطلاع دیدیجئے۔

تاریخ اشاعت :- ہر انگریزی مہینے کی ۱۵ ر

اگر رسالہ نہ پہونچنے کی اطلاع ۲۵ ر تاریخ کو دیدی جائے تو دوبارہ بلا قیمت ارسال کر دیا جاتا ہے۔

سُرخ نشان اگر اس دائرہ میں سُرخ نشان لگا ہے تو مطلب یہ ہے کہ آپ کا چندہ ختم ہو چکا ہے براہ کرم نئے سال کے لیے چندہ ارسال فرمائیں ورنہ اگلا رسالہ بذریعہ وی پی ارسال کیا جائیگا۔ وی پی خرچ کا ہوگا۔

(مولوی) محمد منظور نعمانی پرنٹر و پبلشر نے تنویر پریس لکھنؤ میں چھپوا کر دفتر الفرقان گوئن روڈ لکھنؤ سے شائع کیا۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

نگاہِ اوّلین

(گذشتہ سے پیوستہ)

وحدتِ ادیان کے جس تصور پر گفتگو ہے جیسا کہ بتلایا جا چکا ہے وہ یہ ہے کہ ہر دین ہر مذہب اور ہر دھرم سچا ہے اور خدا رسی کا ذریعہ ہے، مختلف مذہبی راستوں میں سے جس راستہ کو بھی آدمی اختیار کرلے وہ خدا کا قرب اور اسکی رضا حاصل کر سکتا ہے۔ یا دوسرے الفاظ میں حق اور سچائی ایک ہی ہے، مذہب کا مقصد اسکی تلاش ہے، مختلف قومیں اور مختلف ملکوں کے باشندے اسکی تلاش کے لیے جن طریقوں کو بھی اپنائیں ان میں حق و باطل کی کوئی تفریق نہیں ہے۔ بلکہ حق پرستوں کا کام یہ ہے کہ سب کو حق سمجھیں۔

یہ تصور در اصل ہندو مت کا ہے ____ اسی لیے اس مذہب میں اپنے دائرہ سے باہر اپنی تبلیغ کا کوئی خیال ابھی کچھ عرصہ پہلے تک پیدا ہی نہیں ہوا تھا ____ مگر اب مسلمانوں کے سامنے اس تصور کو اس طرح پیش کیا جاتا ہے کہ گویا یہی قرآن کی بھی تعلیم ہے اور بعض لوگ تو بعض آیتیں بھی اسکے ثبوت میں پیش کرنے کی کوشش کرتے ہیں، مثلاً

(۱) اِنَّ الَّذِیْنَ آمَنُوْا وَالَّذِیْنَ هَادُوْا وَالنَّصَارٰی وَالصَّابِئِیْنَ مَنْ آمَنَ بِاللّٰهِ وَالْیَوْمِ الْاٰخِرِ وَعَمِلَ صَالِحًا فَلَهُمْ اَجْرُهُمْ عِنْدَ رَبِّهِمْ وَلَا خَوْفٌ عَلَیْهِمْ وَلَا هُمْ یَحْزَنُوْنَ ۝ (البقرہ ع ۸)

وہ لوگ جو ایمان لائے اور یہود و نصاریٰ اور صابئین جو اللہ اور یوم آخرت پر ایمان لے آئے اور اچھے اعمال کیے بے شک ان کے لیے اجر ہے ان کے رب کے پاس اور انھیں نہ کوئی خوف ہوگا اور نہ وہ غمگین ہوں گے۔

(۲) اِنَّ الَّذِیْنَ یَکْفُرُوْنَ بِاللّٰهِ وَرُسُلِهٖ وَیُرِیْدُوْنَ اَنْ یُّفَرِّقُوْا بَیْنَ اللّٰهِ وَرُسُلِهٖ وَیَقُوْلُوْنَ

جو لوگ منکر ہیں اللہ اور اس کے رسولوں سے اور چاہتے ہیں کہ اللہ اور اس کے رسولوں میں فرق کریں اور کہتے ہیں کہ ہم بعض کو مانتے

تؤمن ببعض و نکفر ببعض و یریدون ان یتخذوا بین ذٰلک سبیلاً اولٰئک ھم الکافرون حقاً ج — ہیں اور بعض کو نہیں مانتے اور چاہتے ہیں کہ (کلی ایمان اور کلی انکار کے) بیچ کی کوئی راہ نکالیں — یہی لوگ ہیں اصل کافر۔

(النساء ع ۲۱)

پہلی آیت سے اس طرح استدلال کیا جاتا ہے کہ دیکھئے اس آیت سے صاف طور پر معلوم ہوتا ہے کہ نجات کسی ایک مذہب میں منحصر نہیں ہے مسلمان ہوں یا یہودی، نصرانی ہوں یا صابی ہر ایک آخرت میں فلاح یاب ہوسکتا ہے، بس شرط یہ ہے کہ اللہ اور یوم آخرت پر ایمان رکھے اور اچھے اعمال کرے، اصل چیز مطلق ایمان اور مطلق عمل صالح ہے نہ کہ اس کا کوئی متعین مفہوم اور متعین صورت —— یہ گویا اس دعوے پر مثبت استدلال ہے۔

اور دوسری آیت سے استدلال اس طرح کیا جاتا ہے کہ اس آیت میں تفریق بین الرسل کو کفر حقیقی قرار دیا گیا ہے لہٰذا مذاہب کی الگ الگ صورتیں، اور مختلف ملتیں جو مختلف انبیاء کی آمد سے وجود میں آئی ہیں ان میں سے کسی کو حق اور کسی کو باطل سمجھنا یہ بھی کفر ہے کیونکہ اس سے وہی تفریق بین الرسل لازم آتی ہے جسے کفر حقیقی قرار دیا گیا ہے —— یہ گویا منفی استدلال ہے۔

لیکن حقیقت یہ ہے کہ وحدت ادیان کے جس تصور سے یہاں بحث ہے اس کی ذرا سی بھی تائید ان آیات سے نہیں ملتی۔ ان لوگوں نے غالباً وحدت دین اور وحدت ادیان کے فرق کو نہیں سمجھا ہے، ورنہ کبھی ان آیات سے استدلال نہ کرتے۔ یہ آیات وحدت دین کی مثبت ہیں نہ کہ وحدت ادیان کی، وحدت ادیان کا تصور تو اتنی غیر معقول بات ہے کہ خدائے حکیم کے کلام میں اس کی تائید تلاش کرنا ہی بے سود ہے البتہ وحدت دین ایک حقیقت ہے اور قرآنی حقیقت ہے۔ ان دونوں آیتوں سے بھی اسی حقیقت کا اظہار ہوتا ہے۔

پہلی آیت میں بتلایا گیا ہے کہ دنیا کے تمام انسانوں اور تمام گروہوں کے لیے نجات کی شاہراہ صرف ایک ہے اور وہ ہے ایمان باللہ، ایمان بالآخرہ اور عمل صالح جو اس پر چلے گا وہ منزل پر جا پہونچے گا اور جو اس کو چھوڑ دے گا وہ کبھی کامیاب نہ ہوسکے گا، چاہے وہ انبیاء کی نسل سے ہو

یا بت پرستوں کی نسل سے ـــــــ قرآن بار بار کہتا ہے کہ اللہ کے تمام پیغمبروں نے اپنے مخاطبین کو یہی پیغام ہدایت دیا اور اس میں کبھی سر مو فرق نہیں ہوا۔

فِطْرَتَ اللّٰهِ الَّتِیْ فَطَرَ النَّاسَ عَلَیْهَا، لَا تَبْدِیْلَ لِخَلْقِ اللّٰهِ ۚ ذٰلِكَ الدِّیْنُ الْقَیِّمُ وَلٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا یَعْلَمُوْنَ ۝ (الروم ع ۴)

یہی ہے خدا کی وہ بناوٹ جس پر اس نے انسانوں کو بنایا ہے (اور) اللہ کی بناوٹ کو کبھی تبدیلی نہیں۔ (بس) یہی سیدھا دین ہے لیکن بہت سے لوگ جانتے نہیں۔

اللہ کا دین ہمیشہ سے انسانوں کی فطرت کے مطابق ہے اور فطرت انسانی میں کوئی تبدیلی نہیں ہوئی اس لیے دین میں بھی کبھی کوئی رد و بدل نہیں ـــــــ اور اس سے بھی صاف الفاظ میں قرآن کہتا ہے۔

شَرَعَ لَكُمْ مِّنَ الدِّیْنِ مَا وَصّٰی بِهٖ نُوْحًا وَّالَّذِیْۤ اَوْحَیْنَاۤ اِلَیْكَ وَمَا وَصَّیْنَا بِهٖۤ اِبْرٰهِیْمَ وَمُوْسٰی وَعِیْسٰۤی اَنْ اَقِیْمُوا الدِّیْنَ وَلَا تَتَفَرَّقُوْا فِیْهِ (الشوریٰ ع ۲)

اس نے (اللہ نے) متعین کر دی ہو تمہارے لیے دین کی وہی راہ جس کا حکم نوح کو دیا گیا تھا اور جس کی ہم نے تیری طرف وحی کی اور جس کا حکم ہم نے ابراہیم اور موسیٰ اور عیسیٰ کو دیا (یہی بات تھی) کہ اسی دین حق کو قائم رکھو اور اس میں باہم اختلاف نہ کرو

اس آیت میں تبلایا گیا کہ سلسلہ نبوت کی پہلی کڑی (حضرت نوح علیہ السلام) سے آخری کڑی (خاتم النبیین حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم) تک دین حق ایک ہی رہا ہے ـــــــ یہی مطلب ہے وحدت دین کا! دوسری آیت میں جو بات کہی گئی ہے وہ گویا اسی کا لازمی نتیجہ ہے کہ جب یہ حقیقت ہے کہ اللہ کے تمام پیغمبر ایک ہی دین کے داعی ہیں تو پھر اس کے کیا معنی ہیں کہ بعض کی تصدیق کی جائے اور بعض کی تکذیب۔ پیغمبر کی تصدیق اور تکذیب کا مطلب اس کی دعوت کی تصدیق اور تکذیب ہوتا ہے لہٰذا ایک پیغمبر کی بھی تکذیب کرنے سے آدمی اس دین قیم کے انکار کا مرتکب ہوتا ہے جو شاہراہ نجات ہو پس اس کا شمار مومنین میں نہیں بلکہ کافرین

یں ہو گا۔

بہرحال یہ ہے قرآن کا تصور وحدت دین! اور اس کے برعکس وحدت ادیان کا مطلب جیسا کہ اوپر گذر چکا ہے یہ ہے کہ دین ایک نہیں متعدد ہیں مگر وہ اپنی غرض وغایت کے اعتبار سے ایک ہیں۔ یعنی سب کی غرض رضائے الٰہی کی طلب اور سب کی غایت رضا کا حصول ہے، اور قابل اعتنا بس یہی چیز ہے ——— بایں معنی وہ متعدد ہونے کے باوجود ایک ہی ہیں۔ پس وہ تمام راہرو جو ایک ہی منزل کی جستجو میں مختلف راستوں پر گامزن ہیں، انھیں چاہیے کہ ایک دوسرے کو مسافران جادہ حق ہی سمجھیں اور ایک دوسرے اپنی مخصوص راہ کے لیے اصرار نہ کریں ——— پھر بتلائیے قرآن کی کوئی آیت اس نظریہ کی تائید کر بھی کیسے سکتی ہے جب کہ یہ قرآنی نظریہ کی بالکل ضد ہے اور تفریق بین الرسل کی ممانعت کا تقاضہ یہ کیوں کر ہو سکتا ہے کہ دو باہم متضاد دینوں کی بیک وقت تصدیق کی جائے۔ قرآن کی تفریق بین الرسل کی ممانعت تو اسی امر پر مبنی ہے کہ تمام انبیاء و رسل ایک ہی دین کے داعی تھے۔

قرآن اس نظریہ کے پہلے جزء کو تو مانتا ہے اور وہ بالکل واقعاتی چیز ہے کہ "دین متعدد ہیں" مگر اس دوسرے جزء کا کھلا انکار کرتا ہے کہ "وہ سب حق ہیں" وہ بنیادی طور پر دین کی دو قسمیں بتلاتا ہے ایک اسلام اور ایک کفر۔ اسلام دین کی اس قسم کا نام ہے جس کی دعوت اللہ کے پیغمبروں نے دی ——— یہی حق ہے اور مقبول ہے ——— اور کفر وہ ہو جسے لوگوں نے خود گڑھا ——— اور یہ باطل ہے اور نامقبول ہے خواہ انسان اپنے اس دین میں خود کو فنا ہی کیوں نہ کر دے!

وَمَن يَبْتَغِ غَيْرَ الْإِسْلَامِ دِينًا فَلَن يُقْبَلَ مِنْهُ وَهُوَ فِي الْآخِرَةِ مِنَ الْخَاسِرِينَ (آل عمران ع ۹)	اور جو کوئی اسلام کے سوا دین کی کوئی اور راہ چاہے گا تو اسکی راہ ہرگز قبول نہ کی جاوے گی اور وہ آخرت میں ٹوٹے میں رہنے والوں میں سے ہوگا۔

یہاں ایک سطحی شبہ ہو سکتا ہے کہ مسلمانوں، یہودیوں اور عیسائیوں کے دین میں تو باہم بہت کچھ اختلاف ہے تو پھر قرآن سب کی تصدیق کیسے کرتا ہے۔

یہ شبہ حقیقت میں بالکل بے بنیاد ہے اور اسی شخص کے ذہن میں آسکتا ہے جس نے قرآن کا مطالعہ نہ کیا ہو بلکہ صرف یہ سن لیا ہو کہ قرآن ان سب کے دین کی تصدیق کرتا ہے۔ قرآن کہیں بھی ان مذاہب کی موجودہ شکلوں کی تصدیق نہیں کرتا بلکہ وہ یہ کہتا ہو کہ اللہ نے ان سب کے پاس وہی دین بھیجا تھا جو محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ذریعہ بھیجا ہو۔ (پڑھیے سورۂ شوریٰ کی وہ آیت جو اوپر گذری شرع لکم من الدین ما وصّٰی بہٖ نوحاً الخ) مگر انھوں نے اس کو اصل حالت میں قائم نہیں رکھا جس سے قدرتی طور پر مذاہب کی الگ الگ صورتیں بن گئیں اور لوگ ان کو لے کر ٹکڑیوں میں بٹ گیے۔

فَرَّقُوا دِيْنَهُمْ وَكَانُوا شِيَعًا كُلُّ حِزْبٍۭ بِمَا لَدَيْهِمْ فَرِحُونَ ۝ (الروم ع ۴)	انھوں نے اپنے (ایک ہی) دین کے الگ الگ کئی دین بنالیے اور ان کے مختلف (مذہبی) گروہ بن گیے۔ ہر گروہ کا یہ حال ہے کہ جو کچھ اس کے پاس ہو وہ اسی میں مگن ہے۔

پھر اس دین کی اصلیت اور اختلاف باہمی کی وجہ بتلاتا ہے کہ

اِنَّ الدِّيْنَ عِنْدَ اللّٰهِ الْاِسْلَامُ قف وَمَا اخْتَلَفَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ اِلَّا مِنْۢ بَعْدِ مَا جَآءَهُمُ الْعِلْمُ بَغْيًاۢ بَيْنَهُمْ ط (آل عمران ع ۲)	دین اللہ کے یہاں (معتبر) صرف اسلام ہے اور یہ جو اہل کتاب کا باہمی اختلاف ہے یہ اس حقیقت سے واقف ہو جانے کے باوجود ہوا ہے۔ صرف آپس کی ضد میں!

قرآن ان مذاہب کی موجودہ صورتوں کو "اسلام" نہیں سمجھتا بلکہ ان سب کو کفر و شرک کے اقسام قرار دیتا ہے اور مسلمانوں کو ان کے پیرووں کا وطیرہ اختیار کرنے سے بچنے کا حکم دیتا ہے۔

وَلَا تَكُونُوا مِنَ الْمُشْرِكِينَ مِنَ الَّذِينَ فَرَّقُوا دِينَهُمْ (الآیۃ)

اور تم نہ ہو جاؤ مشرکین میں سے، ان میں سے جنھوں نے دین کی الگ الگ صورتیں بنا لیں (اور اصل دین کو گم کر دیا)۔

(الروم ع ۴)

پھر قرآن اس اصل دین کو رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے ذریعہ اسکی اصلی صورت میں پیش کرتا ہے اور اہل کتاب کو یاد دلاتا ہے کہ دیکھو یہی تمھاری متاع گم گشتہ ہے آؤ اس کو مضبوطی سے پکڑ لو! اگر تم اپنی اصل پہ آجاؤ گے تو دیکھو گے کہ تمھارے اور مسلمانوں کے درمیان کوئی اختلاف نہیں ہے۔

الغرض یہ خیال سراسر بے بنیاد ہے کہ قرآن ان مذاہب کی موجودہ شکل میں بھی تصدیق کرتا ہے، قرآن نے اس مغالطہ کے لیے کوئی گنجائش نہیں چھوڑی ہے۔ لہذا اس تصدیق کی بنیاد پر ایک سے زیادہ ادیان کے حق ہونے کا نظریہ ثابت نہیں ہوسکتا ـــ بلکہ قرآن کا کھلا ہوا نظریہ اس بارے میں یہی رہتا ہے کہ دین، حق اور اللہ کے یہاں مقبول صرف ایک ہے اور وہ ہے ایمان باللہ، ایمان بالآخرۃ اور عمل صالح۔ لیکن مطلق ایمان اور مطلق عمل صالح نہیں کہ اس کا جو تصور بھی آپ قائم کرلیں اور اس کے مطابق جو شکل بھی آپ اس کو دے دیں وہ دین حق ہی رہے جیسا کہ قائلین وحدت ادیان کو سورہ بقرہ کی اس آیت سے دھوکا ہوا ہو جو ابتدائے مضمون میں ان کے استدلال کے طور پر پیش کی گئی ہے۔

(اِنَّ الَّذِينَ آمَنُوا وَالَّذِينَ هَادُوا الخ)

بلکہ اس کا ایک خاص مطلب ہے جس کے بغیر یہ مقبول نہیں ـــــ اور وہ یہ ہے کہ اللہ کے سوا کسی کی بندگی نہ کی جائے، کسی چیز کو اللہ کا شریک نہ ٹھہرایا جائے اور کسی انسان کو رب کا درجہ نہ دیا جائے ـــــ یہی وجہ ہے کہ اہل کتاب میں ایمان اور عمل صالح جس شکل میں موجود تھا قرآن نے اس کو غلط ٹھہرایا اور اسکو بدلنے پر اصرار کیا۔

علیٰ ہذا مشرکین عرب بھی خدا کو مانتے تھے اور اپنے خیال کے مطابق اس کی خوشنودی کے لیے "عمل صالح" بھی کرتے تھے مگر قرآن اس من مانی خدا پرستی پر راضی نہیں تھا، اسکے نزدیک خدا پرستی کی مقبول صورت صرف یہی ہو جو بیان کی گئی اسی کو وہ مختصر الفاظ میں "الدین الخالص" کہتا ہو، چنانچہ مشرکین کے معاملہ میں بھی صاف ارشاد ہو۔

اَلَا لِلّٰہِ الدِّیْنُ الْخَالِصُ ۭ وَالَّذِیْنَ اتَّخَذُوْا مِنْ دُوْنِہٖٓ اَوْلِیَاۗءَ ۘ مَا نَعْبُدُھُمْ اِلَّا لِیُقَرِّبُوْنَآ اِلَى اللّٰہِ زُلْفٰى ۭ اِنَّ اللّٰہَ یَحْکُمُ بَیْنَھُمْ فِیْ مَا ھُمْ فِیْہِ یَخْتَلِفُوْنَ ڛ (الزمر۔ ع ۱)	خوب سمجھ لو! کہ اللہ ہی کے لیے ہو نری بندگی اور جن لوگوں نے ٹھہرا لیے ہیں اس سے ورے کچھ حمایتی (کہتے ہیں)، کہ ہم ان کو اس واسطے پوجتے ہیں کہ یہ ہمیں اللہ سے قریب کر دیں۔ تو اللہ (فیصلے کے دن) فیصلہ کر دے گا ان کے اس جھگڑے کا۔

لہٰذا ایک مسلمان کے لیے اب اس میں کوئی شبہ نہیں رہ جاتا کہ دیوی دیوتاؤں کی پرستش کے ساتھ (چاہے یہ پرستش خدا کے قرب کے حصول ہی کی نیت سے کیوں نہ ہو) خدا پرستی کا دعویٰ بالکل قابل قبول نہیں ہو۔ اور ایسے ایمان اور عمل صالح سے رضائے الٰہی کے حصول کی توقع ایک خواب پریشان سے زیادہ کوئی حقیقت نہیں رکھتی۔

اب تک کی بحث سے جو باتیں ثابت ہوئی ہیں وہ خلاصہ کے طور پر یہ ہیں۔

۱۔ دین حق ایک ہو متعدد نہیں۔

۲۔ اللہ کے تمام پیغمبروں نے مختلف زمانوں اور مختلف قوموں میں اسی ایک دین کی دعوت دی۔

۳۔ دین میں جو تعدد پیدا ہوا وہ اللہ اور اس کے رسولوں کا پیدا کردہ نہیں ہو، بلکہ انسانی آمیزشوں کا پیدا کردہ ہو۔

۴۔ ان آمیزشوں کے ساتھ دین وہ دین نہیں رہتا جو اللہ کے یہاں مقبول اور موجب نجات ہو۔

۵۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جو دین پیش کیا وہی ہمیشہ کا مقبول دین ہو، مگر انسانی آمیزشوں سے پاک کر کے اس کے اصلی رنگ میں پیش کیا گیا ہو۔ اور وہ رنگ توحید خالص ہو۔

بس ظاہر ہو کہ جس دین میں توحید خالص کا رنگ نہ ہو وہ دین اللہ کے یہاں مقبول نہیں ہو سکتا۔ اب ایک سوال یہ کیا جا سکتا ہو کہ اچھا اگر توحید کی اس کسوٹی پر کس کر تمام مذاہب کے پیرو اپنے

مذاہب کو آمیزشوں سے پاک کردیں۔ لیکن عملی زندگی میں دین کے تقاضے پورے کرنے کے لیے اپنے قدیم دستور العمل پر کاربند رہیں، یعنی شریعت محمدیؐ کا اتباع نہ کریں تو کیا وہ فلاح یاب ہو سکتے ہیں۔

اس سوال کے متعلق پہلی بات تو یہ ہو کہ یہ سوال صرف ان لوگوں کے حق میں کیا جا سکتا ہے جنکے متعلق یقینی طور پر معلوم ہو کہ ان کا تعلق کبھی اللہ کے کسی پیغمبر سے رہا ہو، یعنی وہ زمانہ قدیم میں کسی نبی برحق کے متبع رہے ہیں، جن لوگوں کے متعلق یہ بات یقینی طور پر معلوم نہ ہو سکے ان کے متعلق اس کا کوئی سوال ہی نہیں، کیونکہ جب یہی نہیں معلوم کہ یہ کسی نبی کے متبع تھے بھی تو اس کا کیسے یقین ہو سکتا ہو کہ ان کا مذہبی دستور العمل بھی کوئی آسمانی شریعت ہو۔ کیونکہ آسمانی شریعت تو نبی کے ذریعہ ہی مل سکتی ہو۔ پس اب یہ سوال صرف ان لوگوں کے حق میں رہ جاتا ہو جن کا کسی نبی سے تعلق ہونا یقینی طور پر معلوم ہو جیسے یہود و نصاریٰ کہ ان کے اس تعلق کی خبر خود قرآن دیتا ہو، پھر ان کے بارے میں بھی یہ سوال جب قائم رہتا ہو جب کہ یہ ثابت ہو جائے کہ ان کے پاس جو مجموعہ احکام شریعت کے نام سے ہو وہ بعینہ وہی ہو جو ان کے نبی کے ذریعہ انھیں دیا گیا تھا۔ اگر اس میں شبہ ہو تو پھر ان لوگوں کے حق میں بھی یہ سوال قائم نہیں رہتا ہو۔ اور آج یہ بات پوری طرح ثابت ہو چکی ہو کہ کسی سابقہ شریعت کے متعلق اس کی اصلی حالت میں ہونے کا دعویٰ نہیں کیا جا سکتا ——— اس تنقیح کے بعد یہ سوال صرف نظری رہ جاتا ہو کہ بالفرض اگر کوئی سابقہ شریعت من وعن موجود ہو، یا کسی طرح اس کا غیر محرف طور پر موجود ہونا ثابت ہو جائے تو پھر کیا حکم ہو؟ تب ہم کہیں گے کہ اس سوال کا جواب نفی میں ہو (اور جو لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ قرآن شریعت محمدیؐ کے اتباع پر زور نہیں دیتا وہ غلط سمجھتے ہیں) ——— کیوں؟ اس لیے کہ جو نبی جن لوگوں کی طرف بھیجا جاتا ہو ان کے لیے اس کی مکمل اطاعت اور اس کے طریقہ کا اتباع لازم ہوتا ہو، چنانچہ قرآن کہتا ہو

وَمَا اَرْسَلْنَا مِنْ رَّسُوْلٍ اِلَّا لِيُطَاعَ بِاِذْنِ اللّٰهِ (النساء ع ۹)

اور ہم نے کوئی رسول ایسا نہیں بھیجا جس کے متعلق یہ حکم نہ ہو کہ اللہ کے حکم سے اس کی اطاعت کی جائے۔

اب اگر یہ ثابت ہو جائے کہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت کسی خاص وقت یا کسی خاص انسانی گروہ تک محدود نہ تھی بلکہ قیامت تک کی ساری دنیا کے لیے تھی تو پھر خود بخود آپ کی

اطاعتِ کامل سب پر واجب ہو جاتی ہے۔

قرآن اس بارے میں صاف شہادت دیتا ہے کہ

وَمَا اَرْسَلْنٰكَ اِلَّا كَآفَّةً لِّلنَّاسِ الآیہ (السباء ع ۳)

اور (اے محمد) بلاشبہ تمہاری رسالت کل عالم انسانی کے لیے ہے۔

یہ تو ان مقدمات کے نتیجہ کے طور پر ثابت ہوا ——— اور یہ ثبوت بھی قطعی ہے، لیکن اگر صراحت چاہی جائے جس میں صاف طور سے یہ کہا گیا ہو کہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا اتباع ضروری ہے تو یہ صراحت بھی سُنئے۔

قُلْ يٰۤاَيُّهَا النَّاسُ اِنِّیْ رَسُوْلُ اللّٰهِ اِلَيْكُمْ جَمِيْعَا ۨالَّذِیْ لَهٗ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ۚ لَاۤ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ يُحْیٖ وَيُمِيْتُ ۖ فَاٰمِنُوْا بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهِ النَّبِیِّ الْاُمِّیِّ الَّذِیْ يُؤْمِنُ بِاللّٰهِ وَكَلِمٰتِهٖ وَاتَّبِعُوْهُ لَعَلَّكُمْ تَهْتَدُوْنَ ۝ (الاعراف ع ۲۰)

(اے محمد) کہو کہ اے لوگو میں اللہ کا فرستادہ ہوں تم سب کی جانب وہ اللہ جس کی حکومت ہے آسمان و زمین پر، کوئی معبود نہیں بجز اس کے وہی جِلاتا ہے اور مارتا ہے، سو تم مانو اللہ کو اور اس کے بھیجے نبی اُمّی کو جو مانتا ہے اللہ کو اور اس کے کلمات کو (یعنی اس کی سب کتابوں کو) اور اس کے قدم بقدم چلو تاکہ تم راہ پا جاؤ۔

دو ٹوک انداز میں کہا جارہا ہے کہ ہدایت یابی دو چیزوں پر موقوف ہے، ایک اللہ اور نبی اُمّی پر ایمان اور دوسرے اس نبی کا اتباع! پھر یہ صرف لامذہبوں اور بُت پرست مشرکوں سے نہیں کہا جارہا ہے، بلکہ خاص طور پر اس کے مخاطب وہ لوگ ہیں جن کو قرآن خود اہلِ کتاب کہتا ہے، کیونکہ اس سے پہلی آیتوں میں مسلسل انھیں کا تذکرہ چلا آرہا ہے جس کا خلاصہ یہ ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اپنی اُمّت کے لیے رحمتِ حق کی دعا کی تو اللہ تعالیٰ نے چند شرائط کے ساتھ رحمت کا وعدہ کیا، ان میں سے ایک شرط یہ تھی کہ (تمہاری امت میں سے رحمت کے مستحق وہ لوگ ہوں گے جو) اُس نبی اُمّی کا اتباع کریں جس کا ذکر ان کے پاس تورات و انجیل میں موجود ہے، اور اس کی یہ یہ علامتیں ہیں۔ اس کے بعد پھر حاصلِ کلام کے طور پر یہ بات کہی گئی کہ جو اُس کو مانیں گے، اس کی رفاقت و نصرت کریں گے اور اس کی کتاب و شریعت کی روشنی میں ایمان کے تقاضے پورے کریں گے ——— فلاح یابی انھیں کا حصہ ہے۔ یہاں تک

گویا اللہ تعالیٰ نے اہل کتاب کو یاد دلایا کہ ہمارے تمھارے درمیان یہ وعدہ تھا۔ اس کے بعد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان سے کہلوایا جاتا ہو کہ اللہ کا یہ وعدہ اب بھی قائم ہو، اب وقت آگیا ہو اس شرط کے پورا کرنے کا۔

الغرض ہم یہ کہنا چاہتے ہیں کہ مذکورۂ بالا آیت میں النّاس کے دائرہ عموم میں تو اہل کتاب آتے ہی ہیں، مگر وہ خاص طور سے بھی پیش نظر ہیں، اور اس کا بہت واضح قرینہ یہ ہو کہ اس میں فَآمِنُوا بِاللّٰہِ وَرَسُولِہٖ" کہنے پر اکتفا نہیں کیا گیا بلکہ رسول کی صفت میں "النبی الامی" کا اضافہ کیا گیا، اس اضافہ کا مقصد بجز اس کے اور کیا ہو سکتا ہو کہ "النّاس" میں سے جو اہل کتاب ہیں ان کا ذہن اس طرف مبذول کرایا جائے کہ جس رسول کی تصدیق اور اتباع کا مطالبہ کیا جارہا ہو یہ وہی رسول ہو جس کی تصدیق اور جس کے اتباع کو ان کے استحقاق رحمت و فلاح کی شرط قرار دیا گیا تھا کیونکہ اس شرط میں بھی اس رسول کی یہی صفت بیان کی گئی تھی ___ بہتر یہ ہو کہ جن آیتوں کا تذکرہ کیا جارہا ہو آپ ان کو خود ملاحظہ فرمالیں کہ یہ اس امر میں انتہائی تشفی بخش ہیں۔

حضرت موسیٰ کی جس دعا کا ذکر کیا گیا ہو اس کے جواب میں اللہ تعالیٰ کے ارشاد کو قرآن یوں بیان کرتا ہو

قَالَ عَذَابِیٓ اُصِیْبُ بِهٖ مَنْ اَشَآءُ ۚ وَرَحْمَتِیْ وَسِعَتْ كُلَّ شَیْءٍ ؕ فَسَاَكْتُبُهَا لِلَّذِیْنَ یَتَّقُوْنَ وَیُؤْتُوْنَ الزَّكٰوةَ وَالَّذِیْنَ هُمْ بِاٰیٰتِنَا یُؤْمِنُوْنَ ۚ اَلَّذِیْنَ یَتَّبِعُوْنَ الرَّسُوْلَ النَّبِیَّ الْاُمِّیَّ الَّذِیْ یَجِدُوْنَهٗ مَكْتُوْبًا عِنْدَهُمْ فِی التَّوْرٰىةِ وَالْاِنْجِیْلِ ؗ یَاْمُرُهُمْ بِالْمَعْرُوْفِ وَیَنْهٰىهُمْ عَنِ الْمُنْكَرِ وَیُحِلُّ لَهُمُ الطَّیِّبٰتِ وَیُحَرِّمُ عَلَیْهِمُ الْخَبٰٓئِثَ وَیَضَعُ عَنْهُمْ اِصْرَهُمْ وَالْاَغْلٰلَ

فرمایا اللہ تعالیٰ نے کہ میرا عذاب جو ہو سو وہ واقع کرتا ہوں (خاص طور پر) اسی پر جس کو میں چاہتا ہوں اور رحمت میری سو وہ ہر چیز کو شامل ہو، پس میں قطعی طور پر لکھ دوں گا رحمت ان لوگوں کے لیے جو میرا لحاظ کریں گے اور زکوٰۃ دیں گے اور جو ہماری باتوں پر یقین کریں گے (یعنی) وہ لوگ جو اللہ کے بھیجے ہوئے اس نبی امی کا اتباع کریں گے جس کو وہ اپنے پاس توراۃ و انجیل میں لکھا ہوا پائیں گے جو انھیں حکم کریگا پسندیدہ باتوں کا اور روکے گا ناپسندیدہ باتوں سے

(باقی بر صفحہ ۵۳)

معارف الاحادیث

(سلسلۂ احادیث رقاق)

(۳۰) عَنِ ابْنِ مَسْعُوْدٍ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ نَامَ عَلٰی حَصِیْرٍ فَقَامَ وَقَدْ اَثَّرَ فِیْ جَسَدِہٖ فَقَالَ ابْنُ مَسْعُوْدٍ یَا رَسُوْلَ اللّٰہِ لَوْ اَمَرْتَنَا اَنْ نَبْسُطَ لَکَ وَنَعْمَلَ فَقَالَ مَالِیْ وَلِلدُّنْیَا وَمَا اَنَا وَالدُّنْیَا اِلَّا کَرَاکِبٍ اِسْتَظَلَّ تَحْتَ شَجَرَۃٍ ثُمَّ رَاحَ وَتَرَکَھَا۔ (رواہ احمد والترمذی وابن ماجہ)

(ترجمہ) حضرت عبداللہ بن مسعود سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم (ایک دن) کھجور کی چٹائی پر سوئے، پھر جب سو کے آپ اٹھے تو جسم مبارک میں اس چٹائی کی بناوٹ کے نشانات پڑے ہوئے تھے (اس حالت کو دیکھ کر اور اس سے متاثر ہو کر)، اس خادم ابن مسعود نے عرض کیا کہ اگر حضور فرما دیں تو ہم حضرت کے لیے بستر کا انتظام کریں۔ اور کچھ بنائیں۔ (یعنی آپ سے اس کی اجازت چاہی) ارشاد فرمایا۔ مجھے دنیا سے (یعنی دنیا کے ساز و سامان اور اس کی راحتوں اور لذتوں سے) کیا تعلق اور کیا لینا! میرا تعلق دنیا کے ساتھ بس ایسا ہی ہے جیسا کہ کوئی سوار مسافر کچھ دیر سایہ لینے کے لیے کسی درخت کے نیچے ٹھہرا اور پھر اس کو اپنی جگہ چھوڑ کے منزل کی طرف چل دیا۔ (مسند احمد۔ ترمذی۔ ابن ماجہ)

(تشریح) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے جواب کا حاصل یہ ہے کہ جس طرح یہ مسافر درخت کے نیچے ٹھہرنے کے تھوڑے سے وقت کے لیے راحتوں کے انتظامات کرنا ضروری نہیں سمجھتا اور منزل مقصود پر پہونچنے کی فکر کے سوا اس کی کوئی فکر نہیں ہوتی، بس یہی میرا حال ہے۔ —— اور حق یہ ہے کہ دنیا اور آخرت کی حقیقت جس پر پوری طرح منکشف ہو جائے تو اس کا

حال اس کے سوا کچھ اور ہو بھی نہیں سکتا۔ اس کو دنیا میں راحتوں کے بڑے بڑے انتظامات کی فکر کرنا اور اس کے لیے اپنا وقت اور اپنی صلاحیتوں کا صرف کرنا ایسا ہی کارِ حماقت معلوم ہوگا جیسا کہ درخت کے سایہ میں تھوڑی دیر کے لیے ٹھہرنے والے مسافر کا اس ذرا سے وقت کے لیے بڑے بڑے انتظامات میں مشغول ہونا۔

(۳۱) عن ابی ھریرۃ ان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم قال الا اِنّ الدنیا ملعونۃ ملعون مافیھا الا ذکر اللہ وما والاہ وعالم او متعلم۔ (رواہ الترمذی وابن ماجۃ)

(ترجمہ) حضرت ابوہریرہ سے روایت ہو کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ خبردار دنیا اور جو کچھ دنیا میں ہو اُس پر خدا کی پھٹکار ہو اور اس کے لیے رحمت سے محرومی ہو، سوائے خدا کی یاد کے اور ان چیزوں کے جن کا خدا سے کوئی تعلق ہو، اور سوائے عالم اور متعلم کے۔

(ترمذی۔ ابن ماجہ)

(تشریح) مطلب یہ ہو کہ یہ دنیا جس کی طلب اور چاہت میں بہت سے نادان انسان خدا کو اور آخرت کو بھول جاتے ہیں وہ اسقدر ذلیل اور ایسی مردار ہو کہ اللہ کی وسیع رحمت میں بھی اس کے لیے کوئی حصہ نہیں ہو، البتہ اللہ کی یاد اور جن چیزوں کا اُس سے تعلق ہو، خاصکر علم دین کے حاملین اور متعلمین، سو ان پر اللہ کی رحمت ہو، حاصل یہ کہ اس دنیا میں صرف وہی چیزیں اور وہی اعمال اللہ کی رحمت کے لائق ہیں جن کا اللہ تعالیٰ سے اور دین سے کوئی تعلق ہو، خواہ بالواسطہ ہو یا بلا واسطہ۔ لیکن جو چیزیں اور جو اعمال و اشغال اللہ سے اور دین سے بالکل بے تعلق ہیں (اور دراصل دنیا ان ہی کا نام ہو) پس اللہ تعالیٰ کی رحمت سے وہ دور اور محروم ہیں۔

(۳۲) عن ابی امامۃ عن النبی صلی اللہ علیہ وسلم۔ قال اغبط اولیائی عندی لمومن خفیف الحاذ ذو حظٍّ من الصلوٰۃ احسن عبادۃ ربّہٖ واطاعہ فی السّر وکان غامضاً فی الناس لایشار الیہ بالاصابع وکان رزقہ کفافاً فصبر علی ذالک ثم نقد بیدہ فقال عجّلت منیّتہٗ قلّت بواکیہ قلّ تراثہ۔ (رواہ احمد والترمذی وابن ماجہ)

(ترجمہ) ابو امامہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ میرے دوستوں میں بہت زیادہ قابلِ رشک میرے نزدیک وہ مومن ہے جو سبک بار (یعنی دنیا کے ساز و سامان اور مال و عیال کے لحاظ سے بہت ہلکا پھلکا) ہو، نماز میں اُس کا بڑا حصہ ہو، اور اپنے رب کی عبادت خوبی کے ساتھ اور صفتِ احسان کے ساتھ کرتا ہو، اور اس کی اطاعت و فرمانبرداری اس کا شعار ہو اور یہ سب کچھ اخفا کے ساتھ اور خلوت میں کرتا ہو، اور وہ چھپا ہوا اور گمنامی کی حالت میں ہو اور اس کی طرف انگلیوں سے اشارے نہ کیے جاتے ہوں اور اس کی روزی بھی بقدر کفایت ہو اور وہ اس پر صابر و قانع ہو —— پھر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے ہاتھ سے چٹکی بجائی (جیسے کہ کسی چیز کے ہو جانے پر اظہارِ تعجب یا اظہارِ حیرت کے لیے چٹکی بجاتے ہیں) اور فرمایا جلدی آگئی اس کو موت، اُس پہ رونے والیاں بھی کم ہیں اور اس کا ترکہ بھی بہت تھوڑا سا ہے۔ (مسند احمد، ترمذی، ابن ماجہ)

(تشریح) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشاد کا مطلب یہ ہے کہ اگرچہ میرے دوستوں اور اللہ کے مقبول بندوں کے الوان و احوال مختلف ہیں، لیکن ان میں بہت زیادہ قابلِ رشک زندگی اُن اہلِ ایمان کی ہے جن کا حال یہ ہے کہ دنیا کے ساز و سامان اور مال و عیال کے لحاظ سے وہ بہت ہلکے، مگر نماز اور عبادات میں ان کا خاص حصہ، اور اس کے باوجود ایسے نامعروف اور گمنام کہ آتے جاتے کوئی ان کی طرف انگلی اٹھا کے نہیں کہتا کہ یہ فلاں بزرگ اور فلاں صاحب ہیں، اور ان کی روزی بس بقدر کفایت، لیکن وہ اس پر دل سے صابر و قانع —— جب موت کا وقت آیا تو ایکدم رخصت، نہ پیچھے زیادہ مال و دولت اور نہ جائداد و مکانات اور باغات کی تقسیم کے جھگڑے، نہ زیادہ ان پر رونے والیاں ——"

بلاشبہ بڑی قابلِ رشک ہے اللہ کے ایسے بندوں کی زندگی، اور الحمد للہ کہ اس قسم کی زندگی والوں سے ہماری یہ دنیا اب بھی خالی نہیں ہے۔

(۳۲) عن عبد اللہ بن عمرو قال قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم قد افلح من اسلم و رزق کفافاً و قنعه اللہ بما اتاہ۔ (رواہ مسلم)

(ترجمہ) عبد اللہ بن عمرو سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کامیاب و

بامراد ہوا وہ جس کو حقیقتِ اسلام نصیب ہوئی۔ اور اس کو روزی بھی صرف بقدر کفاف ملی، اور اللہ تعالیٰ نے اس کو اس قدرِ قلیل روزی پر قانع بھی بنا دیا۔ (مسلم)

(تشریح) فقر و ناداری بلا قناعت کے بلاشبہ بڑی مصیبت ہے اور اس سے اللہ کی پناہ مانگنا چاہیے۔ لیکن اگر فقر و افلاس کے ساتھ قناعت نصیب ہو تو پھر وہ بڑی دولت ہے کہ آدمی سُبک بار اور ہلکا پھلکا بھی رہتا ہے اور قناعت کی دولت کی وجہ سے اس کو فکر و تشویش کی تکلیف بھی نہیں ہوتی۔ ع۔ کیں کیمیائے ہستی قاروں کند گدارا

(۳۴) عن ام الدرداء قالت قلت لابی الدرداء مالک لا نطلب کما یطلب فلان فقال انی سمعت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اِنَّ امامکم عقبۃ کئُوداً لا یجوزھا المثقلون فاحبّ ان اتخفف لتلک العقبۃ۔ (رواہ البیہقی فی شعب الایمان)

(ترجمہ) حضرت ابو الدرداء کی بیوی ام الدرداء سے روایت ہے کہ میں نے ابو الدرداء سے کہا کہ کیا بات ہے تم مال و منصب کیوں نہیں طلب کرتے جس طرح کہ فلاں اور فلاں طلب کرتے ہیں۔ انھوں نے فرمایا کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سُنا ہے کہ تمھارے آگے ایک بڑی دشوار گزار گھاٹی ہے، اس کو گراں بار اور زیادہ بوجھ والے آسانی سے پار نہ کر سکیں گے، اس لیے میں یہی پسند کرتا ہوں کہ اس گھاٹی کو عبور کرنے کے لیے ہلکا پھلکا رہوں (اس وجہ سے میں اپنے لیے مال و منصب طلب نہیں کرتا) (شعب الایمان للبیہقی)

(تشریح) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اخیر دورِ حیات میں اور آپ کے بعد خلفاء راشدین کے زمانہ میں ایسی صورتیں پیدا ہو گئی تھیں کہ مختلف راہوں سے اموال آتے تھے اور طالبین اور اہلِ حاجت کو تقسیم کیے جاتے تھے، اسی طرح بہت سے لوگوں کو خاص خدمات اور مناصب پر مقرر کیا جاتا تھا اور ان کو اس خدمت اور کارکردگی پر وظیفہ ملتا تھا، جس سے اُن کا گزارہ آسان ہو جاتا تھا۔ لیکن بعض صحابہ کرام اس زمانہ میں بھی فقر و فاقہ کی زندگی ہی کو اپنے لیے پسند کرتے تھے۔ ان ہی میں سے حضرت ابو الدرداء بھی تھے، وہ آخرت کے محاسبہ اور محشر کی تکلیفوں اور سختیوں سے امن اسی میں سمجھتے تھے کہ دنیا سے کم سے کم حصہ لیا جائے اور بس کسی طرح زندگی بسر

ہو جائے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو بتلایا تھا کہ آخرت کی دشوار گزار گھاٹیوں کو وہی لوگ آسانی سے عبور کرسکیں گے جو دنیا میں ہلکے پھلکے رہیں گے اور جو لوگ دنیا میں اپنے پر زیادہ بوجھ لاد لیں گے وہ آسانی سے ان گھاٹیوں کو پار نہ کرسکیں گے۔

(۳۵) عن علی قال قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم من رضی باللہ بالیسیر من الرزق رضی اللہ عنہ بالقلیل من العمل۔

(رواہ البیہقی فی شعب الایمان)

(ترجمہ) حضرت علی مرتضیٰ رضی اللہ عنہ سے روایت ہو کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا جو بندہ اللہ کے دیے ہوئے تھوڑے رزق پر قانع اور راضی ہو اس کے تھوڑے سے عمل پر بھی اللہ کی رضا کا مقام اس کو حاصل ہو جائے گا اور اللہ تعالیٰ اس سے راضی ہو جائیں گے۔

(۳۶) عن انس قال قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم هل من احد یمشی علی الماء الا ابتلت قدماه؟ قالوا لا یا رسول اللہ قال کذالک صاحب الدنیا لا یسلم من الذنوب۔

(رواہ البیہقی فی شعب الایمان)

(ترجمہ) حضرت انس سے روایت ہو کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک دن فرمایا کہ کیا کوئی ایسا ہو کہ وہ پانی پر چلے، اور اس کے پاؤں تر نہ ہوں؟ — عرض کیا گیا حضرت! ایسا تو نہیں ہو سکتا، آپ نے فرمایا بس اسی طرح دنیا دار گناہوں سے محفوظ نہیں رہ سکتا۔

(شعب الایمان للبیہقی)

(تشریح) مطلب یہ ہو کہ جو بندہ گناہوں سے بالکل پاک صاف رہنا چاہے اس کے لیے راستہ یہی ہو کہ وہ دنیا میں زیادہ مشغول نہ ہو۔

سلطان صلاح الدین ایوبیؒ

ایک درویش سیرت سلطان

یہ مضمون مخدوم گرامی جناب مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندوی کی زیر تصنیف کتاب "تاریخ دعوت و عزیمت" سے لیا گیا ہے، اس کا مواد زیادہ تر سلطان کے سکریٹری اور رفیق خاص قاضی بہاء الدین ابن شداد کی کتاب "النوادر السلطانیہ" سے ماخوذ ہے جو سلطان کے حالات میں سب سے زیادہ مستند کتاب ہے۔ اداره

قاضی ابن شداد سلطان کی سیرت اخلاق و عادات اور خصوصیات میں لکھتے ہیں۔

سلطان نہایت صحیح العقیدہ، راسخ الاعتقاد مسلمان تھے، عقائد میں اہل السنۃ والجماعۃ کے ہم مسلک و ہم اعتقاد، نماز و جماعت کے بڑے پابند، ایک موقع پر فرمایا کہ برسہا برس ہو گئے ہیں نے ایک نماز بھی بے جماعت نہیں پڑھی، حالت مرض میں بھی امام کو بلاتے اور بتکلف کھڑے ہو کر نماز پڑھتے، سنن رواتب پر مداومت تھی رات کو حتی الامکان نوافل پڑھتے، اگر رات کے نوافل رہ جاتے تو (شافعیہ کے مسلک کے مطابق) نماز فجر سے پہلے ادا کرتے میں نے ان کو آخری بیماری میں کھڑے ہو کر ہی نماز پڑھتے دیکھا صرف تین دن جس میں ان پر بے ہوشی طاری رہی نماز فوت ہوئی۔ زکوٰۃ فرض ہونے کی ساری عمر نوبت ہی نہیں آئی اس لئے کہ انھوں نے کبھی اتنا پس انداز ہی نہیں کیا جس پر زکوٰۃ فرض ہو، ان کی ساری دولت صدقات و خیرات میں صرف ہوئی صرف ۴۷ درہم ناصری اور ایک سونے کا سکہ چھوڑا، باقی کوئی جائداد ملکیت نہیں چھوڑی۔

رمضان میں روزے کے سخت پابند تھے، کچھ روزے ان کے ذمے باقی تھے جو قاضی فاضل کی یادداشت میں تحریر تھے، وفات سے پہلے پہلے بڑے اہتمام سے وہ سب روزے قضا کئے، معالج نے ہر چند منع کیا لیکن فرمایا کہ کل کا حال مجھے معلوم نہیں، چنانچہ ان کی قضا کے بعد ہی خود قضا کر گئے۔

حج کی بڑی آرزو تھی لیکن اس کا موقع نہیں مل سکا، وفات کے سال اس کا شوق بہت غالب تھا لیکن نوبت نہیں آنے پائی۔

قرآن مجید سننے کا بڑا شوق تھا، کبھی کبھی اپنے برج میں پہرہ داروں سے دو دو تین تین چار چار پارے سنتے، بڑے خاشع خاضع، رقیق القلب تھے، قرآن مجید سن کر اکثر آنکھوں سے آنسو جاری ہو جاتے۔ حدیث سننے کے بڑے شائق تھے اور اس کا بڑا احترام کرتے تھے، حدیث کی قرأت کے وقت لوگوں کو احتراماً بیٹھ جانے کا حکم دیتے، اگر کوئی عالی سلسلہ حدیث کا شیخ ہوتا تو خود اس کی مجلس میں جاکر حدیث سنتے، خود بھی حدیث کی قرأت کا شوق تھا، اگر کسی حدیث میں کوئی عبرت کی بات ہوتی تو آنکھیں پُرنم ہو جاتیں۔ عین میدان جنگ میں بعض مرتبہ دو صفوں کے درمیان کھڑے ہو کر حدیث کی سماعت کی کہ یہ وقت خاص فضیلت کا ہے۔[1]

دینی شعائر کی بڑی تعظیم کرتے، سہروردی ملحد کو انھیں کے ایما سے ان کے صاحبزادہ الملک الظاہر نے قتل کروایا، ان کو خدا پر بڑا بھروسہ اور اس کی ذات عالی کے ساتھ بڑا حسن ظن تھا، کٹھن گھڑیوں اور نازک اوقات میں اللہ تعالیٰ کی طرف رجوع اور دعا و مناجات کی عادت تھی، ایک مرتبہ بیت المقدس کو صلیبی افواج کی طرف سے، جو اس کے قریب مجتمع تھیں سخت خطرہ لاحق تھا، سلطان کو بیت المقدس کی بڑی فکر تھی اور وہ کسی طرح بھی وہاں سے چلے جانے پر راضی نہ تھے، شب جمعہ تھی، جاڑوں کی راتیں تھیں میں تنہا خدمت میں حاضر تھا، ہم دونوں ذکر و دعا میں مشغول رہے، سلطان کے مزاج پر اکثر خشکی اور یبوست غالب آجایا کرتی تھی، رات بھر جاگتے رہنے کی وجہ سے مجھے اندیشہ ہوا کہ ان کا مزاج ناساز ہو جائے گا، میں نے عرض کیا کہ کچھ دیر آرام فرمالیں، فرمایا شاید تمھیں نیند نے ستایا ہے اس لئے مجھے یہ مشورہ دیتے ہو، یہ کہہ کر وہ اٹھے لیکن تھوڑی ہی دیر میں موذن نے صبح کی اذان دی، میں عموماً فجر ساتھ ہی پڑھا کرتا تھا، حاضر ہوا تو دیکھا کہ اپنے ہاتھ پاؤں پر پانی ڈال رہے ہیں مجھے دیکھ کر فرمایا کہ میں نے جھپکی بھی نہیں لی، ہم نماز میں مشغول ہو گئے، مجھے ایک خیال آیا اور میں نے عرض کیا کہ میرے ذہن میں ایک بات آئی ہے اور انشاء اللہ وہ مفید ہوگی، وہ یہ کہ آپ اللہ تعالیٰ کی طرف رجوع کریں اور اس سے گڑگڑا کر دعا مانگیں اور یقین رکھیں کہ وہی مشکل آسان کر سکتا ہے، فرمایا کہ اس کی کیا ترکیب ہے؟ میں نے عرض کیا کہ آج جمعہ کا دن ہے مسجد جاتے ہوئے آپ غسل فرمالیں اور مسجد اقصیٰ میں اس مقام پر نماز پڑھیں جہاں سے حضور صلی اللہ علیہ وسلم معراج میں تشریف لے گئے تھے اور پہلے کسی معتبر آدمی کے ذریعہ بالکل پوشیدہ طور پر کچھ صدقہ کریں، پھر اذان و اقامت کے درمیان دو رکعت نماز پڑھیں

[1] النوادر السلطانیہ ص

ایک حدیث میں اس کی فضیلت اور اس وقت دعا کی قبولیت کی خبر دی گئی ہے۔ اور سجدہ میں سر رکھ کر عرض کریں کہ خدایا مادی اسباب اور دنیاوی سہارے سب ٹوٹ چکے اب تیرے دین کی مدد اور فتح کے لئے صرف یہی سہارا رہ گیا ہے کہ تیرے آستانہ پر سر رکھ دیا جائے اور تیرے سہارے کو مضبوط پکڑ لیا جائے۔ اب صرف تیرا بھروسہ ہے اور تو ہی میرا حامی و ناصر ہے" مجھے امید قوی ہے کہ اللہ تعالیٰ آپ کی دعا قبول فرمائے گا۔ سلطان نے ایسا ہی کیا۔ میں نے معمول کے مطابق ان کے پہلو میں نماز پڑھی، میں نے دیکھا کہ وہ سجدہ میں پڑے ہیں آنسوؤں سے ان کی ڈاڑھی تر ہو گئی ہے اور جانماز پر آنسو ٹپ ٹپ گر رہے ہیں، میں نے نہیں سنا کہ انھوں نے کیا دعا کی مگر اسی دن سے ان کی دعا کے قبولیت کے آثار ظاہر ہونے لگے۔ صلیبی فوجوں میں انتشار و اضطراب پیدا ہوا، پے درپے اطمینان بخش اطلاعیں آتی رہیں یہاں تک کہ دوشنبہ کی صبح تک میدان بالکل صاف ہو گیا اور حملہ آور فوجیں بیت المقدس کا خیال چھوڑ کر رملہ کی جانب چلی گئیں[۵]۔

محاسن اخلاق عبادات و فضائل اعمال کے علاوہ حاکمانہ فضائل عدل، عفو و حلم، جود و سخاوت مروت و شرافت، صبر و استقامت، شجاعت و فتوت اور شہامت و علوہمت کے اوصاف عالیہ سے آراستہ تھے۔

قاضی ابن شداد لکھتے ہیں کہ ہفتہ میں دو بار دوشنبہ و پنجشنبہ کو اذن عام ہوتا تھا، فقہا، قضاۃ و علماء، اور اہل مقدمہ حاضر ہوتے، بڑے، چھوٹے، امیر، غریب، بوڑھوں اور بڑھیوں تک کو آنے کی اجازت تھی، سفر و حضر میں کبھی اس معمول میں فرق نہ آتا۔ رات دن میں ایک بار خود معاملات کو دیکھتے اور رقعات و فرامین پر خود دستخط کرتے، کبھی کسی صاحب غرض اور حاجت مند کو ناکام واپس نہ کرتے اسکے ساتھ ساتھ ذکر و تلاوت میں مشغول رہتے۔

اگر کوئی فریاد و شکایت کرتا تو خود کھڑے ہو کر اس کا مقدمہ سنتے اس کی دادرسی کرتے اور اس کے معاملہ سے پوری دلچسپی لیتے، ایک مرتبہ ایک معمولی شخص نے ان کے بھتیجے تقی الدین کے خلاف (جو سلطان کو بہت عزیز تھے) دعویٰ کیا، سلطان نے فوراً ان کو طلب کیا اور مقدمہ کی سماعت کی۔ خود ان کے خلاف ایک شخص نے دعویٰ کیا، سلطان نے معاملہ کی پوری تحقیق کی، اگرچہ مدعی کا حق ثابت نہیں ہوا لیکن سلطان نے اس کو ناکام واپس نہیں کیا اور خلعت و مال سے سرفراز کیا۔

---

۵ النوادر السلطانیہ ص۲۰۹۔

بڑے بردبار اور متحمل مزاج تھے، مورخ ابن خلکان لکھتے ہیں کہ اپنے رفقا، اور خدام کی غلطیوں اور لغزشوں سے چشم پوشی کرتے، بعض وقت کوئی ایسی بات سنتے جس سے ان کو تکلیف یا ناگواری ہوتی لیکن وہ اُس کو محسوس بھی نہ ہونے دیتے اور نہ اپنے طرزِ عمل میں کوئی فرق آنے دیتے، ایک مرتبہ پانی مانگا، پانی نہیں آیا، پھر مانگا پھر نہیں ملا، یہاں تک کہ ایک ہی مجلس میں پانچ مرتبہ نوبت آئی آخر میں کہا کہ دوستو میں تو پیاس سے مرا جارہا ہوں، اتنے میں پانی آیا سلطان نے پی لیا اور اس تاخیر پر کچھ نہیں کہا۔[1] ایک مرتبہ سخت بیماری سے اُٹھے اور غسل صحت کے لیے حمام میں گئے، پانی بہت گرم تھا ٹھنڈا پانی مانگا، خادم نے پانی حاضر کیا، پانی کچھ چھلک کر ان پر گرا ضعف کی وجہ سے ان کو تکلیف ہوئی، پھر ٹھنڈا پانی مانگا اس مرتبہ ٹھنڈے پانی کا پورا طشت گر گیا اور سارا پانی ان پر آگیا اور وہ مرتے مرتے بچے، لیکن صرف اتنا کہا کہ اگر مجھے مارنے کا ارادہ ہو تو کہدو، خادم نے معذرت کی اور وہ خاموش ہوگئے اور کوئی باز پرس نہیں کی۔[2] قاضی ابن شداد نے سرداران فوج کی غلطیوں اور اہل دربار کی بے عنوانیوں سے درگزر اور سلطان کے عفو و حلم کے متعدد موثر واقعات لکھے ہیں۔[3]

جود و سخاوت کا حال یہ تھا کہ بقول ابن شداد بعض اوقات فتح کئے ہوئے صوبے دوسروں کو بخش دئے، آمد فتح کیا، ایک سردار ابن قرہ ارسلان نے ان سے خواہش کی اور انھوں نے بخش دیا، بعض مرتبہ سامان بیچ کر وفود کو عطایا و انعامات سے نوازتے، محافظین خزانہ بعض اوقات کسی نازک وقت کے لیے کچھ چھپا کر رکھ لیتے کہ سلطان کو اگر خبر ہوگی تو وہ رہنے نہیں دیں گے، ایک مرتبہ انھوں نے دوسروں پر رکھ کر یہ بات کہی کہ بعض ایسے لوگ بھی ہو سکتے ہیں جو روپیہ اور مٹی کو ایک نظر سے دیکھتے ہیں۔ مجھے معلوم ہے کہ انھوں نے اپنا ہی حال بیان کیا ہے۔[4]

مروت و شرافت کا یہ حال تھا کہ آنے والے اور ملاقات کرنے والے کو خالی ہاتھ نہ جانے دیتے خواہ کافر ہو، صیدا کا والی ملاقات کے لیے آیا، سلطان نے اس کی بڑی خاطر کی، اپنے ساتھ کھانا کھلایا لیکن اس کے ساتھ ساتھ اسلام کی دعوت بھی دی اور اس کے فضائل اور محاسن بیان کرکے اس کو اسلام کی ترغیب دی، اسی مروت و شرافت کا نتیجہ تھا کہ اپنے سب سے بڑے حریف رچرڈ کو اس کی

---

[1] ابن خلکان ترجمہ سلطان صلاح الدین۔ [2] تاریخ ابن خلکان، سلطان صلاح الدین۔ [3] النوادر السلطانیہ ص ۲۱-۲۴۔ [4] النوادر السلطانیہ ص ۱۳-۱۴

بیماری میں برف اور پھل بھیجتے رہے۔[۵۱]

سلطان بڑے شریف النفس، رقیق القلب اور دردمند انسان تھے، ظلم کو برداشت نہ کرسکتے اور کسی آفت رسیدہ و کمزور مخلوق کی تکلیف کی تاب نہ لاسکتے، ابن شداد لکھتے ہیں کہ ایک مرتبہ ایک عیسائی بڑھیا ان کے پاس آئی وہ سینہ پیٹتی تھی اور برابر روئے جارہی تھی سلطان نے سبب پوچھا، کہا کہ میری چھوٹی سی بچی کو ڈاکو میرے خیمہ سے اٹھالے گئے، مجھے روتے ساری رات ہوگئی، سلطان کے ایک آدمی نے مجھ سے کہا کہ سلطان شفیق و مہربان ہیں ہم تمہیں ان کے پاس پہنچادیتے ہیں تم ان سے فریاد کرنا انھوں نے مجھے آپ کی خدمت میں پہونچادیا، اب میں اپنی بچی آپ ہی سے لوں گی، سلطان کو اس کی حالت پر بڑا ترس آیا، ان کی آنکھیں پُرآب ہوگئیں، اسی وقت ایک شخص کو لشکر کے بازار میں بھیجا کہ تحقیق کرے کہ کس نے اس کی لڑکی کو خریدا، جس نے خریدا ہو اس کو قیمت دے کر اور بچی کو لے کر آئے۔ تھوڑی دیر میں وہ سوار بچی کو کاندھے پر لئے ہوئے نظر آیا، بڑھیا زمین پر گرگئی اور اپنی پیشانی خاک پر رکھ کر دیر تک اپنی (مغربی) زبان میں کچھ کہتی رہی پھر خوش خوش اپنی بچی کو لے کر چلی گئی۔[۵۲]

قاضی ابن شداد کہتے ہیں کہ جب سلطان کسی یتیم کو دیکھتے تو محبت و شفقت کی باتیں کرتے اور اس کی دلجوئی فرماتے۔ اس کو کچھ عنایت فرماتے، اگر کوئی پرورش کرنے والا نہ ہوتا تو اپنی طرف سے کچھ انتظام فرماتے، اسی طرح جب کسی معمر شخص یا بوڑھے کو دیکھتے تو بڑے متاثر ہوتے اس کے ساتھ کچھ سلوک کرتے۔[۵۳]

مردانہ اوصاف صبر و استقامت اس درجہ کی تھی کہ قاضی ابن شداد کا بیان ہے کہ ایک مرتبہ کمر سے گھٹنوں تک اس قدر دانے اور پھوڑے تھے کہ بیٹھنے سے معذور تھے یہاں تک کہ دسترخوان بچھا اور کھانا تناول نہ کرسکے اس لئے کہ بیٹھنے کی قدرت ہی نہ تھی، اس کے باوجود دشمن کے مقابل صف آرا تھے، میں نے دیکھا ہے کہ صبح سے مغرب تک گھوڑے پر سوار ایک طرف سے دوسری طرف برابر چکر لگاتے اور افواج و انتظامات کا معائنہ فرماتے اور پھوڑوں کی تکلیف کو تحمل سے برداشت کرتے، میں تعجب کا اظہار کرتا تو فرماتے کہ گھوڑے پر سوار ہونے کے بعد مجھے درد کا احساس نہیں رہتا۔[۵۴]

---

۵۰ الفتح القسی فی الفتح القدسی، عماد الدین الکاتب ۵۱ النوادر السلطانیہ ص۲۲ ، ۵۲ ایضاً ص۲۸ ، ۵۳ ایضاً ص۱۸

ایک معرکہ میں حالت بیماری میں برابر دشمن کا تعاقب کیا، ایک رات میں اور طبیب سلطان کے پاس تھے، ہم تیمارداری بھی کرتے تھے اور ان کی طبیعت بھی بہلاتے تھے، سلطان کبھی سوتے کبھی جاگتے، یہاں تک کہ صبح ہو گئی، سلطان سوار ہو کر تیار ہو گئے، اپنے لڑکوں کو اللہ کے راستے میں سب سے آگے کیا اور سب کو خدا کے نذر کر دیا، ایک ایک کر کے سلطان نے سب کو روانہ کر دیا صرف میں اور طبیب رہ گئے، شام تک سلطان اسی طرح اپنی جگہ پر کھڑے رہے اور جنگ کی نگرانی کی یہاں تک کہ رات کو لشکر کو مسلح اور ہوشیار رات گذارنے کی اجازت ملی اور ہم اور سلطان اپنے خیمہ میں واپس آئے[۱]

شجاعت میں سلطان ضرب المثل تھے، قاضی ابن شداد راوی ہیں کہ سلطان دن میں ایک ایک دو دو بار دشمن کے گرد گشت کرتے، گھمسان کی لڑائی میں سلطان تن تنہا گھوڑے پر صفوں کے درمیان چکر لگاتے، ایک کوتل گھوڑا سائیس کے ساتھ ہوتا اور وہ خیمہ سے میسرہ تک فوجوں میں گھستے صفیں چیرتے نکل جاتے، فوجی دستوں کو بلاتے ان کو مناسب مقامات پر ٹھہرنے یا بڑھنے کا حکم دیتے، ان کے اطمینان اور بے خوفی کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ ایک مرتبہ میں نے ان سے کہا کہ سلطان نے مختلف مواقع پر حدیث سنی ہے لیکن کبھی عین معرکہ اور دو صفوں کے درمیان حدیث سننے کی نوبت نہیں آئی اگر یہ شرف بھی حاصل ہو جائے تو بہت اچھا ہے، چنانچہ سلطان نے صفوں کے درمیان کھڑے ہو کر حدیث شریف کی سماعت کی[۲]۔ انھوں نے کبھی دشمن کی تعداد کی پرواہ نہیں کی اور نہ کبھی اس کا اثر قبول کیا، بعض مرتبہ پانچ پانچ چھ چھ لاکھ کی تعداد ان کے مقابلہ میں تھی، اللہ نے ان کو فتح دی اور کثیر خلقت قتل اور گرفتار ہوئی[۳]، ایک مرتبہ دشمن کے کچھ اوپر ستر جہاز عکہ میں آئے، میں عصر سے مغرب تک گنتا رہا لیکن سلطان کے چہرہ پر شکن نہ تھی، عکہ کے سب سے بڑے معرکہ میں مسلمانوں کے قدم اکھڑ گئے، قلب لشکر تک نے اپنی جگہ چھوڑ دی، نشان و پرچم اور طاشے زمین پر گر گئے لیکن سلطان چند ساتھیوں کے ساتھ اپنی جگہ پر جمے رہے یہاں تک کہ پہاڑ کو پشت پر رکھ کر کھڑے ہو گئے اور مسلمانوں کو للکارا اور شرم دلائی اور وہ میدان میں واپس آئے اور دوبارہ حملہ کیا جس میں دشمن کے سات ہزار آدمی قتل ہوئے اور مسلمانوں کو فتح ہوئی[۴]۔ سلطان کی بلند ہمتی اور عالی حوصلگی کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ قاضی ابن شداد کہتے ہیں کہ

---

[۱] النوادر السلطانیہ ص۲۲۔ [۲] ایضاً ص۱۸۔ [۳] ایضاً ص۱۸۔ [۴] ایضاً ص۱۵

سلطان نے ایک روز فرمایا کہ "میں تم سے اپنے دل کی بات کہتا ہوں، میرا ارادہ ہے کہ ساحل کو صلیبیوں سے پاک کرنے کے بعد ملک کو تقسیم کردوں، وصیت کرکے اور ہدایات دے کر خود یہاں سے رخصت ہوکر چلا جاؤں اور سمندر میں سفر کرکے یورپ کے جزائر تک پہونچوں اور ان مغربیوں (یورپین قوموں) کا وہاں تک تعاقب کروں، یہاں تک کہ روئے زمین پر کوئی کافر نہ رہ جائے یا میں اس راہ میں کام آجاؤں۔[۵]

علم وفضیلت سلطان عالم فاضل شخص تھے، عرب کے انساب وقبائل یہاں تک کہ ان کے مشہور گھوڑوں کے سلسلہ نسب پر ان کو عبور تھا، عربوں کے واقعات وحالات ان کو مستحضر تھے۔ دنیا کے عجائبات ونوادر کا ان کو علم تھا، ہر طرح کے معلومات رکھتے تھے، ان کے ہم نشینوں کو ان سے بہت سی نئی باتیں معلوم ہوتی تھیں[۲] بعض مورخین کا بیان ہے کہ ان کو حماسہ حفظ تھا، لین پول ان کی ابتدائی زندگی کا ذکر کرتے ہوئے لکھتا ہے۔

> اس کا اصلی رجحان طبیعت دینیات کی طرف تھا، علمائے وقت سے احادیث سننے، ان کے براہین اور راویوں کے سلسلہ کی تحقیق، مسائل فقہ پر بحث، آیات قرآن کی تفسیر میں اسے بڑا انہماک رہتا تھا، اور سب سے بڑھ کر اس بات کا ذوق تھا کہ مذہب اہل سنت والجماعت کی تائید اور ثبوت قوی دلائل سے دیا جائے۔"

وفات بالآخر اپنا مقدس فریضہ ادا کرکے اور عالم اسلام کو صلیبیوں کی غلامی کے خطرے سے محفوظ کرنے کے بعد، ۲۷ صفر ۵۸۹ھ کو اسلام کا یہ وفادار فرزند دنیا سے رخصت ہوا، اس وقت اُن کی عمر ۵۷ سال کی تھی[۳]، قاضی بہاء الدین ابن شداد سلطان کی وفات کا حال بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:۔

> ۲۷ صفر کی شب کو جو سلطان کی علالت کا بارہواں دن تھا مرض میں شدت ہوگئی اور قوت گھٹ گئی، شیخ ابو جعفر امام الکلاسہ کو جو ایک نہایت صالح اور بزرگ شخص تھے زحمت دی گئی کہ رات کو قلعہ میں رہیں کہ اگر رات ہی کو وہ ساعت مقررہ آگئی جو سب کو پیش آنے والی ہے تو وہ اس وقت سلطان کے پاس ہوں اور ان کو تلقین کرسکیں اور اللہ کا نام لیں، رات کو سلطان ایسا معلوم ہوتا کہ سفر کے لئے پا بہ رکاب ہیں، شیخ ابو جعفر ان کے پاس بیٹھے ہوئے

---

[۵] النوادر السلطانیہ ص۱۷ ۔ [۲] النوادر السلطانیہ ص۶-۷ [۳] سلطان کی ولادت ۵۳۲ھ کی ہے (ابوالفدار)

تلاوت و ذکر میں مشغول تھے، تین دن پہلے سے ان پر ایک ذہول اور غفلت طاری تھی، کسی کسی وقت ان کو ہوش آتا تھا، جب شیخ ابو جعفر نے تلاوت کرتے ہوئے آیت "ھو اللہ الذی لا الٰہ الّا ھو عالم الغیب والشہادۃ" پڑھی تو سلطان کو ہوش آگیا ہونٹوں پر مسکراہٹ آئی اور چہرہ کھل گیا اور کہا صحیح ہے اور یہ کہہ کر جان جان آفریں کے سپرد کر دی یہ چہارشنبہ کا دن، صفر کی ستائیس تاریخ اور فجر کا وقت تھا، ایسا معلوم ہوتا تھا کہ خلفاء راشدین کی وفات کے بعد سے ایسا سخت دن مسلمانوں کی تاریخ میں نہیں آیا، قلعہ شہر اور تمام دنیا پر ایک دہشت سی برستی تھی، اللہ تعالیٰ ہی کو معلوم ہے کہ کیسا سناٹا اور کیسی اداسی تھی، میں پہلے جب سنتا تھا کہ لوگ دوسروں پر قربان ہو جانے اور ان کا فدیہ بن جانے کی تمنا کرتے ہیں تو سمجھتا تھا کہ یہ محض ایک مجاز اور تکلف کی باتیں ہیں لیکن اس دن معلوم ہوا کہ یہ حقیقت ہے خود میں اور بہت سے لوگ ایسے تھے کہ اگر ان کے امکان میں ہوتا کہ وہ سلطان پر جان قربان کر سکیں اور ان کی طرف سے فدیہ ہو جائیں تو وہ اس کے لئے تیار تھے۔

قاضی ابن شداد لکھتے ہیں کہ سلطان نے اپنے ترکہ میں صرف ۴۷ درہم چھوڑے تھے، کوئی ملک، مکان، جائداد، باغ، گاؤں، زراعت نہیں چھوڑی، ان کی تجہیز و تدفین میں ایک پیسہ بھی ان کی میراث کا صرف نہیں ہوا، سارا سامان قرض سے کیا گیا، یہاں تک کہ قبر کے لئے گھانس کے پولے بھی قرض سے آئے، کفن کا انتظام ان کے وزیر و کاتب قاضی فاضل نے کسی جائز و حلال ذریعہ سے کیا۔

ھادم اللذات

ایک سیاسی قوال

کا

عبرت ناک عروج و زوال

(از مولانا سید مناظر احسن گیلانی)

"منبروں پر چڑھنے، اور تقریر میں غلطیوں کی فکر نے مجھے اس حال میں مبتلا کیا ہے۔"

یہ جواب دیا تھا دمشق کی مروانی حکومت کے مشہور حکمران عبدالملک بن مروان نے اس شخص کو جس نے عبدالملک سے پوچھا تھا

"امیرالمومنین! دیکھتا ہوں کہ آپ پر بڑھاپا تیزی سے چھاتا چلا جا رہا ہے آخر اس کی وجہ کیا ہے۔"[۵۰]

اسی سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ سیاسی کاروبار کرنے والوں کو آرٹیری (خطابت اور بیان کی قوت) سے کام لینے کی ضرورت پہلے بھی اسی طرح تھی جیسے آج بھی اس دنگل کا سب سے بڑا پہلوان وہی ہو جو سب سے زیادہ پبلک کے دلوں پر اپنی زبان سے پھندے لگا سکتا ہو، لوگ وہی سمجھنے لگیں جو کچھ وہ سمجھانا چاہتا ہو۔ وہی ماننے لگیں جو ان سے وہ منوانا چاہتا ہو، فرق اگر کچھ ہو تو یہی ہو کہ اسٹیج کی جگہ، استعمال کرنے والے مسجد کے منبروں کو استعمال کرنے لگے تھے۔

ہادم اللذات کے عنوان کے نیچے بنی امیہ کے دو گورنروں (زیاد اور حجاج) کا ذکر آپ سن چکے،

---

۵۰ کامل ابن اثیر صفحہ ۱۹۹ ج ۴

اپنے وقت کے بہترین خطیبوں اور مقرروں میں یہ دونوں شمار ہوتے تھے۔ اس بات میں حجاج کی حسّی ذکاوت کا تو یہ حال تھا کہ مشہور امام عربیت یحییٰ بن یعمر سے حجاج نے دریافت کیا کہ میری تقریروں میں بھی کسی قسم کی کوتاہی تم پاتے ہو۔ جواب میں انھوں نے صرف اتنی بات کہی تھی کہ

"بعض الفاظ کے تلفظ میں خفیف سا نقص رہ جاتا ہے، حرف کو جس طرح ادا ہونا چاہیے ادا نہیں ہوتا، اسی طرح بعض مواقع میں زیر زبر کی غلطیاں بھی تم سے صادر ہو جاتی ہیں[1]۔"

لکھا ہو کہ یہ سننے کے ساتھ ہی حجاج جس نے خود ہی بڑے ذوق و شوق سے یحییٰ بن یعمر کو خراسان سے اس لیے طلب کیا تھا کہ خراسان کے کمانڈر یزید بن المہلب کی ڈاک یحییٰ ہی لکھا کرتے تھے۔ ان کی تحریروں کو دیکھ کر حجاج گویا ان کا عاشق ہو گیا تھا۔ اپنے دربار کے لیے ان کو خراسان سے طلب کر لیا۔ یہ دیکھ کر کہ یحییٰ اس کی بیانی کمزوریوں سے واقف ہیں، ایسا نہو کہ عوام میں ان غلطیوں کا چرچا پھیل جائے حجاج نے حکم دیا کہ

"صرف تین دن کی تم کو مہلت دی جاتی ہو، اس عرصہ میں جس طرح بھی ممکن ہو اپنے آپ کو عراقی علاقہ سے باہر نکال لو، تین دن کے بعد بھی عراق میں اگر تم دیکھے گئے تو میں تم کو قتل کر دوں گا۔" (کامل ج ۴ ص ۱۹۲)

بہرحال جس حکومت کا فرمان روا اور بادشاہ بھی تقریری کمزوریوں کے خوف سے بوڑھا ہو گیا ہو، اسی حکومت کے دوسرے ارکان کے لیے خطابت اور اڈیٹری کے کمالات کا جو حال ہو سکتا ہو وہ ظاہر ہو۔ آج بنی امیہ کی حکومت کے ایک تیسرے قوال[2] یا آرٹیٹر (خطیب) کا ذکر

ہادم اللذات

ہی کے عنوان کے نیچے اس لیے کرنا چاہتا ہوں کہ اس باب میں اس بے چارے کا حال بھی حد سے

---

[1] یعنی اِنّ کی جگہ اَنّ اور اَن کی جگہ اِنَّ بول دیتے ہو، جاننے والے جانتے ہیں کہ یہ کتنی معمولی بات ہو ۱۲

[2] اردو میں قوال صوفیوں کے غزل خوانوں اور گویوں کو کہتے ہیں۔ لیکن ہندوستان کا یہ ایک مقامی محاورہ ہے، عربی میں باتونی، اور بہت زیادہ بکواس کرنے والے کو قوال کہتے ہیں اسی لیے سیاسی خطیبوں اور اڈیٹروں کا نام میں نے قوال رکھ دیا ہو ۱۲۔

زیادہ سبق آموز، اور عبرت انگیز ہے، اس کا نام خالد تھا تاریخوں میں خالد بن عبداللہ القسری کے نام سے اس کا تذکرہ کیا جاتا ہے، کبھی کبھی ابن النصرانیہ کے لقب سے بھی لوگ اس کو ملقب کرتے تھے۔ جس کی وجہ آگے بیان کی جائے گی، خالد کے دادا جن کا نام یزید بن اسد تھا یمن کے قبیلہ بجیلہ سے تعلق رکھتے تھے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہو کر مشرف باسلام ہوئے۔ عہد صحابہ کی خانہ جنگیوں کے سلسلہ میں صفین کے نام سے جو معرکہ مشہور ہے، اس میں شام کی فوج کے ساتھ تھے۔ یعنی حضرت معاویہ کے طرفداروں میں تھے۔ حافظ ابن حجر نے اصابہ میں ابن معین کے حوالہ سے یہ قول بھی نقل کیا ہے کہ خالد کے دادا یزید بن اسد کے صحابی ہونے کا لوگوں نے انکار کیا ہے کچھ بھی ہو، تھے یہ یزید بن اسد حضرت معاویہ ہی کے رفقاء میں۔ ان کے دربار میں یزید امتیاز و احترام کی نظروں سے دیکھے جاتے تھے، یزید کے صاجزادے کا نام عبداللہ تھا، یہی خالد کے باپ تھے حکومت کے ساتھ عبداللہ کے تعلق کی نوعیت کچھ ایسی رہی کہ باپ کے خدمات کے معاوضہ میں کوئی بڑا عہدہ حاصل نہ کر سکے، عبدالملک مروانی خلیفہ نے ایک دفعہ خالد کے والد ان ہی عبداللہ بن یزید سے پوچھا بھی کہ تمھاری مالی حالت کیسی ہے؟ شاید ان کے تلف شدہ حقوق کی تلافی مقصود تھی۔ لیکن جواب میں عبداللہ نے جب یہ کہا کہ

> "مجھ پر کسی قسم کا بار بھی نہیں ہے، اسی کے ساتھ دو مسلکوں پر اپنی زندگی گزر رہی ہے، یعنی حق سبحانہ و تعالیٰ کے حکم سے راضی رہنا یہ تو میری زندگی کا پہلا اصول ہے، اور دوسری بات یہ ہے کہ انسانوں کی طرف سے اپنے اندر لاپرواہی اور استغنا پاتا ہوں۔"
>
> (اصابہ ج ۳۳۶/۴۷)

تو یہ سن کر عبدالملک خاموش ہو گیا، عبداللہ کی اسی قسم کی باتوں اور خاص قسم کی زندگی کی وجہ سے لوگ ان کو وقت کے دانش مندوں اور عقلاء الرجال میں شمار کرتے تھے۔ (اصابہ)

لیکن عربی کی مشہور ضرب المثل

لیس جواد الالہ کبوۃ والا شجاع الالہ ھبوۃ ولا صادم الالہ نبوۃ۔	کوئی گھوڑا نہیں جو کبھی ٹھوکر نہ لے، اور کوئی ایسا بہادر نہیں جس سے کبھی کمزوری صادر نہ ہو، کوئی تلوار نہیں جسے کبھی نہ کبھی اچٹنا ہی نہ پڑتا ہو۔

واللہ اعلم کیا صورت پیش آئی، لکھا ہے

نصرانیۃ رومیۃ ابتنی بھا ابوہ فی بعض اعیادھم
کامل ابن اثیر
ص۱۰۳، ج ۵

ایک رومیہ یعنی یوروپین لیڈی تھی جس کے ساتھ (خالد کے والد (عبداللہ بن یزید)، ہم خلوت ہوئے عیسائیوں کے کسی تہوار جشن کے دن۔

بظاہر یہ دمشق ہی کا قصہ معلوم ہوتا ہے، جہاں مسلمانوں سے پہلے رومیوں ہی کی حکومت قائم تھی، اور فتح شام کے بعد بھی رومی عیسائیوں کی کافی تعداد شام میں وطن پذیر رہی، بلکہ اس وقت تک اس ملک میں مسلمانوں کے ساتھ عیسائی بھی آباد ہیں۔[1]

نہیں کہا جا سکتا کہ اس رومیہ خاتون یا یوروپین لیڈی سے عبداللہ کے تعلق پیدا ہونے کی کیا صورت ہوئی، لیکن عیسائیوں کی عید کے دنوں میں سے کسی دن میں ہم خلوت ہونے کی تقریب جو انجام پائی اس سے معلوم ہوتا ہے کہ راز میں یہ کام انجام نہیں پایا تھا، اسلام کے قانون نکاح کے

---

[1] بلکہ اسی شام کے شہر دمشق ہی کے متعلق شیخ اکبر ابن عربی رحمۃ اللہ علیہ کی کتاب فتوحات مکیہ میں ان کی اس چشم دید شہادت کو پڑھ کر حیران ہو گیا۔ شیخ جیسا کہ معلوم ہو چھٹی صدی ہجری کے بزرگوں میں ہیں، ان ہی کے زمانہ میں شام پر صلاح الدین ایوبی اور ان کے خانوادہ کی حکومت قائم تھی۔ مگر بایں ہمہ شیخ لکھتے ہیں کہ دمشق میں دیکھتا ہوں کہ

اس شہر کی اکثر مسلمان عورتیں اپنے چھوٹے بچوں کو عیسائیوں کے گرجوں میں لے جاتی ہیں۔

پادری ان بچوں کو برکت عطا کرتا ہے اور معمودیہ (یعنی بپتسمہ) والے پانی کو ان بچوں پر چھڑکتا ہے۔

شیخ نے یہ بھی لکھا ہے کہ ان عورتوں کے خاوند عموماً اس قصہ میں چشم پوشی سے کام لیتے ہیں۔ ص۶۳۷ ج۲ - اور اس سے سمجھ میں آتا ہے کہ سیاسی برتری ہی میں ہر قسم کی برتریوں کی ضمانت کا دعویٰ شاید عملاً صحیح نہیں ہے۔ شام میں مسلمانوں ہی کی اکثریت تھی۔ اور حکومت بھی مسلمانوں ہی کی قائم تھی اور وہ بھی جنگ صلیبی کے مشہور ہیرو صلاح الدین کی حکومت۔ لیکن بایں ہمہ آپ سن رہے ہیں اسلام کے ایک ثقہ بزرگ کی چشم دید گواہی کو۔ یاد رکھنا چاہیے کہ شیخ نے اس موقعہ پر جو الفاظ استعمال کیے ہیں وہ یہ ہیں لقد رأیت بدمشق اکثر نسائھا یفعلن ذلک۔ یعنی اکا دکا عورتوں کا معاملہ نہ تھا بلکہ مسلمان خواتین کی اکثریت کا یہ طرز عمل شیخ کے زمانہ میں تھا۔

رو سے کتابیہ سے عقد ازدواج کوئی قابل اعتراض بات نہ تھی لیکن اس قسم کے نکاحوں کے جو نتائج ہوتے ہیں اس کا ایک دردناک تجربہ عبداللہ بن یزید کی جسارت سے بھی ہوا، اسی نصرانیہ رومیہ (یوروپین کرسچین لیڈی) کے بطن سے دو بیٹے خالد اور اسد نامی پیدا ہوئے۔ اور ان کی پرورش اسی عیسائیہ عورت کی گود میں ہوئی۔ کیونکہ نکاح کے بعد بھی آخر وقت تک یہ عورت اپنے آبائی دین عیسائیت ہی پر مُصر رہی۔ اپنے بچوں پر اس عورت کا جو اثر تھا اس کا اندازہ اسی سے ہو سکتا ہے جیسا کہ آئندہ معلوم ہوگا کہ خالد جب کوفہ کا والی (گورنر) ہوا تو اس خالص اسلامی شہر میں جو مسلمان فوجیوں کی چھاونی، اور خاص مسلمانوں کا آباد کیا ہوا تھا، اسی میں اپنی عیسائیہ ماں کی خاطر سے خالد نے گرجا بھی تعمیر کیا تھا۔

عربی زبان کے مشہور شاعر فرزدق نے خالد کی شان میں جو ہجویہ قصیدہ لکھا تھا، اسی قصیدہ کا ایک مصرعہ تھا۔

بنی بیعۃ فیہا النصاری لامہ	خالد نے عیسائیوں کا گرجا (کوفہ میں) اپنی
(کامل ج ۵ ص ۱۰۳)	ماں کی خاطر سے تعمیر کیا۔

اس قصہ کی کچھ تفصیل آگے بھی آرہی ہے۔

بہرحال اسی یوروپین لیڈی کہیے، یا نصرانیہ رومیہ کے بطن سے دو بچے دمشق میں پیدا ہوئے، جوان ہونے کے بعد اپنے والد عبداللہ کے طرز عمل کے خلاف حکومت میں شریک ہونے کی کوشش میں منہمک ہوئے۔ خالد بڑا تھا، اسی کو پہلا موقعہ دوسرے مروانی حکمراں ولید بن عبدالملک کے عہد حکومت میں یہ ملا کہ مکہ معظمہ کی ولائت (گورنری) ۸۹ھ ہجری میں خالد کے سپرد ہوئی۔ یہ حجاج اور حجاج کے سیاسی نظریے کے عروج کا زمانہ تھا، یعنی حکومت کے ساتھ غیر مشروط وفاداری اسی کا نام ایمان و اسلام تھا، اور حکومت سے غداری سمجھا جاتا تھا۔ اور سمجھایا جاتا تھا کہ اس کی اصطلاحی تعبیر کفر ہے۔[۱]

بنی امیہ کی حکومت کے مشرقی صوبوں کا حاکم اعلیٰ اور والیٔ اکبر اس زمانہ میں حجاج ہی تھا۔ القراء یعنی غریب مولویوں کے خروج کا حادثہ حجاج کے مقابلہ میں جو پیش آیا تھا شکست کے بعد ان ہی القراء (مولویوں) میں سے بعض لوگ جن میں حضرت سعید بن جبیر مجاہد، طلق بن حبیب خاص طور پر قابل ذکر ہیں، مکہ ہی میں آکر روپوش ہو گئے تھے۔

---

[۱] (حاشیہ اگلے صفحہ پر ملاحظہ ہو)

ان کے نام حکومت کی طرف سے وارنٹ جاری تھا، خالد کو اگرچہ مکہ کی گورنری مل گئی تھی، لیکن حاجیوں کے اس شہر کے والی کی حیثیت ایک پولیس سپرنٹنڈنٹ سے زیادہ نہ تھی، خالد آگے بڑھنا چاہتا تھا، لیکن موقع نہیں مل رہا تھا، چار سال تقریباً اس ملازمت میں اس کے گذر چکے تھے، منتظر رہتا تھا کہ وقت کی پیشانی سامنے آئے تو اسے پکڑ کر آگے بڑھوں، مکہ میں الفرار کیسے، یا ان بے چارے مولویوں کا پناہ گزیں ہونا اس کے لیے ایک مغتنم موقع بن گیا۔ اور وہی خالد مکہ کی گورنری سے پہلے دمشق میں اتنا انصاف پسند اور رحمدل اپنے آپ کو ثابت کرنے میں کامیاب ہوا تھا کہ اس کے بعض کارناموں پر لوگوں کو حیرت ہوتی تھی، کہتے ہیں کہ گھوڑے پر ایک دن دمشق میں جا رہا تھا راستہ میں کوئی بچہ تھا، گھوڑے سے ٹھوکر کھا کر گرا، گھوڑے کی ٹاپ سے بری طرح زخمی ہوا، خالد بجائے اس کے کہ گھوڑے کو اڑاتے ہوئے آگے بڑھتا وہیں اتر گیا، دیکھا تو بچہ بے حس وحرکت پڑا ہوا ہے، نوکر کو حکم دیا کہ اس کو اپنی پیٹھ پر اٹھا لے، سامنے لوگوں کی کوئی مجلس تھی، خالد نے اہل مجلس کو خطاب کر کے کہا کہ

"آپ لوگ اس کے گواہ رہیں، میرے گھوڑے سے چوٹ کھا کر یہ بچہ گر گیا، خدا نخواستہ اس کے ساتھ کوئی حادثہ پیش آیا (یعنی مر گیا) تو اس کا ذمہ دار میں ہوں"

لہ (حاشیہ صفحہ گزشتہ) بصرہ اور کوفہ کے القرا یعنی اس زمانہ کے مولویوں نے حجاج کے خلاف بغاوت کا علم جب بلند کیا تھا، جس میں بڑے بڑے لوگ شریک ہو گئے تھے، کافی خوں ریزی کے بعد جب حجاج نے القرا کی شورشوں کا قلع قمع کر دیا، تو لکھا ہو کہ قیام امن کے بعد حجاج نے کوفہ میں اعلان کیا کہ لوگوں کو امیر المومنین کی بیعت کی تجدید کرنی پڑے گی۔ لوگ آتے تھے اور بیعت کی تجدید کرتے تھے، حجاج ان لوگوں سے جنھوں نے بغاوت میں حصہ لیا تھا، پوچھتا کہ تم لوگ کافر ہو گئے تھے؟ جواب میں جو کہتے کہ جی ہاں میں کافر ہو گیا تھا، ان کی تو بیعت لے لیتا، لیکن جو اعترافِ کفر میں کچھ بھی پس وپیش کرتے اسی وقت ان کی گردن اڑا دیتا، اس سلسلہ میں بعض عجیب وغریب قصے پیش آئے۔ ایک مسلمان بے چارے نے کہا کہ اسی سال سے میں خدائے واحد کی عبادت کر رہا ہوں، کیسے کہہ دوں کہ میں کافر ہو گیا تھا، ان کو بھی قتل ہونا پڑا۔ ایک صاحب اور تھے حجاج نے ان کو دیکھ کر کہا کہ یہ بھی کفر کا اقرار نہ کرے گا، اس نے سن لیا اور آگے بڑھ کر بولا کہ روئے زمین کے کافروں میں خاکسار سب سے بڑا کافر تھا، فرعون سے بھی زیادہ کافر، حجاج ہنس پڑا اور اس کو چھوڑ دیا

(کامل ابن اثیر ج ۵ ص ۱۸۵)

ابن عساکر نے لکھا ہو کہ دمشق میں یہ پہلا موقع تھا کہ

عرف من سؤد خالد (تاریخ دمشق جزء ۵ ص ۹۶) خالد کی بڑائی سے لوگ واقف ہوئے۔

کردار کی بلندی و برتری کے ان ہی مظاہر کی بدولت حکومت کی توجہ اس کی طرف ہوئی تھی۔

لیکن جب تک رحمدلی اور انصاف پسندی سے کام لینے کی ضرورت تھی اس وقت تک ان ہی ہتھکنڈوں کو استعمال کرتا رہا، لیکن مکہ پہونچ کر جب اس نے دیکھا کہ سال پر سال گزرتے چلے جاتے ہیں، لیکن اس بن کھیتی کے بیابان کی خشک اور سوکھی گوزری ہی میں ہاتھ پاؤں مار رہا ہوں تب اسی انصاف پسند رحمدل خالد کو دیکھا گیا کہ وہی مکہ جس کے متعلق جاہلیت ہی میں نہیں اسلام میں بھی من دخلہ کان آمنا (جو حرم کے حدود میں داخل ہوگیا وہ امن میں آگیا)[۱] کے الفاظ قرآن میں پائے جاتے ہیں۔ مکہ معظمہ کے ان ہی احترامی حدود میں بے چارے چند مولوی دنیا سے بھاگ کر پناہ گزیں ہوئے حکومت کی نظروں میں خواہ ان کے جرم کی نوعیت کچھ ہی ہو۔ لیکن واقعہ میں حکومت مجرم تھی، یا یہ غیبہ القراء (مولوی) مجرم تھے، اسے دنیا جانتی ہو۔ لیکن خالد تو سیاست کے میدان میں آگے بڑھنے کے لیے اترا تھا، اس کی رحمدلی اور انصاف پسندی بھی سیاسی ارتقاء ہی کے لیے تھی، اور آج موقع کی پیشانی کے سنہرے بال اس کے ہاتھوں میں جو آگئے تھے، سیاسی نقطہ نظر سے اس سے نفع نہ اٹھانے کے معنی ہی کیا ہو سکتے تھے۔ اس نے دل میں فیصلہ کیا۔ اور عہد تابعین کے ان علماء کو جن میں ہر ایک بخاری شریف کے رواۃ تھے۔ یعنی سعید بن جبیر مجاہد طلق بن حبیب ان تینوں حضرات کو اس نے حرم کی سرزمین میں گرفتاری

---

[۱] جاہلیت میں تو کسی قسم کا مجرم ہوتا تھا حرم میں آجانے کے بعد سمجھا جاتا تھا کہ کسی قسم کا تعرض اس کے ساتھ جائز نہیں، لیکن کعبہ کے احترام کے ساتھ انسانی جان و مال و آبرو کے احترام کا بھی نقطہ نظر اسلام کے سامنے تھا۔ اسی لیے اس عام جاہلی رسم کی تصحیح یہ کی گئی کہ حرم کے حدود کے باہر قتل کے جرم کا مجرم اگر پناہ گزیں ہو تو اس کو حرم سے نکلنے پر مجبور کیا جائے یعنی لوگوں کا فرض ہو کہ اس سے بائی کاٹ کرلیں۔ لین دین داد و ستد بات چیت نشست و برخاست اس کے ساتھ ترک کردیں۔ یوں حرم سے نکلنے پر اس کو مجبور کریں۔ جب حرم سے نکل جائے تب قتل کی سزا اس کو دی جائے یہی امام ابو حنیفہ کا مذہب ہو۔ مسئلہ کی تفصیل فقہ کی کتابوں میں پڑھیے ۱۲۔

نہیں کیا، بلکہ گرفتار کرکے حکم دیا کہ ان تینوں کو کوفہ حجاج کے پاس بھیج دیا جائے جس کے خلاف ان مولویوں نے بغاوت کی کھچڑی پکائی اور مخالفت کا علم بلند کیا تھا، فوج کے سپاہیوں کے پہرے میں ان کو کوفہ خالد نے روانہ کردیا، طلقؒ بن حبیب کا تو راستہ میں انتقال ہوگیا، مجاہد اور سعید زندہ کوفہ تک پہونچادیے گئے۔ اللہ اللہ ایک طرف تاریخوں میں ہم پڑھتے ہیں کہ پہرے کے یہ فوجی سپاہی جو بیچارے عوام میں شمار ہوتے تھے انکے دلوں میں تو رحم کا اتنا جذبہ پیدا ہوا کہ راستہ میں بار بار وہ کہتے تھے کہ بھاگنا چاہتے ہو تو ہم اس کا موقع دے سکتے ہیں، اگرچہ سعید بن جبیر نے جواب میں وہی فقرہ دہرایا جو اس موقع پر انھوں نے مکہ میں بھی کہا تھا، جب لوگوں نے مکہ سے نکل جانے کا مشورہ دیا تھا یعنی

"کہاں تک میں بھاگتا پھروں، خدا سے مجھے شرم آتی ہو، اور میری قسمت کا لکھا اب میرے سامنے آکر رہے گا۔" (طبری ج ۵ ص ۹۳)

آخر اسی حال میں کوفہ دونوں پہونچادیے گئے، واللہ اعلم یہ تاریخی لطیفہ کہاں تک صحیح ہو کہ حجاج کے پاس مکۂ معظمہ سے گرفتار ہوکر یہ دونوں حضرات (سعید و مجاہد) پہونچے تو سنگدل حجاج کی زبان سے بھی یہ الفاظ نکل پڑے۔

"ارے خدا کی لعنت اس نصرانیہ کے بیٹے (یعنی خالد) پر، کیا وہ یہ سمجھا تھا کہ یہ دونوں جہاں روپوش تھے، میں اس سے ناواقف تھا۔ خدا کی قسم میں ان لوگوں کو بھی جانتا تھا اور جس گھر میں یہ دونوں رہتے تھے اسے بھی جانتا تھا۔" (ج ۵ ص ۲۲۱)

بظاہر جس کا مطلب یہی ہوسکتا ہو کہ حجاج بھی اپنے اندر جرأت نہیں پاتا تھا کہ حرم کے ان پناہ گزینوں پر ہاتھ ڈالے۔ واللہ اعلم یہ اس کا صحیح جذبہ تھا، یا یہ بھی اس کی سیاسی ڈپلومیسی ہی تھی؟

خیر حجاج کے دل میں کچھ ہو۔ لیکن خالد جو دن کی روشنی میں اس حرکت کا مرتکب ہوچکا تھا وہ اپنے اس فعل کے ردعمل سے واقف تھا۔ بیان کیا جاتا ہو کہ ان دونوں بزرگوں کو کوفہ گرفتار کرکے روانہ کرنے کے بعد، مسجد حرم کے منبر پر چڑھا، اور مکہ کے باشندوں کو خطاب کرکے اس نے پوچھا کہ

"شاید تم لوگوں کو میری یہ حرکت ناگوار گذری ہو۔"

پھر حکومت کی غیر مشروط اطاعت کا سیاسی نظریہ جس کے متعلق حجاج مدعی تھا کہ قرآن [۱] سے یہی سمجھ میں آتا ہے، اسی کی طرف ایما کرتے ہوئے بغیر کسی دغدغہ اور ہچکچاہٹ کے جیسا کہ ابن عساکر نے تاریخ دمشق میں نقل کیا ہے۔ خالد حرم کعبہ میں کھڑا ہو کر، کعبہ محترمہ کی طرف انگلیوں سے اشارہ کر کے کہہ رہا تھا کہ۔

"خدا کی قسم امیر المومنین (حکمراں وقت) کا فرمان اگر صادر ہو تو اس عمارت (کعبہ) کی اینٹ سے اینٹ میں بجا دوں گا، اور توڑ پھوڑ کر ایک ایک پتھر بھی (ان کے حکم) سے نکال کر رکھ دوں گا۔" (ص ۹۷ ج ۵)

بے چارے مکہ کے بے بس مسلمان خالد کے ان الفاظ کو سن رہے تھے، اور اندر ہی اندر گھٹتے تھے، حکومت کے فولادی پنجے سے پنجہ کرنے کی ان میں سکت نہ تھی۔ اور سچ پوچھیے تو خالد کو ان غریبوں کی پروا بھی نہ تھی، بظاہر گو خطاب تو ان ہی سے کر رہا تھا، اور اپنے نزدیک ان ہی کے دل کی ناگواری کا ازالہ معلوم ہوتا تھا کہ اس کا مقصود ہو، لیکن در حقیقت اپنے ان الفاظ کو وہ اس کان تک پہونچانا چاہتا تھا جو دمشق کے اقتدار اعلیٰ کا کان تھا، عبد الملک تو مر چکا تھا، اس کے بعد اس کا بیٹا ولید بن عبد الملک تخت نشین ہوا تھا۔ خالد ولید ہی کے کان تک یہ پہونچانا چاہتا تھا کہ "حکومت کی غیر مشروط اطاعت" ہی سب کچھ ہے، یہی دین ہے، یہی ایمان ہے۔ یہ نظریہ صرف حجاج ہی تک محدود نہیں ہے، بلکہ حجاج سے وراثت میں یہ نظریہ دوسرے جاں نثاروں اور وفاداروں تک منتقل ہو چکا ہے۔

خالد کو امید تھی کہ ولید تک میرے جذبہ اطاعت و عقیدت کی خبر مذکورۂ بالا الفاظ میں جب پہونچے گی تو وادی غیر ذی زرع (بن کھیتی کے بیابان) کی جگہ چرنے کے لیے کوئی سرسبز شاداب چراگاہ مجھے ملے گی جیسے حجاج کو اس کا صلہ کوفہ و بصرہ خراسان کی گورنری کی شکل میں مل چکا ہے۔ دمشق تک معلوم ہوتا ہے کہ خالد کی اس تقریر کی خبریں مختلف ذرائع سے پہونچتی رہیں لیکن

---

[۱] سورۂ تغابن کی آیت فاتقوا اللہ ما استطعتم و اطیعوا اللہ کو پیش کر کے کہتا تھا کہ اللہ سے ڈرنے کا حکم استطاعت کے ساتھ مشروط ہے لیکن اطاعت میں استطاعت کی قید نہیں ہے ۱۲

کوئی عملی نتیجہ جس کی خالد کو توقع تھی، وہ اس کے سامنے نہ آیا، اور واقعہ یہ بھی تھا کہ خالد کی حیثیت اس باب میں ایک مقلد سے زیادہ نہ تھی، مجتہد و امام تو اس نظریہ کا حجاج تھا۔ ضرورت تھی کہ خود خالد اپنی اپج اور ذاتی اجتہاد کے کسی نتیجہ کو پیش کرے وہ اس فکر ہی میں تھا کہ اتفاق دیکھیے کہ اسی زمانہ میں مکۂ معظمہ کے نواح ہی میں ایک مقام جس کا نام "ثنیہ طوی" تھا، اور حجون کی گھاٹی میں تھا، اسی مقام پر ولید کے حکم سے ایک کنواں کھدوایا گیا، جس کا پانی شیریں تھا۔

واقعہ کی نوعیت کل اسی قدر تھی، لیکن سیاسی میدانوں میں بازی کیسے جیتی جاتی ہو اس کی یہ ایک دلچسپ تاریخی نظیر ہو، خالد چاہتا تھا کہ حکومت کے ساتھ وفاداری کی اہمیت میں غیر مشروط اطاعت والے حجاجی نظریہ سے بھی زیادہ مؤثر اور گہری بات پیش کرے اس کی سمجھ میں آگیا کہ یہی کنواں اس نظریہ کو پیش کرنے کا ذریعہ بن سکتا ہو، دیکھا گیا کہ حرم کعبہ کے مشہور تاریخی کنوئیں چاہ زم زم کے پاس ایک حوض کھدوا رہا ہو جسے اس نے کنوئیں کی طرح پختہ کرا دیا پھر حکم دیا کہ پکھالوں میں بھر بھر کر ولید کے کھدوائے ہوئے کنوئیں سے اونٹوں پر پانی لایا جائے۔ اور اس گڑھے کو اسی پانی سے بھر دیا جائے، گویا زمزم کے بغل میں ایک جدید مجازی کنوئیں کی شکل اس حوض نے اختیار کرلی اجازت دی گئی کہ لوگ اس حوض کے پانی کو جس طرح چاہیں استعمال کریں۔ کارندوں کو حکم تھا کہ حوض ہمیشہ لبالب پانی سے بھرا رہے، جب خالی ہو تو بھر دیا جائے۔

جب یہ سب کارروائی مکمل ہو گئی تو دیکھا گیا کہ حرم کعبہ کے حدود میں اپنے اسی مجازی کنوئیں کے پاس خالد کھڑا ہوا ہو، اور کعبہ کے سامنے بغیر کسی شرم و حیا کے اپنی نواکیت اور آرٹیزمی کا کمال ان الفاظ کے ساتھ دکھا رہا ہو۔ خطاب کرکے مکہ والوں سے کہہ رہا تھا۔

"لوگو! میں پوچھتا ہوں کہ اپنے گھر کے لوگوں اور اپنے اہل و عیال کی نگرانی کے لیے ایک شخص کسی کو اپنا خلیفہ اور نمائندہ منتخب کرتا ہو اور دوسرے آدمی کو یہی شخص اپنا ایلچی اور پیغام رساں قاصد و رسول، بنانے کے لیے چنتا ہو، انصاف سے پوچھتا ہوں یہ دونوں آدمی — یعنی جو خلیفہ مقرر ہوا ہو، وہ

اور جسے قاصد اور پیغام رساں (رسول) بنایا گیا ہو، کیا رتبہ میں مقرر کرنے والے شخص کے نزدیک یہ دونوں برابر قرار دیے جاسکتے ہیں؟

پھر خود ہی جواب میں سنا گیا کہہ رہا تھا،

"لوگو! تم پر افسوس ہو، خدا کے خلیفہ (امیر المومنین اور حکمران وقت) کی برتری اور فضیلت کی صحیح یافت تم لوگوں کو اب تک میسر نہیں ہوئی ہے۔"

اس کے بعد پہلے اس نے چاہ زمزم کی طرف اشارہ کرتے ہوئے لکھا ہو کہ کہا

دیکھو! ابراہیم خلیل (جو خدا کے رسول تھے) انھوں نے خدا سے پانی مانگا، پانی تو ان کو مل گیا، لیکن کیسا پانی؟ شور اور تلخ پانی؟

پھر اپنے مصنوعی حوض کی طرف رُخ کر کے بولا

اور دیکھو (خدا) کے خلیفہ نے بھی پانی ہی چاہا، اس کو بھی پانی دیا گیا، کیسا پانی، شیریں اور خوش گوار"

اتنے الفاظ تو طبری اور ابن اثیر وغیرہ نے نقل کیے ہیں، ابن عساکر نے یہ اضافہ بھی کیا ہو کہ اسی کے ساتھ اس ابن النصرانیہ نے یہ بھی کہا کہ

هو لا يشبه بام الخنافس يعنى زمزم

(جو پانی خلیفہ کو عطا ہوا) وہ اس گندے بدبو کیڑے کی ماں (زمزم) کے جیسا نہیں ہو (العیاذ باللہ)

(ج ۵ ص ۹)

دیکھ رہے ہیں، اس ابن النصرانیہ خالد کی سیاسی قوالیت کو، حجاج تو حکومت کی صرف "غیر مشروط اطاعت" ہی کا قائل تھا، لیکن شاید حجاج کیا حجاج کے شیطان دماغ میں بھی یہ کیفیت نہ آیا ہوگا کہ حکومت کا درجہ رسالت سے بھی بالا اور برتر ہو۔ استدلالی وضاحت ملاحظہ فرمائیے۔ کہ اپنی طرف سے کچھ جھوٹ کچھ سچ کو ملا کر ایک اتفاقی واقعہ کو مستقل نظریہ یا عقیدہ کی بنیاد ہی خالد نے بنا لیا۔[۱]

---

[۱] طبری وغیرہ میں ہو کہ ولید کا یہ کھدوایا ہوا کنواں کچھ ہی دنوں بعد خشک ہوگیا، پھر کسی کو آج تک پتہ نہ چلا کہ وہ کہاں تھا

[*] شاید ابن النصرانیہ کی بکواس کا قدرت کی طرف سے یہ جواب تھا، علاوہ ایک اتفاقی واقعہ کے یہ بھی (باقی اگلے صفحہ پر)

گر سیاسی میدانوں کے بازیگروں کی ان لن ترانیوں، اور منھ زوریوں پر آپ تعجب کیوں کرتے ہیں۔

یہ تو خیر سُنے سُنائے پرانے قصے ہیں۔ لیکن آج جو کچھ ہم دیکھ رہے ہیں، سُن رہے ہیں، کیا اس کے بعد بھی ان پرانے قصوں پر حیرت کرنے کی کوئی وجہ باقی رہی ہو۔ ہندوستان خصوصاً شمالی ہند میں مادری زبان کے سلسلے میں کہنے والے اب تک کیا کچھ نہیں کہہ چکے ہیں۔ مادری زبان ہی میں اس زبان کی مادری زبان ہونے کا انکار اس زمانہ میں جب کوچہ و بازار میں لوگ کر رہے ہیں، خود اپنی زبان سے یہ دعویٰ کہ میری زبان کاٹ لی گئی ہو۔ اس لطیفہ میں اور زبان ہی کے اس لطیفہ میں کیا فرق ہو۔

لیکن جو کچھ کہا جاتا ہو سیاست میں جب وہ مقصود ہی نہ ہو، بلکہ دوسرے چھچھورے اغراض کے لیے باتیں بنانے والے بناتے ہیں تو اس ابن النصرانیہ خالد کی شکایت کیوں کیجیے۔ وہ بے چارا تو بڑھنا چاہتا تھا، حجاز کے خشک، سنگستانی سرزمین کی گو رزی سے اُکتا چکا تھا، وہ کسی ہری بھری چراگاہ کا آرزومند تھا۔

لیکن بقول اس عربی شاعر کے

ما کل ما یتمنی المرء یدرکہ

تجری الریاح بما لا تشتھی السفن

یعنی ہمیشہ جہازوں کو موافق ہوائیں میسر نہیں آتیں، کبھی کبھی بادِ مخالف سے بھی سابقہ پڑ جاتا ہو۔

(بقیہ حاشیہ صفحہ گزشتہ) جھوٹ ہو کہ زمزم حضرت ابراہیم علیہ السلام کی استدعا پر نمایاں ہوا تھا، سب جانتے ہیں کہ سیدہ ہاجرہ کی آرزو کا قدرت کی طرف سے یہ جواب تھا، نیز زمزم کے پانی کو "ملح واجاج" (نمکین اور تلخ) قرار دینا، اس میں بھی مبالغہ سے کام لیا گیا ہو۔ اس میں شک نہیں کہ زمزم کا پانی بالکل شیریں تو نہیں ہو لیکن قطعاً کھارا اور نمکین بھی نہیں ہو بلکہ تازہ نکال کر پینے والے اگر آنکھ بند کر کے پئیں تو تجربہ بتائے گا کہ دودھ کا مزہ اس پانی میں مل رہا ہو۔ خود اپنا ذاتی تجربہ تو یہی ہو۔ اور نیز صحیح حدیثوں میں ہو کہ مشروب ہی نہیں بلکہ غذا کا کام بھی زمزم کے پانی سے لیا جا سکتا ہو۔ حضرت ابوذر غفاری نے تیس دن تک صرف زمزم کے پانی پر گزر کیا۔ اس زمانہ میں وہ نسبتاً زیادہ فربہ ہو گئے تھے۔ یوں بھی زمزم کے پانی کی کیمیائی تحلیل کے بعد مصر کے بعض ڈاکٹروں کو اس میں ایسے قیمتی عناصر ملے ہیں جو عام*

*پانی میں بہت کم پائے جاتے ہیں، تفصیل کے لیے کتابوں کا مطالعہ کرنا چاہیے ۱۲۔

عرض کر چکا ہوں کہ حجاج سے بھی آگے بڑھ کر خالد نے اپنے اس سیاسی نظریہ کو پیش کیا تھا کہ حکومت کا مرتبہ رسالت سے بھی افضل ہو اور گو صاف لفظوں میں کسی نے اس سے یہ نقل نہیں کیا ہو، کہ اس سلسلہ میں آخری رسالت کا نام بھی اس بدبخت نے کبھی لیا، لیکن جو کچھ وہ کہہ رہا تھا، کوئی وجہ نہ تھی کہ "رسالت محمدیہ" علی صاحبہا الصلوٰۃ والتسلیمات کے متعلق یہ سمجھا جاتا کہ اس کلیہ سے اس کو مستثنیٰ قرار دیتا تھا۔ بالکل ممکن ہو کہ اہل بیت کا نام لے کر اس زمانہ میں جو سیاسی تحریکیں چلا رہے تھے ان کے مقابلہ میں اس نظریہ کو وہ استعمال کرتا ہو، یعنی بنی ہاشم کو رسالت ملی اور حکومت وخلافت کے لیے قدرت نے بنی امیہ کے خانوادہ کا انتخاب کیا، اس لیے اہل بیت پر بنی امیہ کے اہل بیت کو فضیلت حاصل ہونا چاہیے۔

کچھ بھی ہو اس کا خیال یہی تھا کہ حکمران وقت ولید بن عبد الملک کو قابو میں لانے کے لیے یہ ایک چلتا ہوا فقرہ ہو، اس کا پتہ نہ چلا کہ ولید تک خالد کے اس دلچسپ نظریہ کا ذکر پہونچ پایا یا نہیں، ولات اور حکام کی ہر حرکت وسکون کی خبریں پہونچانے والے گوئندے حکومت کے گوشہ گوشہ میں پھیلے ہوئے تھے پھر جو بات اسلام کے سب سے بڑے دینی مرکز، صحن کعبہ کے اندر بھری مجلس میں کہی گئی ہو، کوئی وجہ نہیں معلوم ہوتی کہ پہونچانے والوں نے ولید تک اس کو نہ پہونچایا ہو۔ کچھ تعجب نہیں کہ خالد نے خود کوشش کی ہوگی کہ خلیفہ تک میری یہ اجتہادی اُپج پہونچ جائے اور جیسے حجاج کو اطاعت غیر مشروط کے نظریہ کا صلہ ملا تھا، اسی قسم کے صلہ کی امید میں خالد دن بھی گن رہا ہوگا، مگر حالات نے کروٹ لی اس کی سب سے بڑی امیدگاہ ولید ان ہی دنوں میں سخت بیمار ہوا، ایسا بیمار کہ لوگوں کو اس کی موت کا یقین ہو چکا تھا، ان لوگوں کے لیے جن کا ولید گویا ان داتا مہراج بنا ہوا تھا ولید کی یہ علالت بڑی ہوش ربا تھی، اور تو اور حجاج جیسے آہنی آدمی کے انجر پنجر بھی ڈھیلے پڑ گئے تھے: تاریخ میں لکھا ہو کہ ولید کی اس خطرناک علالت کی خبروں نے اسے بوکھلا دیا تھا، سعید بن جبیر کے قتل کے بعد یوں ہی اس کا دماغ خراب ہو چکا تھا، ولید کی اس جان لیوا علالت کے خوف سے رہی سہی عقل بھی اس کی جاتی رہی، طبری وغیرہ نے لکھا ہو کہ

"رسی میں اپنے دونوں ہاتھوں کو جکڑوانے کے بعد حجاج نے حکم دیا کہ کسی ستون میں لوگ اس کو باندھ دیں۔"

یہی کیا گیا کہ اس حال میں کہتے ہیں کہ بڑبڑاتا تھا

"اے اللہ کسی ایسے شخص کو مجھ پر مسلط کر جو مجھ پر رحم نہ کرے"۔

لوگوں نے یہ بھی سُنا کہ اسی حال میں یہ الفاظ بھی اس کی زبان سے نکل رہے ہیں۔

"خدایا! تجھ سے ایک مدت ہوئی یہ عرض کرتا چلا آرہا ہوں کہ میری موت ولید کی موت سے پہلے آئے"۔ صد ۹۶

حجاج کا خیال تھا اور غالباً غلط خیال نہ تھا کہ ولید کے بعد اس کا انجام اچھا نہیں ہو اس کا ظلم اس کو چبا جائے گا۔ اتفاق کی بات کہ ولید اس بیماری سے تو شفا پا گیا، خالد کی بھی جان میں جان آگئی ہوگی اور حجاج تو اتنا خوش ہوا کہ شاید اسی خوشی میں چند مہینوں بعد اس کی جان نکل گئی، ولید کی صحت اور حجاج کی موت نے خالد کے سامنے پھر عروج و ارتقاء کے خواب کو زندہ کر دیا، یہ بے جا توقع نہ تھی کہ حجاج کی جگہ وہی اس کا جانشین بنایا جائے گا، مگر حجاج نے اپنی مرضی سے اپنی جگہ پر بھی اور اپنے علاقہ کے ہر مرکزی مقام پر لوگوں کو مرنے سے پہلے نامزد کر دیا تھا، لکھا ہو کہ ولید نے اپنے اس وفادار خادم کا اتنا احترام کیا کہ

"جن جن لوگوں کو جس جگہ پر بھی حجاج نامزد کر کے مرا تھا، سب ہی کو ان ہی جگہوں پر اس نے بحال رکھا"۔ (طبری صد ۹۶ ج ۵)

پھر حجاج کی موت کے چند ہی مہینوں بعد خود مخدوم (ولید) بھی اپنے خادم کے ساتھ جا ملا، یعنی مرگیا، ولید کے بعد مروانی گدی پر سلیمان اور سلیمان کے بعد حضرت عمر بن عبدالعزیز جلوہ افروز ہوئے، خالد جیسے سیاسی بازی گر کی عمر بن عبدالعزیز کی حکومت میں بھلا کیا گنجائش نکل سکتی تھی۔ سلیمان تک اس کو اپنے عہد حکومت میں برداشت نہ کر سکا اور صلہ کی جگہ یہ بلا اس کے سر پر آئی کہ اپنے تخت نشین ہونے کے چند ہی دن بعد دوسروں کے ساتھ مکہ کی گورنری سے بھی سلیمان نے خالد کو معزول کر دیا، ۹۶ھ ہجری میں سلیمان خلیفہ مقرر ہوا، اور اسی سن میں خالد بھی حکومت کی بساط سے ہٹا دیا گیا اور اس طرح ہٹا کہ تقریباً بارہ سال کی مدت گویا ایک قرن تک پھر اس کا شمار نہ حکومت کے قبیل میں تھا اور نہ دبیر میں۔ اور ہوتا کیسے، سلیمان کی وفات کے بعد اس سے بھی زیادہ ناموافق زمانہ خالد جیسے لوگوں کے لیے بقیۃ خلفاء الراشدین سیدنا عمر بن عبدالعزیز رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا تھا، ان کے زمانہ میں وہ زندہ ہی کیسے رہا، اسی پر حیرت ہوتی ہو۔

(باقی صفحہ (۵۶) پر ملاحظہ ہو)

تاج العارفین

شیخ تاج الدین سنبھلیؒ

(از مولانا نسیم احمد، فریدی فاروقی امروہی)

تذکرۂ باقی کے بعد اب میں حضرت خواجہ باقی باللہؒ کے خلفا کا ذکر کروں گا ــــ چاہیے تو یہ تھا کہ سب سے پہلے حضرت مجدد الف ثانی کا ذکر خیر کرتا لیکن چونکہ اُن کے حالات میں مستقل کتابیں اور مبسوط تذکرے موجود ہیں اور خود الفرقان کا مجدد الف ثانی نمبر بہترین مضامین و نفیس ترین مقالات کو اپنے دامن صفحات پر لے کر شائع ہو چکا ہے جس نے اہل نظر سے خراج تحسین وصول کیا اور اہل فکر کے لئے سرمایۂ تحقیق بہم پہونچایا ــــ اس لئے اس موقع پر میں نے اُن کے سوانح پر کچھ نہیں لکھا ہاں اگر توفیق ہوئی تو انشاء اللہ مکتوبات کی روشنی میں کوئی مقالہ مرتب کروں گا۔

فی الحال حسب ذیل تین خلفاء کا تذکرہ لکھنا ہے۔

(۱) شیخ تاج الدین سنبھلیؒ (۲) خواجہ حسام الدینؒ

(۳) شیخ الہ دادؒ

آیئے ــ شیخ تاج الدین سنبھلیؒ کے حالات آپ کو سنائیں، سب سے پہلے اس عظیم شخصیت کے متعلق حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ سے دریافت کر لیں ــ لیجئے وہ فرماتے ہیں

شیخ تاج سنبھلی کہ اول خلفاء حضرت باقی بودند
و آخر بمکہ اقامت اختیار کردہ بہا نجا مدفون
شدند و ایں فقیر از متاخرین مشائخ اہل ہند
ہیچ کس ندید کہ اہل مکہ زیادہ از شیخ تاج معتقد

شیخ تاج الدین سنبھلی حضرت خواجہ باقی باللہؒ
کے پہلے خلیفہ تھے اور وہ آخر میں مکہ معظمہ میں
مقیم ہو گئے تھے اور وہیں سپرد خاک ہوئے
فقیر نے اہل مکہ کو متاخرین مشائخ ہند میں سے

ادباشند و کرامات وے روایت کنند"۔ (منقول از رود کوثر مولفہ شیخ محمد اکرام ایم اے)

کسی کا اتنا معتقد نہیں پایا جتنا کہ وہ شیخ تاج الدین رح کے معتقد ہیں، مکہ والے ان کی کثرت سے کرامات بیان کرتے ہیں۔

ایک سند میں شیخ تاج الدین رح کا نام دیکھ کر کسی صاحب نے حضرت شاہ صاحب سے سوال کیا کہ یہ کون بزرگ ہیں اِن کا تعارف کرائیے ——— حضرت رحمۃ اللہ علیہ نے جواب میں جو کچھ ارقام فرمایا اُس کا اردو ترجمہ ملاحظہ فرمایئے:۔

"شیخ تاج الدین رح سنبھلی الوطن اور عثمانی النسب ہیں، شیخ احمد سرہندی رح کے پیر بھائی اور خواجہ باقی اللہ رح کے خلفاء میں سے ہیں ——— میں نے اذکار نقشبندیہ جو شیخ علیہ الرحمہ کے تصنیف شدہ ہیں اپنے والد ماجد سے پڑھے ہیں، فقیر کے والد بزرگوار نے ان کو خواجہ خرد رح سے نقل کیا ہے اور خواجہ خُرد رح نے براہ راست شیخ تاج الدین رح سے ——— شیخ تاج الدین رح خواجہ باقی باللہ رح کی وصال کے بعد مکہ معظمہ چلے گئے اور وہیں متوطن ہو گئے تھے ——— اہل مکہ نے اُن سے فیض حاصل کیا اور بہت سی کرامات دیکھیں۔ سلطان روم نے غائبانہ آپ سے حسن عقیدت کا اظہار کیا ——— میں اہلِ مکہ سے آپ کی کرامات سنا کرتا تھا۔ آپ ۱۰۵۰ھ[ا] میں رحمت حق سے پیوست ہوئے ——— اور مکہ میں قعیقعان پہاڑ کے پاس مدفون ہوئے۔ فقیر آپ کی قبر کی زیارت سے مشرف ہوا ہے"۔

(مکتوبات فارسی شاہ ولی اللہ دہلوی، شائع کردہ کتب خانہ نذیریہ دہلی)

الانتباہ میں فرماتے ہیں۔

کاتب حروف گوید کہ شیخ تاج الدین سنبھلی خلیفہ حضرت خواجہ محمد باقی درباب اشتغال نقشبندیہ رسالہ دارند مختصر ——— والد بزرگوار آں را بغایت می پسندند و آں را بخط خود از نزدیک بعض اصحاب شیخ تاج الدین انتساخ کردہ بودند

کاتب حروف کہتا ہے کہ شیخ تاج الدین سنبھلی حضرت خواجہ باقی باللہ کے خلیفہ تھے، اشتغال نقشبندیہ میں اُن کا ایک مختصر رسالہ ہے میرے والد بزرگوار (شاہ عبدالرحیم دہلوی) اس کو بہت پسند کرتے تھے اس رسالے کو اپنے قلم خاص سے بعض اصحاب شیخ

[ا] آگے چل کر معلوم ہوگا کہ یہ سن وفات صحیح نہیں ہے یا تو کتابت کی غلطی ہے جیسا کہ اس مجموعہ مکتوبات میں بے شمار کتابتی غلطیاں متن اور ترجمے میں موجود ہیں اور متن کے اغلاط کو درست کئے بغیر ترجمہ کی بنیاد بھی انھیں اغلاط پر رکھ دی ہے، یا خود حضرت شاہ صاحب رح کو صحیح تاریخ دستیاب نہ ہو سکی ہوگی۔

وطالبان را بہمان اسلوب ارشادمی نمودند
ایں فقیر آں را پیش حضرت ایشاں بخشاو
درایۂ خواندہ است (ص ۳۲)

تاج الدینؒ مُرسے کرنقل کیا تھا اور اپنے
مریدوں کی اسی رسالہ کے مطابق رہنمائی
فرمایا کرتے تھے، اس فقیر نے اس رسالہ کو اپنے
والد بزرگوار سے خوب اچھی طرح بخشاو درایۂ پڑھا ہے

اُس کے بعد یہ پورا رسالہ الانتباہ فی سلاسل اولیاء اللہ میں من وعن درج کر دیا ہے، اس طرح حضرت شاہ صاحب کی کتاب کے ساتھ ساتھ یہ رسالہ بھی محفوظ ہو گیا۔

اسی انتباہ میں ایک جگہ لکھتے ہیں:-

والشیخ عبداللہ البصری لبس الخرقۃ عن
یدالشیخ عبداللہ باقیشر المکی عن الشیخ
تاج الدین السنبھلی نزیل مکہ عن خواجہ
محمد باقی بسندہ المذکور (ص ۲۹)

شیخ عبداللہ بصری نے خرقہ پہنا شیخ عبداللہ
باقیشر مکی کے ہاتھ سے اُن کو خرقہ پہنایا
تاج الدین سنبھلی نزیل مکہ نے اُن کو خواجہ
باقیؒ نے الخ

شیخ تاج الدین سنبھلی کے وطن اول سنبھل پر حضرت شاہ صاحب کا یہ تشریحی نوٹ بھی انتباہ میں موجود ہے

سنبھل بہائے ہندیہ کہ اشمام ہا دارد بلدہ ایست
درار نہر جمنا و گنگا، نزدیک جبال[1] شرقی
دار الخلافہ دہلی۔ (ص ۳۲)

سنبھل بائے ہندیہ سے جو کہ ہا کا اشمام رکھتی
ہے ایک شہر ہے گنگا جمنا کے اس طرف قریب
جبال شرقی دار الخلافہ دہلی کے۔"

شیخ تاج الدین سنبھلی کے متعلق مشہور علامہ زماں سید مرتضیٰ بلگرامی ثم زبیدی شارح قاموس کے جنکی عمر کا بیشتر حصہ یمن، حجاز اور مصر میں گذرا ہے، چند جملے بھی سن لیجئے، ان جملوں سے بھی آپ کو شیخ سنبھلی کی شخصیت کا کچھ اندازہ ہو جائے گا۔ سنیئے وہ نفحۃ القدوسیہ میں فرماتے ہیں:-

"شیخ تاج الدینؒ نے بصرہ، یمن، احسا، نجد اور خود حجاز میں طریقۂ نقشبندیہ کو پھیلایا اور اُن کے مریدوں کی ایک بڑی تعداد تھی۔" (منقول از رود کوثر ص ۴۲۵)

حضرت مجدد الف ثانیؒ کا مکتوب گرامی بنام شیخ تاج الدینؒ

مکتوبات جلد اول میں حضرت مجدد صاحبؒ کا ایک مکتوب

[1] میرے خیال میں یہاں کاتب نے تصحیف کر دی ہے، ممکن ہے جانب کو جبال کر دیا ہو ورنہ سنبھل کا جبال سے کوئی تعلق نہیں۔

مبارک آپ کے نام ہے جی چاہتا ہے کہ اس مکتوب کی چند تمہیدی سطریں آپ حضرات کے سامنے پیش کروں جن میں ایک خاص ادبی رنگ اور خلوص ومحبت کی شان نمایاں ہے۔ ان چند سطروں سے بھی شیخ تاج العارفین کی فضیلت وعظمت کا پتہ چل رہا ہے، غالباً یہ مکتوب اُس وقت لکھا گیا ہے جب شیخ رحمۃ اللہ علیہ سفر شام وحجاز کر کے ہندوستان آنے والے ہیں۔ دیکھئے کس والہانہ انداز میں اپنے قابل احترام پیر بھائی کو تحریر فرماتے ہیں۔

الحمد للہ وسلام علی عبادہ الذین اصطفیٰ	بعد حمد وصلوٰۃ کے واضح ہو آپکے قدوم مسرت لزوم
خبر قدوم مسرت لزوم محبان مشتاق را فرحت	کی خبر نے دوستوں کو راحت دل بڑی مقدار میں
فراواں رسانید، للہ سبحانہ الحمد والمنۃ علیٰ ذالک	بہم پہنچائی اس احسان پر اللہ کا لاکھ لاکھ شکر ادا کرتا ہوں
انصاف بدہ اے فلک مینا فام	اے آسمان ذرا انصاف سے کہنا تیرا خورشید
تازیں دو کدام خوب تر کرد خرام	جہاں تاب مشرق سے نکلتے وقت زیادہ خوش خرام
خورشید جہاں تاب تو از جانب شرق	نظر آتا ہے یا میرا جہاں میں گھومنے والا چاند شام
یا ماہ جہاں گرد من از جانب شام	کے علاقہ سے آتا ہوا اچھا معلوم ہوتا ہے —
چوں قدم رنجہ فرمودہ اند زود تر تشریف آرند	جب آپ تشریف لارہے ہیں تو بہت جلد تشریف
کہ مشتاقاں زہر بار انتظار اند و آرزوے	لائیے مشتاقوں کی آنکھیں آپ کی راہ تک رہی ہیں
استماع اخبار بیت اللہ دارند، الخ	اور احباب بیت اللہ کا ذکر سننے کے آرزو مند ہیں

زبدۃ المقامات میں شیخ رحمہ کے متعلق مولانا محمد ہاشم کشمی رحہ نے جو ارقام فرمایا ہے اُس کا اقتباس یہ ہے:۔

"شیخ تاج الدینؒ دیار ہند کے بزرگ زادوں میں سے اور حضرت خواجہؒ کے اجل خلفاء میں سے ہیں یہ پہلے حضرت شیخ الہ بخش گڈھ مکتیشری سے بیعت تھے، شیخ گڈھ مکتیشری ان پر بڑی عنایت فرماتے تھے اُن کے وصال کے بعد باوجودیکہ آپ اُن کے خلیفۂ مجاز اور جانشیں تھے اپنے آپ کو حضرت خواجہؒ کے حوالہ کر دیا اور اُن کی صحبت اختیار کی، حضرت خواجہؒ کو آپ کی یہ طلب یہ تواضع اور یہ ادا بڑی پسند آئی اور آپ کو ذرہ کرم سے نوازا، آپ کو اپنا "جلیس خلوت خاص" اور "انیس محفل اختصاص" بنالیا۔ کہتے ہیں کہ حضرت خواجہؒ کے مریدوں میں طول صحبت کے لحاظ سے آپ سے بڑھ کر کوئی نہ تھا حضرت خواجہ سے "استفسار احوال" اور "پرسش اسرار" کی آپ ہی کو کچھ جرأت ہوتی تھی۔

(مولانا کشمی فرماتے ہیں) میں نے شیخ تاج الدین کی زبانی سنا ہے وہ کہتے تھے کہ حضرت خواجہؒ جب مجھے اجازت دینے پر مامور ہوئے تو اُن کے دل میں یہ خیال آیا کہ شیخ تاج الدین بھی اگر خواب میں یہ دیکھ لے کہ اکابر نقشبندیہ میں سے کوئی اُس کے حق میں اجازت کا اشارہ کرتا ہے تو اچھا ہو، چنانچہ میں نے خواب میں دیکھا کہ میں خطۂ بخارا میں حضرت عزیزان خواجہ رامیتنی قدس سرہٗ کی خدمت میں حاضر ہوں، انھوں نے اپنی کلاہ مبارک میرے سر پر رکھی اور بیحد عنایات فرمائیں۔۔۔ جب حضرت خواجہ کے سامنے میں نے یہ خواب بیان کیا تو اُس کو سن کر آپ نے تبسم فرمایا اور جو کچھ اُن کے دل میں بات آئی تھی اُس کا ذکر اس وقت فرمایا ۔۔۔۔۔۔ جب حضرت خواجہ نے اجازت تلقین مرحمت فرمادی تو شیخ تاج الدین کی نظر میں ایک خاص تاثیر نمودار ہوئی جس کسی کو طریقے کی تعلیم دیتے تھے، اس پر جذبات کا غلبہ ہو جاتا تھا، اور فوراً "احوال" ظہور پذیر ہو جاتے تھے"

اجازت ملنے پر اپنے وطن سنبھل کو روانہ ہو گئے، جب وہاں پہونچ کر ارشاد و ہدایت کی طرف متوجہ ہوئے تو وہاں بعض حاسدوں نے ان پر زبانِ ملامت دراز کی۔ آشنا و بیگانہ کی ملامتوں سے تنگ آکر شیخ نے اپنے پیر و مرشد کی خدمت میں عریضہ لکھا۔۔ اس کے جواب میں ایک مفصل گرامی نامہ ارقام فرمایا گیا (اس کے چند جملے یہ ہیں)

اہل سنبھل کے طعن و تشنیع کا خیال نہ کرو، اُن بے چاروں پر رحم کھاؤ کیونکہ وہ لوگ (حاسدین) استقامت عقل سے ہٹ گئے ہیں ۔۔۔۔۔۔ الحمد للہ۔ کہ ملامت سننا اولیا کا خاص حصہ ہے میں خود اس معاملہ میں ایک مستقل "نظریہ" رکھتا ہوں وہ یہ کہ جب کوئی ملامت کرتا ہے تو اپنے اندر غور کرتا ہوں، اُس وقت مجھے اپنی ایک نہ ایک "بدصفتی" ضرور نظر آتی ہے اور اس ملامت کو اپنے حق میں موعظت تصور کرتا ہوں ۔۔۔۔۔۔ تم بتاؤ تو سہی کہ اہل سنبھل کی ملامت سے تمہارا کیا بگڑ جائے گا، کیا تمہاری عبادت قبول نہ ہوگی؟ یا تمہاری صفائی قلب برطرف ہو جائے گی؟ یا درگاہ خداوندی سے تم کو رد کر دیا جائے گا۔ ع

معشوق تمام دبر سر عالم خاک

والسلام

حضرت خواجہ نے ایک مکتوب گرامی (بنام شیخ) کو اس شعر سے شروع فرمایا ہے۔

کارے مکن کہ وحشت رشکم فزوں شود　　　صیدے چوں من ز دام دنائت بروں شود

جب حضرت خواجہ دار بقا کو سدھار گئے تو شیخ تاج الدین نے اپنے دل میں سیاحت کی ٹھان لی بلاد ہندوکشمیر کی سیر کر کے حرمین شریفین کی زیارت سے مشرف ہوئے، حرمین کے باشندوں کو شیخ سے ایک خاص ربط ہو گیا۔ شیخ محمد علان جو کہ اکابر حرم میں سے تھے اور علم و عمل تقویٰ در ریاضت میں یکتا و فرد تھے ـــــ آپ سے فیضیاب ہوئے، شیخ محمد آپ کے آنے سے پہلے نقشبندیہ سلسلے سے خاص لگاؤ رکھتے تھے اور انھوں نے کتاب رشحات کا عربی زبان میں ترجمہ بھی کیا تھا تاکہ اہل عرب اکابر نقشبندیہ کے حسن اطوار، لطافت اقوال، اور علو احوال سے واقف و مطلع ہو جائیں۔ اور خود اس بات کے خواہاں تھے کہ کوئی بزرگ اس سلسلہ کا حرم میں آجائے تو وہ اس سے اس طریقہ کو باقاعدہ حاصل کریں۔ جب شیخ تاج الدین وہاں پہونچے تو یہ اخلاص تمام کے ساتھ شیخ کی خدمت میں حاضر ہوئے ہیں نے شیخ تاج الدین کی زبانی سنا وہ یہ لطیفہ بیان کرتے تھے کہ بلاد عرب کے لوگ مجھ کو بھی شیخ محمد علان کہنے لگے ہیں۔

شیخ محمد ۱۰۳۱ھ میں راہی بقا ہوئے۔

شیخ تاج الدین دو ایک مرتبہ دیار حجاز سے ہندوستان آئے اور پھر ان بلاد شریفہ میں واپس چلے گئے ـــــ اخیر مرتبہ ولایت لہسا و بصرہ میں گئے وہاں جم غفیر ان کے دامن سے وابستہ ہوا ـــــ وہاں کا حاکم ان کا معتقد ہو گیا، بصرہ میں بزم ارباب ارادت ہنوز گرم تھی کہ قافلہ حرمین نے نقارہ کوچ بجایا ـــــ اور شیخ نے فوراً مشیخت و تعلیم طریقہ کو یک طرف رکھ کر وہیں سے لباس احرام زیب تن کیا، ناقہ پر سوار ہو کر اور ایک دو خادم ہمراہ لے کر فقر و فاقہ کے ساتھ متوجہ بیت الحرام و روضہ سید الانام ہو گئے ـــــ میرے ایک دوست صالح نامی نے جو اسم با مسمٰی ہیں مجھ سے بیان کیا کہ میں نے ۱۰۳۷ھ کے حج میں عرفات کے میدان میں شیخ تاج الدین کی زیارت کی ہے اُن کا یہ حال تھا کہ زیادہ عرصہ کا ہو جانے کی وجہ سے ان کا احرام نہایت میلا ہو گیا تھا چہرہ غبار آلودہ تھا۔ بالوں میں ژولیدگی نمودار تھی۔ سفید داڑھی ـ آنکھیں سفر کی مشقت بلکہ نشۂ بادۂ معرفت سے سرشار ہو کر سُرخ ہو رہی تھیں۔ میں اُن کو دیکھ کر بہت متاثر ہوا اور میرا اعتقاد اُن کی جانب زیادہ ہو گیا ـــــ صالح کہتے ہیں کہ مجھ سے شیخ نے فرمایا کہ میں نے سالہا سال متعدد شہروں اور بیابانوں کی خاک چھانی ہے، ماو شما کو آزمایا ہے ـــــ اب تو میں اپنے مالک

کے گھر کی جاروب کشی کروں گا، تا آنکہ یہیں مرکر خاک ہو جاؤں۔ ع

خوش آں سرے کہ برآں آستانہ خاک شود

مولانا محمد ہاشم کشمیؒ آخر میں لکھتے ہیں:۔

خداوند کریم اس یادگار باقی کو تا دیر باقی رکھے ـــــ شیخؒ کے اطوار و اقوال ارباب ذوق کے اندر بہت سے اچھے اچھے رسائل ہیں۔ آپ نے اہل عرب کو فائدہ پہونچانے کی غرض سے بعض رسائل خواجگان نقشبند کو فارسی سے عربی میں ترجمہ کر دیا ہے ـــــ بعض علماء ظاہر سے جب آپ نے یہ سنا کہ "پیری مریدی" بدعت ہے تو ایک رسالہ لکھا جس میں اس کا سنت ہونا ثابت کیا ہے۔

شیخ تاج الدین سنبھلیؒ کے حالات اسراریہ سے

سید کمال سنبھلیؒ نے جو کہ شیخ کے ہم وطن ہیں اسراریہ میں شیخ کا جو مختصر حال لکھا ہے وہ یہ ہے:۔

میرے شیخ (خواجہ خردؒ) نے فرمایا کہ شیخ تاج الدین باوجودیکہ شیخ الہ بخشؒ گڈھ مکتیشری کی خدمت میں سلسلۂ عشقیہ کا سلوک طے کر چکے تھے ـــــ اپنے پیر کے انتقال کے بعد اپنی بلندیٔ استعداد اور خواجہ حسام الدینؒ کی ترغیب سے حضرت خواجہ کی صحبت میں آگئے اور تھوڑی مدت میں مراتب عالیہ اور الطاف غیر متناہیہ سے نوازے گئے، حضرت خواجہؒ سے اتحاد کے باعث تمام اصحاب خواجہؒ اُن پر غبطہ کرتے تھے، وصال حضرت خواجہؒ کے چند سال بعد متوجہ حرمین شریفین ہو گئے اور وہاں مدتوں رہے ـــــ وہاں کثیر التعداد افراد اُن کی صحبت میں رہ کر نسبت نقشبندیہ سے مستفیض ہوئے ـــــ (دراصل) وہ اپنے وقت کے شیخ حرم تھے ـــــ کبار صوفیا میں سے تھے اور صاحب تصانیف عالیہ تھے۔"

میرے پیر و مرشد نے یہ بھی فرمایا کہ شیخ تاج الدینؒ نے فرمایا ہے کہ "حقیقت کعبہ" "حقیقت انسانیت" سے اونچی ہے اور "حقیقت محمدیہ" "حقیقت کعبہ" سے بھی بلند ہے۔

شیخ تاج الدینؒ نے بدھ کے دن مغرب سے پہلے ۱۳ر جمادی الاولیٰ ۱۰۵۰ھ کو انتقال فرمایا اور جمعرات کے دن ۱۴ر جمادی الاولیٰ کو مکہ معظمہ میں حرم شریف کے نزدیک اُس رباط میں جس کو خود بنایا تھا مدفون ہوئے ـــــ یزار و یتبرک بہ ـــــ (اسراریہ قلمی)

نزہتہ الخواطر جلد خامس قلمی سے

عالی جناب حکیم سید عبدالحی صاحب رائے بریلوی ثم لکھنوی

نے اپنی معرکۃ الآرا تالیف نزہتہ الخواطر[1] کی پانچویں جلد میں (جس میں گیارھویں صدی ہجری کے اعیان واکابر ہند کا تذکرہ ہے) حضرت شیخ تاج الدین سنبھلی ؒ کا بہت تلاش سے مکمل تذکرہ لکھا ہے، اس سے بہت سی باتیں معلوم ہوئیں جو دوسری جگہ سے معلوم نہ ہو سکی تھیں۔

ذیل میں اُس تذکرہ کا ہو بہو ترجمہ پیش کرتا ہوں۔

الشیخ العالم العارف تاج الدین بن زکریا بن سلطان العثمانی النقشبندی الحنفی السنبھلی الولی المشہور، آپ شہر سنبھل میں پیدا ہوئے وہیں آپ کی نشو ونما ہوئی۔ وہیں علم حاصل کیا، بعدہٗ کسی شیخ طریقت کی تلاش میں بہت سے شہروں کی خاک چھانی۔ جب اجمیر پہونچے وہاں حضرت خواجہ معین الدین حسن اجمیری ؒ کی روحانیت سے نفی واثبات کا طریقہ اُس کیفیت مخصوصہ کے ساتھ جو سلسلہ چشتیہ میں رائج ہے اور جس کو "پاس انفاس" کہتے ہیں ـــــ سیکھا ـــــ وہاں سے حکم ہوا کہ ناگور پہونچ کر ذکر میں مشغول رہو ـــــ ناگور میں شیخ حمید الدین صوفی ناگوری کی قبر مبارک ہے ـــــ چنانچہ ناگور پہونچے اور مدت تک وہاں اقامت گزیں رہ کر ذکر میں مشغول رہے ـــــ اس کے بعد پھر طلب شیخ میں نکل کھڑے ہوئے۔ پہاڑوں، جنگلوں، وادیوں میں گھومتے رہے ـــــ بالآخر شیخ الہ بخش شطاری گڈھ مکتیشری کی خدمت میں پہونچے، شیخ موصوف بڑے تپاک سے اُن سے ملے اور یوں فرمایا ـــــ میں تمہارا منتظر تھا۔ حضرت گڈھ مکتیشری کا یہ دستور تھا کہ اُس وقت تک کسی کو طریقہ کی تعلیم نہیں دیتے تھے جب تک اُس کو خدمات وریاضات شاقہ سے آزمانہ لیتے تھے ـــــ وہ ایسی خدمت لیتے تھے جس سے نفس کو شکستگی اور تزکیہ حاصل ہو جائے ـــــ چنانچہ ان کے سپرد یہ کام کیا کہ باورچی خانہ کے لئے پانی بھرا کریں ـــــ انھوں نے اپنی طاقت سے زیادہ اس کام کو انجام دیا، جب اس طرح تین مہینے گذر گئے تو شیخ موصوف نے فرمایا کہ اب تمہارا کام پورا ہو گیا۔ پھر ان کو طریقہ عشقیہ (شطاریہ) کی تلقین کی۔ یہ اس طریقہ کے اشغال میں مشغول رہے اور برابر مرشد کے قدموں میں پڑے رہے، یہاں تک کہ کمال وتکمیل کے درجہ کو پہونچ گئے ـــــ پھر شیخ نے طریقہ عشقیہ وقادریہ وچشتیہ ومداریہ کی اجازت مرحمت

---

[1] حکیم سید عبدالحی صاحب ؒ لکھنوی نے اعیان واکابر ہند کی مبسوط ومکمل تاریخ عربی زبان میں لکھی ہو، نزہتہ الخواطر اس کا نام ہے، ہر ہر صدی کے متعدد مقامات کے علما ومشائخ کا تذکرہ اس میں موجود ہے۔ اس کی شاید دو تین جلدیں اب تک شائع ہوئی ہیں باقی کئی جلدیں جن میں ہزارہا اکابر کے حالات ہیں ابھی زیور طبع سے مزین نہیں ہوئیں، حکیم صاحب مرحوم کو تاریخ وجغرافیہ، سیر وتذکرہ، علم انساب وعلم رجال میں جو کمال حاصل تھا اُس کا اندازہ مورخین عالم اُس وقت لگا سکیں گے جب یہ علمی وتاریخی انسائیکلوپیڈیا تمامہ شائع ہو کر سامنے آئے گی خدا کرے یہ علمی تحفہ جلد شائع ہو جائے میں مولانا سید ابوالحسن علی ندوی مدظلہ کا ممنون ہوں کہ انھوں نے اپنے والد ماجد کے قلمی ✱

✱ نسخہ سے نقل کر کے یہ حالات ـــــ محمد عنایت فرمائے۔

فرمادی"...... طریقۂ کبرویہ میں روحانیت شیخ نجم الدین کبریٰ سے اجازت حاصل ہوئی۔

آپ نے دس سال تک اپنے شیخ کی خدمت کی۔

جب حضرت خواجہ باقی باللہ نقشبندی لاہور آئے تو حضرت خواجہ نے آپ کو ایک مکتوب لکھا۔ اس وقت آپ سنبھل میں تھے، جب مکتوب گرامی اُن کو ملا فوراً حضرت خواجہ کی خدمت میں پہونچنے کا قصد کیا جب وہاں پہونچے تو حضرت خواجہ نے آپ کو اکابر نقشبندیہ کا سلوک طے کرایا۔ تین دن میں اس سلسلہ کا تمام سلوک آپ نے طے کر لیا۔ پھر حضرت خواجہ نے ان کو مرید کرنے کی اجازت مرحمت فرمادی۔ آپ وہ خوش نصیب ہیں جن کو سب سے پہلے حضرت خواجہؒ نے اجازت عنایت فرمائی ہے، آپ نے دس سال تک حضرت خواجہ کی صحبت اٹھائی۔

حضرت خواجہؒ و شیخؒ ایک جان دو قالب تھے ـــ کمال کی بات یہ ہے کہ یہ پتہ نہ چلتا تھا کہ ان دونوں میں کون محب ہے اور کون محبوب، ایک پیالہ میں دونوں کھاتے تھے ایک تخت پر دونوں سوتے تھے۔

جب حضرت خواجہ کی وفات ہوگئی تو یہ بہت غمگین ہوئے اور سیاحت کی طرف مائل ہوگئے۔ بلاد ہند عراق اور عرب کی سیاحت کی آخر میں مکہ معظمہ میں اقامت گزیں ہوگئے۔

ابن فضل اللہ محبی نے خلاصۃ الاثر میں آپ کے متعلق یہ لکھا ہے کہ

"یہ طریقہ نقشبندیہ کے شیخ کامل تھے ــ پُر رعب تھے ــ مریدوں کی اچھی طرح تربیت کرتے تھے وصول الی اللہ کی رہنمائی میں ماہر تھے۔ اپنے مریدوں اور ملنے والوں سے خندہ پیشانی سے پیش آتے تھے۔

اُستاد احمد ابوالوفا، اور اُن کا لڑکا اور شیخ محمد مرزا بن محمد المعروف السروجی الدمشقی اور امیر یحیٰی بن علی باشا وغیرہم نے آپ کی صحبت اٹھائی ـــ بہت سی کتابیں آپ نے تالیف کیں جن میں چند یہ ہیں۔

(۱) عارف جامی کی کتاب نفحات الانس کا عربی ترجمہ (۲) رشحات کا عربی ترجمہ

(۳) رسالہ طریقہ نقشبندیہ۔ اس میں حضرت خواجہ عبدالخالق غجدوانیؒ کے نکات مشہورہ کو جمع کرکے ان کی بہترین شرح لکھی ہے۔ (۴) الصراط المستقیم

(۵) نفحات الالٰہیہ (۶) جامع الفوائد

آپ کی سوانح عمری آپ کے تلمیذ سید محمود[۵] بن اشرف الحسینیؒ نے اپنے ایک رسالہ میں لکھی ہے جس کا

---

[۵] سید محمود بن اشرف دانشمند حسینی ام وہہ کے رہنے والے تھے شیخ تاج الدین سنبھلیؒ کے مرید اور داماد تھے۔ جامع علوم و فنون اور مقتدائے وقت تھے ارشاد و ہدایت کے ساتھ ساتھ فتویٰ نویسی بھی کرتے تھے ان کے دونوں صاحبزادے حاجی سید محمد اور سید عصمت اللہ (جو کہ تاج العارفین کے نواسے تھے) بھی صاحب تقویٰ اور صاحب نسبت بزرگ تھے۔ ان باپ بیٹوں کے حالات، اسرار یہ، تذکرۃ الکرام، تواریخ واسطیہ اور شجرات طیبات مولفہ فروغ سیتاپوری میں درج ہیں۔

نام "تحفۃ السالکین فی ذکر تاج العارفین" ہے "
محبی نے تحفۃ السالکین سے نقل کرکے آپ کی بہت سی کرامات بھی لکھی ہیں جن کا ذکر فائدے سے خالی نہیں ہے "
شیخ احمد نخلی مکیؒ نے اپنے ایک رسالہ میں لکھا ہے۔
یہ شیخ تاج الدینؒ ولی خدا اور عارف باصفا تھے، مکہ مکرمہ میں ۱۰۴۴ھ میں آگئے تھے اور یہاں مدت تک قیام کرکے وفات پائی "
شیخ احمد نخلیؒ کی اس عبارت کو حضرت شاہ ولی اللہ الدہلوی نے اپنے استاذ حدیث شیخ ابوطاہر بن ابراہیم کردی مدنی سے نقل کیا ہے۔
مسترشدین میں کچھ کا ذکر کیا جا چکا ہے ان کے علاوہ ان حضرات نے بھی آپ سے اخذ فیض کیا ہے :۔
شیخ عبدالباقی بن زین الزجاجی الزبیدیؒ ـــــ شیخ عبداللہ ابن الشیخ عبدالرحمٰن الحضرمی العیدروسیؒ
شیخ محمد علاّن ـــــ شیخ ابراہیم بن حسن الحنفی الاحسائیؒ ـــــ شیخ ابوبکر بن سعید بن ابی بکر الحضرمی ـــــ
شیخ عبیداللہ بن محمد باقی الدہلوی (المعروف بخواجہ خردؒ) سید محمود بن اشرف الحسینی الامروہی
ان کے علاوہ بھی بہت سوں نے آپ سے فیض حاصل کیا ہے، آپ کے مصنفات میں علاوہ اُن کتابوں کے جن کا ذکر ہوا ایک رسالہ ہے جس میں رنگ برنگ کھانوں کا ذکر اور ان کے پکانے کی ترکیب درج ہے۔ ایک اور رسالہ ہے جس میں درختوں کے نصب کرنے کا طریقہ ہے، ایک اور رسالہ ہے جس میں طبی معلومات ہیں، ان رسالوں کا ذکر سید محمود بن اشرف الحسینی الامروہی نے تحفۃ السالکین میں کیا ہے ـــــ آپ کے کلمات طیبات میں سے یہ چند جملے بھی ہیں جو آپ نے رسالہ طریقہ نقشبندیہ کے شروع میں تحریر کئے ہیں۔
"جان تو اللہ تجھے توفیق نیک دے کہ اکابر نقشبندیہ قدس اللہ اسرارہم کے معتقدات وہی ہیں جو اہل سنت وجماعت کے ہیں اور ان کا طریقہ دوام عبودیت ہے جس کے بغیر ادائے عبادات مقصود نہیں۔ دوام حضور مع الحق سبحانہ اسی کو کہتے ہیں اور یہ سعادت عظیمہ بغیر تصرف جذبۂ الٰہیہ حاصل نہیں ہوسکتی اور جذبۂ الٰہیہ کے حصول کا ذریعہ صحبت شیخ کامل سے بہتر اور کوئی ہو نہیں سکتا شیخ ابوعلی دقاق نے فرمایا ہے کہ وہ درخت جو خود رو ہوتا ہے اس میں اول تو پھل ہی نہیں آتے اور اگر آتے بھی ہیں تو بے مزہ ہوتے ہیں، اللہ تعالیٰ کی یہ سنت جاریہ ہے کہ کوئی نہ کوئی سبب موجود ہو جس طرح ظاہری توالد و تناسل بغیر ماں باپ کے حاصل نہیں ہوسکتا

تعارف و تبصرہ

ہندوستان کی پہلی اسلامی تحریک از، مولانا مسعود عالم ندوی۔ (تیسرا ایڈیشن)
ناشر مکتبۂ نشأۃ ثانیہ، حیدر آباد (دکن)

ضخامت ۲۰۰ صفحات کاغذ کتابت وطباعت بہتر، قیمت دو روپے آٹھ آنے (عہ)

حضرت سید احمد شہید رحمۃ اللہ علیہ کی تحریک ہندوستان کی وہ پہلی اسلامی تحریک تھی جس نے ہندوستان کی اسلامی تاریخ پر تجدید جہاد کے یادگار نقوش چھوڑے ہیں۔ حضرت سید شہید تو ۱۲۴۶ھ میں بمقام بالاکوٹ اپنی مراد پاکر سرخ رو ہو گئے مگر اپنے پیچھے ایسے سیکڑوں جانباز چھوڑ گئے جنھوں نے اس علَم کو گرنے نہ دیا اور عرصۂ دراز تک معرکۂ کارزار کو اپنے خون سے گرم رکھا۔

خدا رحمت کند ایں عاشقان پاک طینت را

یہ کتاب معرکہ بالاکوٹ کے بعد والے اسی "عرصۂ دراز" کی تاریخ پیش کرتی ہے ___ کہ سید صاحب کے بعد تحریک کس طرح چلتی رہی، کن کن مراحل سے گزرتی رہی اور وہ "عاشقان جانباز" کون کون تھے جنھوں نے اس علم کو بلند کیے رکھا۔

سید صاحب کی شہادت کے بعد چونکہ اس تحریک کا ٹکراؤ براہ راست انگریزوں سے ہونے لگا تھا اس لیے انھوں نے ایک مجرب حربہ یہ بھی استعمال کیا کہ اس تحریک کو محمد بن عبد الوہاب نجدی کی تحریک کا چربہ مشہور کیا اور مجاہدین کو "وہابی" کے نام سے بدنام کرنا شروع کر دیا تاکہ خود مسلمان ان سے بدک جائیں ___ اسی بنا پر پیش نظر کتاب کے پہلے اور دوسرے باب میں وہابیت کی حقیقت اور ان دونوں تحریکوں کے فرق کو واضح کیا گیا ہے تاکہ اس جھوٹے پروپیگنڈہ کی اصلیت معلوم ہو جائے۔

آخری باب میں اس تحریک کی ظاہری ناکامی کے اسباب کا پتہ چلانے کی کوشش کی گئی ہے

یہ گویا اس تحریک کی خامیوں کی تنقید ہے۔ اس سلسلہ میں تقریباً وہی تمام باتیں کہی گئی ہیں جو مولانا مودودی اپنے رسالہ "تجدید و احیاء دین" میں فرما چکے ہیں

قرآن اور تعمیر سیرت از جناب ڈاکٹر میر ولی الدین صاحب ایم۔ اے، پی، ایچ، ڈی صدر شعبہ فلسفہ جامعہ عثمانیہ حیدرآباد (دکن) ناشر ندوۃ المصنفین دہلی۔

۲۲۸ صفحات، بہترین کاغذ، عمدہ طباعت۔ قیمت غیر مجلد پانچ روپے، مجلد چھ روپے۔

"ڈاکٹر صاحب موصوف ایک طرف بالغ نظر فلسفی اور عثمانیہ یونی ورسٹی کے شعبۂ فلسفہ کے صدر نشین ہیں اور دوسری طرف ایک صاحب یقین مومن اور مشکوٰۃ نبوت کے فیض یاب! انھوں نے اپنی فلسفیانہ قابلیت اور مہارتِ نفسیات کو کلام حق اور تعلیمات نبوت کی خدمت کیلئے وقف کر رکھا ہے اور اپنی زبان و قلم سے نوجوانان ملت کی سیرت قرآن کی بنیاد پر تعمیر کرنے کیلئے کوشاں رہتے ہیں ——— اور ان کے واقفین کی شہادت ہے، کہ "ان کے فیض صحبت سے بیسیوں طالب علم صبغۃ اللہ میں رنگے جا چکے ہیں"۔
اسی ایک بلند مقصد کے پیش نظر موصوف کے قلم سے وقتاً فوقتاً یہ مقالات نکلتے رہے ہے جو اس کتاب میں جمع کر دیے گیے ہیں۔ کل مقالات بیس ہیں جو اس بات کا ثبوت پیش کرتے ہیں کہ قرآن کے اصول و احکام نفسیاتی طور پر سیرت سازی کے لیے کتنے پر حکمت ہیں اور ایک کامیاب زندگی کے لیے کس درجہ کی ضمانت ہیں۔ قرآنی تعلیم عزت نفس، خود آگاہی، کمال انسانیت، صحت فکر، بے نیازی اور جرأت و بے خوفی کے وہ عناصر انسانی کردار میں سموتی ہے جن سے بڑھ کر کامیاب زندگی کی کوئی ضمانت نہیں ہو سکتی۔

نصرۃ القرآن از، مولانا عبدالحمید خاں صاحب ارشد، ناشر جناب عبدالمجید صاحب صدیقی، یونائیٹڈ مجید موٹر کمپنی بندر روڈ کراچی ملا۔ صفحات ۳۳۶ مجلد قیمت جلد عام پانچ روپے، جلد خاص چھ روپے (مع محصول ڈاک) کاغذ عمدہ، جلد مضبوط۔

"برعکس نہند نام زنگی کافور" کا مصداق، اہل قرآن نامی ایک گروہ قرآن کے نام پر قرآن کی جڑ کاٹنے پر تُلا ہوا ہے۔ تقسیم ہند نے اس کا مرکز اور اسکی فتنہ سامانیوں کی جولانگاہ پاکستان

کو بنا دیا ہے، اس کے بڑے بڑے مذہب، پرویز، اسلم جیراجپوری اور ڈاکٹر برق وغیرہ ــــ انکے مضامین اور تصانیف اتنی مضحکہ خیز ہوتی ہیں (خاص کر برق صاحب کی) کہ ان کے افکار کو اپنی موت آپ مرجانا چاہیئے مگر یورپ کی سیادت کے طفیل میں کچھ ہوا ہی ایسی چل پڑی ہے کہ دین کے خلاف کیسی ہی عقل دشمن باتیں کہیئے، داد دینے والے مل ہی جائیں گے۔

یہ لوگ حقیقی اسلام کو "دین ملا" کا نام دیتے ہیں اس لیے اسلام کا ایک نیا پیکر ڈھالنے میں مصروف ہیں جسے یہ قرآن کے سر تھوپتے ہیں، مگر قرآن لانے والے کی سنت (قولی وعملی) قدم قدم پر ان کی اس دخل در معقولات میں رکاوٹ بنتی ہے اسلیئے حدیث کی حجیت سے بھی انھیں انکار کرنا پڑا ہے اور انکار حدیث بھی ان کا ایک مستقل محاذ ہے۔ چناں چہ احادیث کی تدوین کو انھوں نے قرآن کے خلاف ایک "عجمی سازش" کا نام دیا ہے ان کے خیالات کی رو سے رسول کی حیثیت ایک پوسٹمین کی ہے جو اللہ کا مکتوب ہدایت لے کر آیا تھا اور مکتوب الیہ کو پہونچا کر چلا گیا اب اس کا سمجھنا سمجھانا یہ سب مکتوب الیہ کا کام ہے ــــ اتفاق کی بات ہے کہ یہ "لمیٹڈ کمپنی" جس قسم کا اسلام ڈھال رہی ہے کچھ اسی قسم کا اسلام پاکستان کے موجودہ اقتدار کو بھی مطلوب ہے، اسلیئے پاکستان کی سرزمین اس فتنہ کو بہت راس آرہی ہے اور وہاں یہ فتنہ پورے زوروں پر ہے۔ نصرۃ القرآن کی تصنیف کا مقصد اسی فتنہ کا سدباب ہے اور اسی جذبہ نے ایک موٹر کمپنی کے پروپرائٹر کو اس کتاب کا پبلشر بننے پر آمادہ کیا ہے ــــ اللہ تعالیٰ ہر دو حضرات کو جزائے خیر عطا فرمائے ــــ اس کتاب میں اسی گروہ کے افکار کا جائزہ لیا گیا ہے جنھیں یہ گروہ قرآن کے حقائق ومعارف کے نام پر پھیلا رہا ہے اور رسول اور حدیث رسول (صلی اللہ علیہ وسلم) کو خانہ باہر کر کے قرآن کی من مانی تشریح وتفسیر کر رہا ہے، بلکہ (موزوں ترین الفاظ میں) قرآنی آیات میں ایک دھاندلی مچا رکھی ہے۔

مصنف کے مقصد سے نہ صرف ہمیں اتفاق ہے بلکہ اُسے ہماری پوری قلبی وفکری تائید حاصل ہے اس لیے قدرتی طور پر ہماری خواہش ہے کہ اس فتنہ پر جو وار ہو ہر لحاظ سے بھرپور ہو اور اسی لیے ضروری ہے کہ ہم اپنی ان کوششوں پر تنقیدی نظر بھی ڈالیں کہ کسی لحاظ سے وہ کمزور اور غیر معیاری تو نہیں ہے۔ اس زاویہ نظر سے ہم اس تصنیف میں ایک خامی محسوس کرتے ہیں۔

ــــــــــــــــ

اسلم صاحب کا قیام ہندوستان ہی میں ہے۔

وہ یہ کہ کتاب تصنیفی معیار پر پوری نہیں اترتی۔ یعنی ایک تصنیف جس تعین موضوع، تنقیح مسائل، ترتیب مباحث، سیاق و سباق کے بدیہی اور برجستہ ربط اور ایک ایک بحث کو آخر تک جس اطمینان کے ساتھ لے کر چلنے کا تقاضہ کرتی ہے وہ اس کے اکثر حصہ میں مفقود ہے۔ ایک بے صبری یا مغلوب الغضبی کی سی کیفیت کارفرما ہے۔ اس کے علاوہ ایک دوسری بات توجہ دلانے کے قابل یہ ہے کہ کسی کیخلاف ہمارا غیظ کتنا ہی حق بجانب کیوں نہو مگر اسکی تردید میں جب ہم کچھ لکھنے بیٹھیں تو اس غیظ پر قابو رکھنا چاہیئے اور تو تڑاک کا عنوان نہ اختیار کرنا چاہیئے۔ یہ چیز تصنیف کا وقار کم کرتی ہے اور غیر جانبدار قارئین کے لیے حجاب بن سکتی ہے۔ ظاہر ہے کہ ہر قاری کے سینے میں آپ اپنا دل نہیں رکھ سکتے اور ہر دل میں اپنے جذبات نہیں ٹھونس سکتے کہ وہ اس انداز گفتگو سے گرانی نہ محسوس کرے۔

جواہر رسالت از : ابو تمکین افتخار احمد صاحب۔ ملنے کا پتہ المطبوعات ۱/۳۵۸ بہار کالونی کلیٹن روڈ، کراچی ۵ صفحات ۱۲۸ قیمت ۱۲/

کلام پاک کا سب سے زیادہ مستند شارح اور ترجمان زبان رسالت ہے۔ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم صرف رسول بمعنی قاصد نہ تھے بلکہ معلم کتاب اور مزکی بھی تھے جیسا کہ قرآن پاک میں صراحت کے ساتھ آپ کا یہ منصب بیان فرمایا گیا ہے۔ مگر امت کی سیکڑوں بدقسمتیوں میں سے ایک بدقسمتی یہ بھی ہے کہ اس ذخیرہ جواہر ہی کے بائیکاٹ کی تحریک شروع ہو گئی ہے جو اپنے اس منصب کے فرائض کی انجام دہی کے سلسلہ میں زبان رسالت سے وجود میں آیا——یہ تالیف اس تحریک کیخلاف ایک چھوٹی سی مثبت کوشش ہے جس میں بہت سی احادیث کا بعض آیات قرآنی کے ساتھ تشریحی اور تفہیمی تعلق دکھلایا گیا ہے۔ جس سے بخوبی اندازہ ہوتا ہے کہ قرآن و حدیث دو بالکل الگ الگ چیزیں نہیں ہیں بلکہ ان میں باہم متن و شرح کا سا تعلق ہے۔

کتاب اس طرح ترتیب دی گئی ہے کہ پہلے قرآن مجید کی ایک دو یا تین آیات درج کی گئی ہیں اور ان کے ذیل میں ان کے مفہوم کی تشریح و تفہیم کرنے والی متعدد احادیث مع ترجمہ اور مزید برآں جہاں ضرورت سمجھی گئی وہاں مؤلف کے قلم سے مختصر تشریحی نوٹ بھی۔ ان تشریحات کی زبان خطابی اور دلنشین ہے۔

بقیہ نگاہِ اولیں

الَّتِيْ كَانَتْ عَلَيْهِمْ ۚ فَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا بِهٖ وَعَزَّرُوْهُ وَنَصَرُوْهُ وَاتَّبَعُوا النُّوْرَ الَّذِيْٓ اُنْزِلَ مَعَهٗٓ ۙ اُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ ۝

(الاعراف ع ۱۹)

اور حلال کرے گا ان کے واسطے سب پاک چیزیں اور حرام کرے گا ناپاک چیزوں کو اور وہ بوجھ اور پھندے اُن پر سے اتار کر الگ کریگا جن میں وہ بے ہوئے اور پھنسے ہوئے ہوں گے (الحاصل) جو اس پر ایمان لائے اور اس کی رفاقت کی اور اس کی مدد کی اور اتباع کیا اس نور (ہدایت) کا جو اسکے ساتھ اتارا گیا ہو۔ بس وہی لوگ ہوں گے کامیاب اور بامراد ہونے والے۔

یہی وہ آیات ہیں جن کا خلاصہ ہم نے اوپر بیان کیا تھا، اور انھیں کے بعد متصلاً وہ آیت شروع ہو جاتی ہو جو ان سے پہلے نقل کی گئی یہ اُنیسویں رکوع کی آخری آیات ہیں اور وہ بیسویں رکوع کی پہلی آیت۔ اس کے بعد کون کہہ سکتا ہو کہ شریعت محمدیؐ کے اتباع کے بغیر نجات و فلاح کی امید رکھنا کسی دیوانے کے خواب سے زیادہ اہمیت رکھتا ہو، یہ امر و نہی اور تحلیل و تحریم شریعت ہی کے تو عناصر ہیں جنھیں نبی اُمیؐ کے لیے ثابت کرنے کے بعد کہا جا رہا ہو کہ فَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا بِهٖ ...... وَاتَّبَعُوا النُّوْرَ الَّذِيْٓ اُنْزِلَ مَعَهٗٓ اُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ ۝ جب مصدقہ اہلِ کتاب تک کو اتحاد فی الدین کافی نہیں ہو بلکہ اتباعِ شریعت بھی ضروری ہو تو پھر وہ لوگ کس شمار و قطار میں ہیں جن کا اہلِ کتاب ہونا بھی غیر مصدّق ہو۔

بات گو بالکل صاف ہو چکی ہو مگر بعض آیتیں اب بھی ایسی ہیں جن سے کسی کو شبہ پیدا ہو سکتا ہو یا مغالطہ دیا جا سکتا ہو، بہتر ہو کہ ان کو بھی صاف کر دیا جائے۔ ایسی آیات میں سے سب سے زیادہ اہم آیت سورہ آلِ عمران کے ساتویں رکوع کی یہ آیت ہو۔

قُلْ يٰٓاَهْلَ الْكِتٰبِ تَعَالَوْا اِلٰى كَلِمَةٍ سَوَاۗءٍ بَيْنَنَا وَبَيْنَكُمْ اَلَّا نَعْبُدَ اِلَّا اللّٰهَ وَلَا نُشْرِكَ بِهٖ شَـيْـــًٔـا وَّلَا يَتَّخِذَ بَعْضُنَا بَعْضًا

(اے محمدؐ، تم کہو کہ اے اہلِ کتاب آؤ ایک ایسی بات مان لو جو (فی الحقیقت) ہمارے تمھارے درمیان متفق علیہ ہو، وہ یہ کہ ہم عبادت صرف اللہ کی کریں اور کسی چیز کو بھی اس کا

اربابًا من دون اللہ ط (آل عمران ع ۷) شریک نہ ٹھہرائیں اور ہم میں کا کوئی انسان کسی دوسرے انسان کو اللہ کو چھوڑ کر اپنا رب نہ ٹھہرائے۔

اس آیت کو لے کر کہا جا سکتا ہو کہ اس آیت سے تو معلوم ہوتا ہو کہ اہل کتاب کے لیے اتنی ہی بات کافی ہو کہ وہ اپنے اعتقاد و عمل سے شرک کی آلائشوں کو نکال کر خالص توحید کو اپنا لیں۔ گویا انھیں قرآن اتحاد فی الدین کی دعوت دیتا ہو۔ اتحاد فی الشریعت کی نہیں ——— لیکن واقع میں ایسا نہیں ہو۔ قرآن کا معاملہ کچھ ایسا ہو کہ اس کی کسی آیت کو سیاق و سباق سے کاٹ کر کچھ کا کچھ مطلب پہنایا جا سکتا ہو، اس آیت کے متعلق یہ کہنا بھی اسی قبیل سے ہو، سیاق و سباق کو اگر نظر میں رکھا جائے تو اس آیت کا یہ مطلب ہرگز نہیں لیا جا سکتا بلکہ یہ ماننا پڑے گا کہ یہاں اہل کتاب کے سامنے کل مطالبہ نہیں رکھا گیا ہو، بلکہ اتمام حجت کے طور پر مطالبہ کا ایک جزو پیش کیا گیا ہو۔ اس بات کو سمجھنے کے لیے پورے تین رکوع پیچھے لوٹنے کی ضرورت ہو۔ کیونکہ سورۂ آل عمران کے ساتویں رکوع کی یہ پہلی آیت جس پر بحث ہو اس سلسلۂ کلام کا جزو ہو جو چوتھے رکوع کی پہلی آیت سے شروع ہوتا ہو، سلسلۂ کلام کا آغاز یوں ہوتا ہو۔

قُلْ اِنْ كُنْتُمْ تُحِبُّوْنَ اللّٰهَ فَاتَّبِعُوْنِيْ يُحْبِبْكُمُ اللّٰهُ وَ يَغْفِرْ لَكُمْ ذُنُوْبَكُمْ ؕ وَاللّٰهُ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ۝ قُلْ اَطِيْعُوا اللّٰهَ وَالرَّسُوْلَ ۚ فَاِنْ تَوَلَّوْا فَاِنَّ اللّٰهَ لَا يُحِبُّ الْكٰفِرِيْنَ ۝ (آل عمران ع ۴) (آیت ۱-۲)

(اے محمد) ان لوگوں سے کہہ دیجیے کہ اگر تم اللہ کو چاہتے ہو تو میرے پیچھے چلو، اللہ تمھیں چاہنے لگے گا (یعنی تمھاری محبت کو قبول کرلے گا)، اور تمھارے گناہ معاف فرما دیگا ——— اللہ بڑی مغفرت اور رحمت والا ہو۔ (اے محمد) آپ ان سے کہیے کہ فرمانبرداری کرو اللہ اور رسول کی، لیکن اگر وہ اطاعت منظور نہ کریں تو (جان لیں) کہ اللہ نافرمانوں سے محبت نہیں کرتا ہو (یعنی اطاعت کے بغیر اللہ کے یہاں ان کی محبت مقبول نہیں ہو)

اس کے بعد کہا گیا ہو کہ آج یہ کوئی نیا قانون نہیں نافذ ہو رہا ہو بلکہ ہمیشہ سے یہی ہوتا رہا ہو کہ اللہ تعالیٰ اپنے جن بندوں کو رسالت کے لیے منتخب فرما لیتا ہو ان کی پیروی کرنے والے ہی اللہ کی محبت، مغفرت، اور رحمت کے مستحق ہوتے ہیں۔ اِنَّ اللّٰہَ اصْطَفٰۤی اٰدَمَ وَنُوْحًا وَّاٰلَ اِبْرٰهِیْمَ وَاٰلَ عِمْرٰنَ عَلَی الْعٰلَمِیْنَ الخ پھر آل عمران کے انتخاب پر روشنی ڈالتے ہوئے بتلایا کہ دیکھو جب ہم نے حضرت عیسیٰ کو اس منصب کے لیے منتخب کیا

تو اُس وقت بھی اس قانون پر عمل ہوا تھا جو ان کی تصدیق کر کے ان کے تابعدار ہو گئے تھے ان کو ہم نے دنیا اور آخرت میں محبت اور رحمت کی نوید سنائی اور جنھوں نے انحراف اور سرکشی کا وطیرہ اختیار کیا ان کے حصہ میں دونوں جگہ عذاب شدید کی وعید آئی ـــــ ظاہر ہے کہ یہ خود اہل کتاب کی اپنی تاریخ تھی اسلیے اس سے انکار نہیں کر سکتے تھے، مگر قرآن اس بیان کے ذریعے انھیں جس نتیجہ پر پہونچانا چاہتا تھا (یعنی محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تصدیق و اطاعت کا وجوب) اسے نہ ماننے کی گویا انھوں نے قسم کھا رکھی تھی۔ اس لیے خود اپنی تاریخ کے ناقابل انکار نتائج سے فرار کی راہ انھوں نے یہ نکالی کہ مدعائے کلام کو نظر انداز کر کے تمہید کلام کی ایک ضمنی بات پر گفتگو شروع کر دی یعنی تمہید میں جو حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی پیدائش کا ذکر آگیا تھا اور اس سے یہ نتیجہ نکلتا تھا کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام ابن مریم ہیں، ابن اللہ نہیں۔ اس پر ان لوگوں نے اعتراض کیا کہ اگر ان کا باپ اللہ نہیں ہے تو وہ بغیر باپ کے کیسے پیدا ہوئے؟ قرآن نے نہایت مسکت جواب دیا ـــــ کہا ـــــ جیسے آدم بغیر ماں باپ کے پیدا ہوئے! پھر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے کہا گیا کہ اگر یہ اس پر بھی کٹ حجتی سے باز نہیں آتے تو چھوڑیئے گفتگو کا راستہ اور ان سے کہیے کہ آؤ بحث تمام کرو مباہلہ کر لو! دل میں کھوٹ تھی مباہلہ کی جرأت نہ ہوئی۔ مگر اتنی کھلی لاجوابی کے بعد بھی اتباع و اطاعت رسول پر آمادہ نہ ہوئے۔

ان کی اس کٹ حجتی سے ثابت ہو گیا کہ ان میں حق پرستی بالکل نہیں ہے، یہ اپنی ہوائے نفس کے تابع ہیں۔ پس ان کے حق میں اب دعوتِ حق بے سود تھی ؎

زمین شور سنبل بر نیارد ـــ درو تخم عمل ضائع مگرداں

ایسی صورت میں داعی کو اتمام حجت کا طریقہ اختیار کرنا پڑتا ہے تاکہ دنیا جان لے کہ مخاطب کے اعراض و انکار کا باعث بجز ہوی پرستی کے اور کچھ نہیں ہے، اتمام حجت کا ایک طریقہ وہ ہے جس کی تعبیر اردو میں کی جاتی ہے "جھوٹے کو گھر تک پہونچانا" ان لوگوں کے مقابلہ میں قرآن نے اسی طریقہ کو اختیار کیا اور کہا

قُلْ يَا أَهْلَ الْكِتٰبِ تَعَالَوْا إِلٰى كَلِمَةٍ سَوَاءٍ بَيْنَنَا وَبَيْنَكُمْ أَلَّا نَعْبُدَ إِلَّا اللّٰهَ وَلَا نُشْرِكَ بِهٖ شَيْئًا وَّلَا يَتَّخِذَ بَعْضُنَا بَعْضًا أَرْبَابًا مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ ط

مطلب یہ ہے کہ اے رسول ان لوگوں سے کہیے کہ اچھا آؤ! سردست ان باتوں کو چھوڑ دو۔

جن میں تم ہم سے واقعی اختلاف محسوس کرتے ہو، ،، مگر آؤ ایک بات تو مان لو جس میں تمھیں کوئی اختلاف نہیں ہوسکتا! ـــــ اور اگر اس متفق علیہ بات پر بھی عمل کرنے سے انکار کرتے ہیں تو پھر انھیں یہ جتا کر (اس مسئلہ پر) بات ختم کردو کہ ہم نے حجت تمام کردی تمھیں نہیں ماننا تھا نہیں مانا۔ اور تم خود اپنی ہٹ دھرمی سے اس بات پر گواہ بن گئے ہو کہ حق پرست ہم ہیں، تم نہیں ـــــ

ـــــ فَإِنْ تَوَلَّوْا فَقُولُوا اشْهَدُوا بِأَنَّا مُسْلِمُونَ ۝

اس آیت کا مطلب صاف ہونے کے بعد ہمیں امید ہو کہ اب کوئی مغالطہ باقی نہ رہا ہوگا۔

(باقی آئندہ)
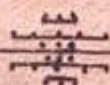
بقیہ مضمون صفحہ ۳۸

الغرض مکہ معظمہ کی گورنری سے معزولی کے بعد بارہ سال تک خالد سیاست کے اسٹیج سے قطعاً ناپید ہوگیا۔ اس کا بھی پتہ نہیں چلتا کہ اس طویل مدت کو اس نے کس حال میں کہاں گزارا، عروج کے بعد خالد کے زوال کا یہ پہلا دور تھا، مگر اس شدید ناکامی کے بعد بھی سیاسی اولوالعزمیوں کے حوصلے اس کے پست نہیں ہوئے تھے، اس زوال کے بعد سننے کے قابل اس کے عروج و زوال کی وہ داستان ہو جس کا ذکر انشاء اللہ تعالیٰ آئندہ قسط میں کیا جائے گا۔
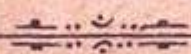
بقیہ مضمون صفحہ ۴۸

اسی طرح معنوی توالد بھی بغیر مرشد کے مشکل ہے۔ ....

آپ نے بدھ کے دن قبل غروب ۱۲؁ جمادی الاولیٰ ۱۰۵۰ھ[1] میں وفات پائی اور جمعرات کے دن صبح کو اس قبر میں جو کوہ قعیقعان (بروزن زعیفران) پر واقع ہے مدفون ہوئے۔

---

[1] سید کمال سنبھلی اور حکیم صاحب کی پیش کردہ تاریخوں میں تھوڑا سا فرق ہے۔ میرا ذوق ناقص سید کمال کی بتلائی ہوئی تاریخ کو ترجیح دیتا ہے۔ اس وجہ سے بھی کہ سید کمال ان کے ہم وطن اور ہم عصر ہیں۔

سفرنامہ شاہ ایران

ناصرالدین شاہ ایران نے اپنی سیاحت یورپ کے حالات قلمبند کیے تھے جو اس قدر دلچسپ اور پر از معلومات ہیں کہ مختلف زبانوں میں ترجمے کیے گئے۔ اُردو کا ترجمہ مولوی فرخی صاحب اُستاد نواب رامپور نے کیا ہے جو قابل دید ہے قیمت مجلد ۱۲/

چین اور چینی

اس رسالہ میں ملک چین کے حالات اور چینی باشندوں کے معاشرتی رسوم وغیرہ کا مختصر خاکہ پیش کیا گیا ہے۔ مولفہ منشی محمد شفیع الدین خاں مراد آبادی ایم۔ آر۔ اے۔ ایس۔ قیمت ۸/

یادگار شرر

منشی ارتضا علی علوی شرر کاکوروی کا مجموعہ نظم جسمیں حسب ذیل نظمیں ہیں مسدس قومی۔ خواب عبرت پیاری برسات۔ صبح گلگون۔ سہانی شام۔ رخصت بہار۔ امید۔ اظہار محبت۔ عشق و فرض منصبی۔ ستاروں کی روشنی۔ دوشیزگی نغمۂ عشق وغیرہ۔ قیمت ۵/

اخلاق محمدی

یہ کتاب اخلاق محمدی صلی اللہ علیہ وسلم کا آئینہ ہے جس سے تمام مسلمان اپنی زندگی کو سنت نبوی اور اسوۂ صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم کے مطابق بنا سکتے ہیں۔ یہ کتاب اپنے دوسرے نام تاریخی تقویم الاخلاق کے لحاظ سے بھی اسم بامسمیٰ ہے۔ روزانہ زندگی کے تقریباً ہر پہلو کے متعلق آیات قرآنیہ و احادیث نبویہ مع ترجمہ درج کی ہیں۔ کھانا۔ پینا۔ سونا۔ جاگنا۔ اٹھنا۔ بیٹھنا پہننا اوڑھنا۔ ملاقات۔ حقوق و فرائض۔ غرض جملہ امور کے متعلق قرآن و حدیث کی ہدایت موجود ہے۔ اسکو پڑھکر ہر انسان راہ ہدایت پا سکتا اور ہر مسلمان اپنی زندگی طریق سنت پر لا سکتا ہے۔ کتاب کی اصل خوبیوں کا تصور صرف اسکے مطالعہ سے ہو سکتا ہے۔ قیمت (حصہ اول و دوم) ۱۲/

مختارات الصوفیہ

مذکورہ بالا کتاب (جو عربی زبان میں ہے) اُسی کا یہ کتاب اُردو ترجمہ ہے۔ مسلمان ہر پیر بنجانے والے شخص کے نہایت آسانی سے گرویدہ اور اُسکے ہاتھ میں اپنا ہاتھ دیدینے کے لیے تیار ہو جاتے ہیں۔ اسلیے اس کتاب کا ہر مسلمان کے مطالعہ سے ایکبار گذر جانا ضروری ہے تاکہ انھیں معلوم ہو جائے کہ اسے لباس میں آدم رو بہت سے ابلیس پھرتے ہیں پس بہر دستے نباید داد دست۔ کتاب کی زبان نہایت عام فہم ہے جس سے معمولی استعداد کے لوگ بھی بخوبی فائدہ اٹھا سکتے ہیں۔ یہ کتاب واقعی اس لائق ہے کہ ہر مسلمان اسے خود پڑھے اور دوسروں کو سنائے اور سمجھائے۔ قیمت ۱۲/

ازواج الانبیا

حضرت آدم علیہ السلام سے لیکر حضرت عیسیٰ علیہ السلام تک جملہ انبیاے کرام کی ازواج مطہرات کے حالات۔ اُردو کیا معنی فارسی عربی میں بھی اس سے قبل کوئی تذکرہ اس نوعیت کا موجود نہ تھا۔

قیمت ۱۲/

الدر النظیم فی خواص القرآن العظیم

خداوند کریم جل شانہ نے اپنے کلام پاک میں جو عجیب و غریب برکتیں ودیعت کی ہیں منکرین اور متشککین انکا اقرار نہیں کرتے لیکن جملہ دیندار مسلمانوں کو اسکا یقین واثق ہے۔ بہرانیم افسوس ہے کہ اس دور ضلالت میں عام مسلمان جھوٹے اور مصنوعی تعویذوں پر اعتماد کرتے ہیں اور اصل کلام الٰہی کی طرف رجوع نہیں کرتے۔

اس رسالہ میں حضرت امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ نے خواص القرآن والسور اور قاضی ابوبکر داغستانی کے برق اللامع والغیث الہامع کو یکجا کر دیا ہے اور دونوں مسلمہ طور پر خواص و اسرار قرآن شریف میں بےمثیل ہیں۔ حاجتمندوں کو اور نیز انکو جو دوسروں کی خدمت پر مامور ہیں اس قابل قدر رسالہ کو حرز جاں بنانا چاہیے۔ قیمت ۱۲/

الفرقان لکھنؤ

ماہنامہ

ہماری دعوت

لا الٰہ الا اللہ محمد رسول اللہ

اسی کلمہ پر اسلام کی بنیاد ہے اور ہمارا ایمان ہے کہ یہی انسانیت کی نجات کا کلمہ ہے
لیکن یہ صرف ایک بول ہی نہیں ہے، بلکہ ایک شہادت، ایک اصول اور ایک اہم فیصلہ ہے، دراصل یہ
اس بات کا عہد ہے کہ ہم صرف اللہ کی عبادت اور بندگی کریں گے اور زندگی کے ہر شعبہ میں اس کی بھیجی ہوئی
اور حضرت محمد صلعم کی لائی ہوئی ہدایت اور شریعت کی پیروی کریں گے اور اسی حال میں جئیں گے اور مریں گے۔
جو لوگ اس کلمہ پر ایمان لا چکے ہیں ان کا فرض ہے کہ زندگی اس عہد کے مطابق گزاریں اور اسی ایمانی
زندگی کو دنیا میں رواج دینے کی کوشش کریں، وہ اسی لیے پیدا ہوئے ہیں۔ ہم اس کا
عہد کرتے ہیں اسی کی دعوت دیتے ہیں اور اسی پر جینا اور مرنا چاہتے ہیں۔

فَاطِرَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ اَنْتَ وَلِیّٖ فِی الدُّنْیَا وَالْاٰخِرَةِ
تَوَفَّنِیْ مُسْلِمًا وَّاَلْحِقْنِیْ بِالصّٰلِحِیْنَ

"ادارۂ الفرقان"

مدیر و مسئول

محمد منظور نعمانی عفا اللہ عنہ

جلد (۲۱) | ماہ رجب المرجب ۱۳۷۳ھ، مطابق مارچ ۱۹۵۴ء | شمارہ (۷)

پاکستان میں چندہ : سکریٹری ادارۂ اصلاح و تبلیغ، آسٹریلین بلڈنگس لاہور کے نام بھیجیے اور ہمیں فوراً اطلاع دیجیے۔

تاریخ اشاعت ــــــ ہر انگریزی مہینے کی ۱۵ر

اگر رسالہ نہ پہونچنے کی اطلاع ۲۵ر تاریخ کو دے دی جائے تو دوبارہ بلاقیمت ارسال کیا جاتا ہے۔

سُرخ نشان

اگر اس دائرہ میں سرخ نشان لگا ہے تو مطلب یہ ہے کہ آپ کا چندہ ختم ہو چکا ہے براہ کرم نئے سال کے لیے چندہ ارسال فرمائیں، ورنہ اگلا رسالہ بذریعہ وی پی ارسال کیا جائے گا، وی پی ہے کا ہوگا۔

(مولوی) محمد منظور نعمانی پرنٹر و پبلشر نے نامی پریس لکھنؤ میں چھپوا کر دفتر الفرقان گوئن روڈ لکھنؤ سے شائع کیا۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

شمارہ ۵ بابت ماہ جمادی اولیٰ میں اعلان کیا گیا تھا کہ انشاءاللہ شعبان میں الفرقان کا ایک خاص نمبر شائع کیا جائے گا، اور یہ اُن مہینوں کے رسالوں کا بدل ہوگا جن میں سالِ گزشتہ رسالہ بند رہا تھا ——— چنانچہ اس سلسلہ میں اب یہ اعلان کرنا ہے کہ یہ خاص نمبر مسلمانانِ ہند کے اُن مسائل سے متعلق ہوگا جو انھیں نئے ہندوستان میں مذہبی، تعلیمی اور تمدنی حیثیت سے درپیش ہیں۔ اس نمبر کی ترتیب میں ملک کے متعدد اہلِ قلم و اصحابِ فکر سے حصہ لینے کی استدعا کی گئی ہے، امید ہے کہ اس نمبر کے ذریعہ ان مسائل میں دینی نقطۂ نظر سے مسلمانوں کی صحیح تر رہنمائی عمل میں آئے گی، اور مجموعی طور پر یہ نمبر ہندوستان میں مسلمانوں کے "حقیقی مسلمان اور باعزت" رہنے کے لیے ایک مؤثر لائحۂ عمل پیش کرے گا۔

یہ نمبر سالانہ چندہ میں صرف انھیں خریداروں کی خدمت میں پیش کیا جائے گا جو گذشتہ سال بھی خریدار تھے، لہٰذا وہ حضرات جو اسی سال خریدار بنے ہیں، اُن کے لیے اس نمبر کے حاصل کرنے کی صورت یہ ہے کہ اس نمبر کی قیمت ارسال فرماویں جو ایک روپیہ آٹھ آنے ہوگی۔

یہ نمبر چونکہ اصل میں اُن خریداروں کے لیے ہے جن کا گذشتہ سال کا حساب دفتر کے ذمہ ہے، اس لیے انھیں کی تعداد کے مطابق چھپوانا پیشِ نظر ہے، جن نئے خریداروں کو منگوانا ہو وہ ۱۵ر مئی تک دفتر کو اطلاع دے دیں، نیز ایجنٹ صاحبان بھی مقررہ کاپیوں سے جس قدر زائد منگوانا چاہتے ہوں ۱۵ر مئی تک ضرور مطلع فرمادیں۔

——— ناظم الفرقان

بسم اللہ الرحمن الرحیم

نگاہ اولیں

(گزشتہ سے پیوستہ)
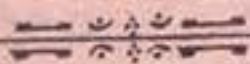
سورۂ آل عمران کی اس آیت کے علاوہ سورۂ مائدہ میں ایک آیت ہے

لِكُلٍّ جَعَلْنَا مِنكُمْ شِرْعَةً وَّمِنْهَاجًا ۚ وَلَوْ شَاءَ اللَّهُ لَجَعَلَكُمْ أُمَّةً وَاحِدَةً وَلَٰكِن لِّيَبْلُوَكُمْ فِي مَا آتَاكُمْ ۖ فَاسْتَبِقُوا الْخَيْرَاتِ الخ۔ (مائدہ۔ ع ۷)

تم میں سے ہر ایک کے لیے ہم نے (عمل کا) ایک ضابطہ اور طریقہ بنایا، اور اللہ اگر چاہتا تو یہ ہوسکتا تھا کہ تم سب کو ایک ہی امت بنا دیتا، مگر ایسا نہ کرنے میں ایک حکمت یہ بھی تھی) کہ اپنے احکام میں تمہاری آزمائش کرے ــــ پس سبقت کرو بھلائیاں قبول کرنے میں۔

اس سے بھی بعض لوگ فائدہ اٹھاتے ہیں، اور یہ ثابت کرنا چاہتے ہیں کہ تمام انسانوں کے لیے ایک ہی شریعت کی پابندی ضروری نہیں ہے، بلکہ خود خدائے تعالےٰ ہی الگ الگ شریعتیں اور الگ الگ امتیں رکھنا چاہتا ہے ــــ لیکن یہ محض غلط فہمی ہے، اور آیت کا مقصد قطعاً یہ نہیں ہے، جو ان لوگوں نے سمجھا ہے، یہ آیت دراصل ماقبل کی آیات سے پیدا ہونے والے ایک سوال کا جواب ہے۔ لہٰذا ہمیں یہ دیکھنا چاہیے کہ ماقبل میں کیا کہا جا رہا ہے اور اس سے کیا سوال پیدا ہوتا ہے۔

ماقبل میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے یہ کہا جا رہا ہے کہ اگر اہلِ کتاب آپ سے کسی معاملے میں حکم دریافت کریں (جیسا کہ یہود نے زنا کی سزا کے بارے میں پوچھا تھا) تو آپ وہی حکم بتلائیں جو ہماری طرف سے آپ کو دیا گیا ہے، یعنی قرآن کے مطابق فیصلہ کریں۔ کیونکہ ہر کتاب کا ایک دور ہوتا ہے جس میں

اسی (کتاب) کے مطابق فیصلہ کرنا ضروری ہوتا ہے، ہم نے جب توراۃ نازل کی تو انجیل کے نازل کرنے تک ہمارا حکم یہی تھا کہ اس کے احکام پر عمل کیا جائے، چنانچہ جو فرمانبردار تھے وہ اسی کے مطابق عمل کرتے رہے، اس کے بعد ہم نے (حضرت) عیسیٰ کو انجیل دے کر بھیجا تو اسی قدیم دستور کے مطابق ہمارا حکم یہ تھا کہ اب احکام انجیل کی پابندی کی جائے۔ اور اب آپ کو قرآن دے کر بھیجا ہے تو ٹھیک اسی دستور کے مطابق اب ہمارا حکم یہ ہے کہ ہر معاملے کا فیصلہ قرآن کے مطابق کیا جائے، ملاور بعد والی کتاب کا مقصد جہاں کچھ نئے احکام دینا ہوتا ہے وہاں اس سے پہلی کتابوں کے اُن احکام کی تجدید بھی مقصود ہوتی ہے جن میں اہل کتاب تحریف کرنے لگتے ہیں، بلکہ قرآن کی بھی بہت سی ہدایات اور بہت سے احکام وہی ہیں جو کتب سابقہ میں تھے۔ مگر جب ان کتابوں کے امین ان میں بددیانتی کرنے لگے تو پھر اب ان کتابوں پر اعتماد نہیں کیا جا سکتا، لاور ضروری ہے کہ ہدایات الٰہی کی امانت اب از سر نو دوسرے لوگوں کے سپرد کی جائے چنانچہ قرآن کی امانت کے لیے سابقہ اہل کتاب کو چھوڑ کر ایک نئی اُمت کا انتخاب کیا گیا) پس اب ہر حکم کے حق و باطل ہونے کا معیار قرآن کی مطابقت ہے، جو حکم قرآن کے مطابق ہے وہ حق ہے، یعنی اللہ کا حکم ہے اور جو قرآن کے مطابق نہیں ہے وہ باطل یعنی غیر اللہ کا حکم ہے، چاہے وہ حکم توریت کے "ٹھیکیدار" دیں یا انجیل کے! ـــــ یہ ہے ان آیات کا ذرا تفصیلی مطلب جو زیر بحث آیت کے ماقبل کی ہیں ـــــ اس پر اہل کتاب کی طرف سے یہ کہا جا سکتا تھا کہ ہم (یعنی اہل کتاب) اگر پوری دیانتداری کے ساتھ کتب سابقہ کے احکام و ہدایات کو پیش کرنے لگیں تب بھی تو قرآن سے پوری مطابقت نہیں ہو سکتی، کیونکہ اس میں کتنے ہی احکام بدل کر نئے احکام رکھے گئے ہیں، ہم اپنی پہلی کتاب اور پہلی شریعت کو کیسے چھوڑ دیں حالانکہ وہ بھی من جانب اللہ ہے اور ہم اپنے کو (حضرت) محمد کے لائے ہوئے احکام کا کیسے پابند بنائیں جبکہ ان کے احکام ہماری قدیم شریعت سے کبھی مختلف بھی ہوتے ہیں؟:۔

اس سوال کا جواب دیا گیا لِكُلٍّ جَعَلْنَا مِنكُمْ شِرْعَةً وَمِنْهَاجًا الخ ـــــ یعنی بیشک یہ بات ہے کہ تمہاری قدیم شریعتوں میں اور اس نئی شریعت میں کچھ فرق ہے، اور یہی نہیں، بلکہ پہلی شریعتوں میں بھی خود آپس میں تھوڑا بہت اختلاف ہے، اور یہ اختلاف ہمارا ہی رکھا ہوا ہے، لیکن اس فرق و اختلاف کی اور بہت سی وجوہ و مصالح کے علاوہ ایک بڑی حکمت یہ ہے کہ ہر بعد والی شریعت کے ذریعہ پہلی شریعت والوں کا امتحان ہو جاتا ہے، یعنی یہ معلوم ہو جاتا ہے کہ کون لوگ اس شریعت کی

پابندی خدا پرستی کے جذبہ سے کر رہے ہیں اور کون لوگ آباء پرستی کے جذبہ سے، جو خدا پرستی کے جذبہ سے کرتے ہیں وہ یہ معلوم ہونے کے بعد کہ اب خدا کا حکم یہ ہو اس کے سامنے سر تسلیم خم کر دیتے ہیں، اور یہ سوال نہیں اٹھاتے کہ ہمارے پاس جو اللہ کا سابق حکم ہو جس پر ہمارے باپ دادا چلتے رہے ہیں وہ اس سے مختلف ہو، اس لیے کہ اطاعت و فرمانبرداری کی روح یہی ہو کہ جس وقت جو حکم دیا جائے، بے چون و چرا مان لیا جائے، کل یہ حکم تھا کہ نماز میں رُخ بیت المقدس کی طرف کیا جائے تو اس پر عمل تھا، اور آج اگر یہ حکم ہو کہ بیت المقدس کے بجائے مکہ کے بیت اللہ کی طرف کیا جائے تو بلا تامل اس پر عمل ہو جائے، اور جن لوگوں کی اطاعت میں خدا پرستی کی روح کے بجائے آباء پرستی کی روح آجاتی ہو وہ یہ کہہ کہہ کر کہ ہمارے پاس تو اللہ کا حکم یہ ہو، نئے احکام سے روگردانی کرتے ہیں، لیکن ان کی یہی ضد یہ بتلا دیتی ہو کہ ان کو اپنی پہلی شریعت پر اصرار صرف اس لیے ہو کہ یہ انکے باپ دادا کے زمانہ کی شریعت ہو، نہ اس لیے کہ یہ خدا کا حکم ہو، اور نئی شریعت سے انکار اس لیے ہو کہ اس کے پیش کرنے والے ان میں سے نہیں ہیں، کیونکہ اگر یہ حکم کے بندے ہیں تو پھر اس بارے میں اطمینان کے بعد کہ نئے احکام اللہ ہی کی طرف سے ہیں، کسی بھی حکم پر سمعنا و اطعنا کہنے میں پس و پیش نہ ہونا چاہیے، ——— بس یہ مطلب ہو اس آیت کا جس میں کہیں سے بھی وہ بات نہیں نکلتی جو بعض لوگ سمجھتے ہیں۔

بے شک اگر آیت کا صرف اتنا ہی حصہ پڑھا جائے کہ "لِكُلٍّ جَعَلْنَا مِنْكُمْ شِرْعَةً وَمِنْهَاجًا ۚ وَلَوْ شَاءَ اللَّهُ لَجَعَلَكُمْ أُمَّةً وَاحِدَةً" تو یہ بات نکل سکتی ہو، لیکن اگر اس کے آگے "وَلَٰكِنْ لِيَبْلُوَكُمْ فِي مَا آتَاكُمْ ۖ فَاسْتَبِقُوا الْخَيْرَاتِ" بھی پڑھ لیا جائے اور ساتھ ہی چند پہلی آیات پر بھی نظر ڈال لی جائے تو پھر بات بالکل دوسری ہو جائے گی۔ اور وہ نتیجہ نکلے گا جو ہم عرض کر رہے ہیں۔ یعنی یہ آیت شریعتِ محمدی کے بعد بھی سابقہ شرائع پر عمل کی سند نہیں دے رہی ہو، بلکہ صرف اس اختلاف کی توجیہ کر رہی ہو جو ان شرائع کے درمیان واقعی طور پر پایا جاتا ہو، اور وہ توجیہ ہو، امتحان و آزمائش! ——— ظاہر ہو کہ یہ آزمائش اسی صورت میں ہو سکتی ہو کہ سابقہ شریعت والوں کو نئی شریعت کے اتباع کا حکم دیا جائے، پس اس آزمائش سے کامیاب ہو کر نکلنے کی تنہا یہی سبیل ہو کہ جس وقت جو حکم مل رہا ہو اس پر سر جھکا دیا جائے، جو کام جس طرح سے کرنے کے لیے کہا جا رہا ہو وہ اپنی قدیم عادت اور خواہش کے علی الرغم ویسے ہی کیا جائے ——— یہی خدا پرستی ہو، یہی نیکی ہو، اور یہی

نصیب ہے! "فاستبقوا الخیرات" (پس سبقت کرو نیکیوں اور بھلائیوں کی طرف!)

اس آیت کے بارے میں تو غالباً اب کوئی شبہ نہیں رہا ہوگا، لیکن قرآن کا یہ انداز کلام جو اس آیت میں بعض لوگوں کے لیے اس غلط فہمی کا باعث ہوا (کہ قرآن کسی ایک شریعت کی پابندی تمام اقوام عالم پر لازم نہیں کرتا) یہ اسی آیت تک محدود نہیں ہے، بلکہ قرآن میں متعدد جگہ یہی انداز کلام اختیار کیا گیا ہے۔ مثلاً

(۱) وَلِكُلٍّ وِجْهَةٌ هُوَ مُوَلِّيهَا فَاسْتَبِقُوا الْخَيْرَاتِ ط (سورۂ بقرہ ع ۱۸) — اور ہر ایک (گروہ) کے لیے ایک سمت ہے جس کی طرف وہ (عبادت میں) رُخ کرتا ہے، پس سبقت کرو بھلائیوں میں۔

(۲) لَيْسَ الْبِرَّ أَنْ تُوَلُّوا وُجُوهَكُمْ قِبَلَ الْمَشْرِقِ وَالْمَغْرِبِ وَلَٰكِنَّ الْبِرَّ مَنْ آمَنَ بِاللَّهِ الخ (سورۂ بقرہ ع ۲۲) — نیکی اسی میں نہیں رکھی ہوئی ہے کہ تم اپنا رخ پورب یا پچھم کی طرف کرو، بلکہ نیکی کا مدار ایمان اور اعمالِ صالحہ پر ہے۔

پس ان آیات سے بھی کچھ ایسا ہی مطلب سمجھا جا سکتا ہے، اگر سیاق و سباق کو نظر انداز کر دیا جائے!

— لہٰذا ان تمام مقامات کے لیے یہ ایک اصولی نکتہ سمجھ لینا چاہیے کہ اس قسم کا اندازِ گفتگو جہاں کہیں اختیار کیا گیا ہے، وہاں مخالفین اسلام کے اس طرز فکر پر تنقید مقصود ہے کہ محمد اگر اللہ کے رسول ہیں تو ان کے اور ان کے پیروؤں کے بعض طور طریقے دوسرے انبیاء اور ان کی امتوں سے کیوں مختلف ہیں؟ — چنانچہ مختلف مواقع پر مختلف عنوانات سے یہ بات کہی گئی کہ یہ اندازِ فکر بالکل غلط ہے، دیکھنے کی جو چیز ہے، وہ یہ ہے کہ دعوت ایمان و عملِ صالح کی ہے یا نہیں۔

رہی بعض اعمال کی خاص شکل و صورت، وہ بعض مصلحتوں اور حکمتوں کے پیش نظر کسی نبی کے لیے کچھ مقرر کر دی جاتی ہے اور کسی کے لیے کچھ! مثلاً سمتِ قبلہ ہی کا مسئلہ ہے جس سے مذکورۂ بالا دونوں آیتیں متعلق ہیں، اس میں کسی خاص سمت کی پابندی اگر کی جائے گی تو صرف اس لیے کہ اللہ نے (کسی مصلحت سے) اس کی پابندی کا حکم دیا ہے۔ ورنہ اللہ تو ہر طرف ہے، جدھر بھی رخ کر لیا جاتا، مل جاتا۔ قُلْ لِلَّهِ الْمَشْرِقُ وَالْمَغْرِبُ فَأَيْنَمَا تُوَلُّوا فَثَمَّ وَجْهُ اللَّهِ (کہہ دیجیے کہ مشرق و مغرب سب اللہ کی سمتیں ہیں، پس تم جدھر بھی منھ کرلو اُدھر اللہ ہے) پس اب اللہ تعالیٰ اگر (حضرت) محمد کے دور میں کوئی دوسری سمت قبلہ کے لیے مقرر کرتا ہے تو اس کی طرف رُخ کر کے عبادت کرو، سمتوں میں خود کچھ نہیں رکھا ہے، نہ مشرق کی طرف رُخ کرنا فی نفسہٖ ثواب ہے

نہ مغرب کی طرف رُخ کرنا بذاتہٖ گناہ، گناہ و ثواب کا تعلق تمام تر حکمِ الٰہی کی تعمیل اور عدمِ تعمیل سے ہے کہ اگر کسی خاص سمت کا حکم دے دیا گیا تو پھر اس کا ترک، گناہ اور اختیار ثواب ہے، پہلے کبھی اگر مشرق کو قبلہ بنانے کا حکم تھا تو اس سے انحراف گناہ تھا اور اب اگر مغرب کو قبلہ مقرر کر دیا گیا تو اس کا استقبال ثواب اور اس سے انحراف گناہ ہے۔ —— یہ ہے مقصد ان آیات کا! نہ یہ کہ کوئی خاص سمت متعین ہی نہیں ہے، جدھر کو بھی تم چاہو رُخ کر کے عبادت کر لو۔

یہ مقصد محض ہمارے ذہن کی پیداوار نہیں ہے بلکہ ان آیات کے آس پاس کی دوسری آیات اسی مقصد کو متعین کرتی ہیں۔ جن میں مکرّر سہ کرّر تاکید کے ساتھ سمتِ کعبہ کو قبلہ بنانے کا حکم دیا جا رہا ہے اور اہلِ کتاب کی خواہش کے مطابق، بیت المقدس کو قبلہ بنانے کی سخت طور سے ممانعت کی جا رہی ہے۔

وہ آیات یہ ہیں۔ ——

فَوَلِّ وَجْهَكَ شَطْرَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ ۖ وَحَيْثُ مَا كُنْتُمْ فَوَلُّوا وُجُوهَكُمْ شَطْرَهُ ۗ

(بقرہ ع ۱۷)

پس موڑ دو تم (اے محمد) اپنا چہرہ مسجد حرام کی جانب، اور (اے مسلمانو!) تم جہاں کہیں بھی ہو اپنا رُخ اسی (مسجد حرام) کی طرف پھیر لو۔

وَلَئِنِ اتَّبَعْتَ أَهْوَاءَهُمْ مِنْ بَعْدِ مَا جَاءَكَ مِنَ الْعِلْمِ ۙ إِنَّكَ إِذًا لَمِنَ الظَّالِمِينَ ○

(بقرہ ع ۱۷)

اور اگر تم چلے ان کی (اہلِ کتاب کی) خواہشات کے پیچھے در انحالیکہ تمہیں (سمتِ قبلہ کے معاملہ میں اللہ کی مرضی کا) علم ہو چکا ہے تو بے شک تم تجاوز کرنے والوں میں سے ہو گے۔

وَمِنْ حَيْثُ خَرَجْتَ فَوَلِّ وَجْهَكَ شَطْرَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ ۖ وَإِنَّهُ لَلْحَقُّ مِنْ رَبِّكَ ۗ

(بقرہ ع ۱۸)

اور جہاں سے بھی تم نکلو اپنا چہرہ (نماز میں) مسجد حرام ہی کی طرف پھیر لو، اور یہی بیشک حق ہے تمہارے پروردگار کی طرف سے۔

بتلائیے کہ اگر سابقہ آیات کا مقصد یہ ہوتا کہ جس کا جدھر کو جی چاہے منھ کر کے عبادت کر لے، اللہ

کے یہاں سب مقبول ہو تو پھر ان آیات کا کیا مقصد ہو؟ اور کیوں کہا گیا ہو کہ

وَمَا جَعَلْنَا الْقِبْلَةَ الَّتِي كُنْتَ عَلَيْهَا إِلَّا لِنَعْلَمَ مَنْ يَتَّبِعُ الرَّسُولَ مِمَّنْ يَنْقَلِبُ عَلَىٰ عَقِبَيْهِ ۚ
(رکوع ۱۷)

اور ہم نے نہیں مقرر کیا تھا وہ قبلہ[1] جس پر اب تک تم قائم تھے، مگر اس لیے کہ ممتاز کر دیں ان لوگوں کو جو رسول کا (ہر حال) اتباع کرتے ہیں۔ ان لوگوں سے جو اپنی خواہشات کے خلاف ہوتا دیکھ کر، اُلٹے پاؤں پھر جاتے ہیں[2]۔

اور پھر کیوں کہا گیا ہو کہ

وَإِنْ كَانَتْ لَكَبِيرَةً إِلَّا عَلَى الَّذِينَ هَدَى اللَّهُ ۗ
(رکوع ۱۷)

اور بےشک یہ بات (تحویل قبلہ) بہت ہی گراں گزرنے والی تھی سوائے ان لوگوں جن کو اللہ نے ہدایت دی

سوچنے کی بات ہو کہ اگر قبلہ کے لیے کسی ایک سمت کی پابندی ضروری نہیں تھی، تو تحویل قبلہ کے واقعہ میں امتحان و آزمائش کا آخر کیا پہلو نکلتا تھا؟ اور اگر قبلہ کے معاملہ میں ہر چہار سو کی وسعت قرآن نے دے رکھی تھی، تو پھر کیوں ان لوگوں کو اَلَّذِينَ هَدَى اللَّهُ (وہ لوگ جن کو اللہ نے ہدایت دی) خارج کیا گیا ہو جو کسی ایک خاص سمت کے معاملہ میں رسول اُمّی صلی اللہ علیہ وسلم کے پابند نہیں رہے؟ کیا (معاذ اللہ) اللہ کے یہاں یہ اندھیر ہو کہ ایک طرف تو یہ اعلان کیا کہ جدھر کو بھی رُخ

---

[1] مکہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کعبہ ہی کی طرف منھ کر کے عبادت کرتے تھے، مگر مدینہ آکر اللہ تعالیٰ کا حکم ہوا کہ بیت المقدس کو قبلہ بنایا جائے۔ یہ حکم سولہ[16] سترہ[17] مہینے رہا۔ اسکے بعد پھر کعبہ ہی کو ہمیشہ کے لیے قبلہ قرار دیدیا گیا۔ آیت میں قبلہ سے مراد یہی عارضی قبلہ ہو۔ [2] یعنی ہمارا یہ حکم آزمائشی تھا، جب یہ حکم دیا گیا تو اُن مسلمانوں کی آزمائش ہوگئی جن کا آبائی قبلہ بیت اللہ تھا، اور جب یہ حکم واپس لیا گیا تو اُن کی آزمائش ہوگئی جن کا آبائی قبلہ بیت المقدس تھا۔ ان دونوں گروہوں میں سے جو سچے دل سے آپ پر ایمان لائے تھے انھوں نے اپنے آبائی قبلہ کی محبت پر آپ کی اطاعت کو ترجیح دی اور جو ایمان لانے میں مخلص نہ تھے وہ آپ کی اطاعت میں اپنے آبائی قبلہ کو چھوڑنے پر تیار نہ ہوئے۔

کرلو اللہ مل جائے گا! اور دوسری طرف ان لوگوں کو ہدایت سے محروم ٹھہرا دیا جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ ایک خاص سمت کے پابند نہیں ہوئے؟ —— تعالیٰ اللہ عن ذٰلک علواً کبیراً

بس بلاشبہ یہ بات غلط اور بالکل غلط ہے کہ قرآن بھی تنہا شریعت محمدی کو دستور العمل بنانا لازم نہیں ٹھہراتا، بلکہ مختلف شریعتوں کی اجازت دیتا ہے۔ اس کے برعکس صحیح بات یہ ہے کہ رسالت محمدی کا دور شروع ہونے کے بعد، قرآن شریعت محمدی کے علاوہ کسی اور شریعت کو دستور العمل بنانے کی اجازت نہیں دیتا۔ اور اگر کوئی سمجھنا چاہے تو اس کے لیے صرف تحویل قبلہ کے موقع پر نازل ہونے والی یہی آیت کافی ہے جو ابھی اوپر گزری ہے (یعنی وَمَا جَعَلْنَا الْقِبْلَةَ الَّتِي كُنْتَ عَلَيْهَا الخ) کیونکہ یہ حقیقت ظاہر کردینے کے باوجود کہ "سمتوں میں کچھ نہیں رکھا ہوا، اللہ تعالیٰ ہر سمت میں ہے، مشرق میں بھی اور مغرب میں بھی پس جدھر کو بھی رُخ کرلوگے اُدھر اللہ کو پاسکتے ہو" (خود اس حقیقت کے ظاہر کردینے کے باوجود) یہ مطالبہ کرنا کہ جدھر کو محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم رُخ کریں اُدھر ہی کو رُخ کرو، اور اسی سمت کو قبلہ بناؤ! اور جو لوگ اس کے خلاف ورزی کریں اُن کو خواہشات کا بندہ اور ہدایت الٰہی سے محروم ٹھہرانا، یہ بلاشبہ اس بات کی دلیل ہے کہ ہدایت پیغمبرِ وقت کے اتباع میں منحصر ہے اور اس کے طریقے سے انحراف خواہ فی نفسہٖ کیسے ہی ہلکے معاملہ میں ہو اور اس کے طریقہ کو چھوڑ کر خواہ کسی سابقہ پیغمبر ہی کا طریقہ اختیار کیا گیا ہو، بلکہ خود اسی پیغمبر ہی کا کوئی سابقہ معمول کیوں نہ اختیار کیا گیا ہو، وہ ہرگز ہرگز ہدایت کی فہرست میں نہیں آئے گا —— کیونکہ سمتِ قبلہ کا مسئلہ خود قرآن کے بیان کے مطابق فی نفسہٖ کوئی اہمیت نہیں رکھتا، پھر یہ کہ اس مسئلہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی پیروی نہ کرنے کی صورت میں واقعاتی امکان دو ہی تھے، ایک یہ کہ (جس وقت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بیت المقدس کا رخ کرنے لگے تھے تو) مسجد حرام سے محبت رکھنے والے لوگ بدستور مسجد حرام ہی کو قبلہ بنائے رہتے، اور دوسرا یہ کہ (جس وقت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بیت المقدس کا رُخ چھوڑ کر پھر سے مسجد حرام کا رُخ اختیار کیا تو) بیت المقدس سے محبت رکھنے والے اس تبدیلی کو قبول نہ کرتے اور بدستور بیت المقدس ہی کو قبلہ بنائے رہتے، ہر دو صورتوں میں بعض انبیاء کا بلکہ خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بھی ایک سابقہ طریقہ کا اتباع تھا، لیکن اس کے باوجود ہدایت یاب صرف اسی گروہ کو بتلایا گیا جو ہر تبدیلی میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی پیروی کرتا رہا۔

الغرض پیغمبرِ وقت کے مکمل اتباع کے بغیر، ہدایت کا کوئی تصور قرآن میں نہیں ملتا ہے، قرآن کا تصور اس بارے میں بعینہٖ وہی ہے جو ایک حدیث کے ان الفاظ میں انتہائی صفائی کے ساتھ واضح کیا گیا ہے کہ

لَو کَانَ موسیٰ حَیًّا مَا وَسِعَہٗ اِلَّا اتِّبَاعِی۔ (بخاری شریف)

(رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا) کہ، اگر موسیٰ علیہ السلام (جیسے جلیل القدر صاحب شریعت نبی) بھی (میرے زمانہ میں) زندہ ہوتے تو انھیں بھی میرا ہی اتباع کرنا پڑتا۔

معارف الحدیث

(بسلسلۂ احادیث رقاق)

(مسلسل)

(۳۷) عَنْ قَتَادَۃَ بْنِ النُّعْمَانِ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ علیہ وسلَّمَ قَالَ اِذَا اَحَبَّ اللّٰہُ عبداً حَمَاہُ الدُّنْیَا کَمَا یَظَلُّ اَحَدُکُمْ سَقِیْمَہُ الْمَاءَ

(رواہ احمد والترمذی)

(ترجمہ) قتادہ بن نعمان سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا، جب اللہ تعالےٰ کسی بندہ سے محبت کرتا ہے تو دنیا سے اس کو اس طرح پرہیز کراتا ہے جس طرح کہ تم میں سے کوئی اپنے مریض کو پانی سے پرہیز کراتا ہے (جبکہ پانی سے اس کو نقصان پہونچتا ہو۔) (مسند احمد والترمذی)

(تشریح) جیسا کہ پہلے بھی بتایا جاچکا ہے، دُنیا سے وہی دُنیا مراد ہے جو اللہ تعالےٰ سے غافل کرنے والی اور آخرت کے درجات اور وہاں کی ترقیات میں رکاوٹ ڈالنے والی ہو، پس جو باتوفیق بندے دنیا کو آخرت کا وسیلہ بنالیں، اور اللہ کی راہ میں اس کو استعمال کریں، ان کے لیے ان کی وہ دنیا، دنیا نہیں، بلکہ خالص دین ہے۔

(۳۸) عَنْ مَحْمُوْدِ بْنِ لَبِیْدٍ اَنَّ النَّبِیَّ صلی اللّٰہ علیہ وسلم قَالَ اِثْنَانِ یَکْرَھُھُمَا ابْنُ اٰدَمَ یَکْرَہُ الْمَوْتَ وَالْمَوْتُ خَیْرٌ لِّلْمُؤْمِنِ مِنَ الْفِتْنَۃِ وَ یَکْرَہُ قِلَّۃَ الْمَالِ وَقِلَّۃُ الْمَالِ اَقَلُّ لِلْحِسَابِ۔ (رواہ احمد)

(ترجمہ) محمود بن لبید سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا دو چیزیں ایسی ہیں جنکو آدمی ناپسند ہی کرتا ہے (حالانکہ ان میں اس کے لیے بڑی بہتری ہوتی ہے) ایک تو وہ موت کو نہیں پسند کرتا، حالانکہ موت اس کے لیے فتنہ سے بہتر ہے، اور دوسرے وہ مال کی کمی اور ناداری کو

نہیں پسند کرتا، حالانکہ مال کی کمی آخرت کے حساب کو بہت مختصر اور ہلکا کرنے والی ہو.　(مسند احمد)

(تشریح) واقعہ یہی ہو کہ ہر آدمی موت سے اور ناداری و افلاس سے گھبراتا ہو اور ان سے بچنا چاہتا ہو. حالانکہ موت اس لحاظ سے بڑی نعمت ہو کہ مرنے کے بعد آدمی دنیا کے دین سوز فتنوں سے مامون و محفوظ ہو جاتا ہو، اور مال و دولت کی کمی اس لحاظ سے بڑی نعمت ہو کہ ناداروں مفلسوں کو آخرت میں بہت مختصر حساب دینا ہوگا اور وہ اس سخت مرحلہ سے بڑی جلدی اور آسانی سے فارغ ہو جائینگے.

(۳۹) عَنْ عِمْرَانَ بْنِ حُصَيْنٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ عَبْدَهُ الْمُؤْمِنَ الْفَقِيْرَ الْمُتَعَفِّفَ اَبَا الْعِيَالِ.

(رواہ ابن ماجہ)

(ترجمہ) عمران بن حصین سے روایت ہو کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا، اللہ تعالیٰ کو اپنا وہ مومن بندہ بہت پیارا اور محبوب ہو جو غریب و نادار اور عیال دار ہو، اور اس کے باوجود باعفت ہو، (یعنی ناجائز طریقہ سے پیسہ حاصل کرنے سے اور کسی کے سامنے اپنی ضروریات ظاہر کرنے سے بھی پرہیز کرتا ہو)

(تشریح) بلاشبہ جو شخص افلاس اور فقر و فاقہ کی حالت میں بھی محرمات و مشتبہات سے اپنی حفاظت کرے اور اپنی تنگ حالی کا اظہار بھی نہ کرے وہ بڑا باہمت اور اللہ کا پیارا بندہ ہو.

جو بندگانِ خدا اس دنیا میں تنگ حالی و ناداری میں مبتلا کیے گئے ہیں اور غریبی اور فقر و فاقہ کی زندگی گزار رہے ہیں کاش وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ان حدیثوں سے تسلی اور سبق حاصل کریں اور اللہ تعالیٰ نے ان کو اپنے محبوب (صلی اللہ علیہ وسلم) والی جو فقیرانہ و غریبانہ زندگی نصیب فرمائی ہو، اس کو اپنے حق میں نعمت سمجھ کر صابر و شاکر رہیں تو فقر و فاقہ کی تکلیفیں ہی ان کے لیے سامانِ راحت و لذت بن جائیں.

(۴۰) عَنْ اِبْنِ عَبَّاسٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مَنْ جَاعَ اَوِ احْتَاجَ فَكَتَمَهُ النَّاسَ كَانَ حَقًّا عَلَى اللّٰهِ عَزَّ وَجَلَّ اَنْ يَرْزُقَهُ رِزْقَ سَنَةٍ مِنْ حَلَالٍ.

(رواہ البیہقی فی شعب الایمان)

(ترجمہ) حضرت عبداللہ بن عباس سے روایت ہو کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ جو شخص بھوکا ہو یا اس کو کوئی اور خاص حاجت ہو اور وہ اپنی اس بھوک اور حاجت کو لوگوں سے چھپائے (یعنی ان کے سامنے ظاہر کر کے ان سے سوال نہ کرے) تو اللہ عز وجل کے ذمہ ہو کہ اس کو حلال طریقہ سے ایک سال کا رزق عطا فرمائے۔ (شعب الایمان بیہقی)

(تشریح) اللہ کے ذمہ ہونے کا مطلب یہ ہو کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے کرم سے اپنا یہ دستور مقرر فرمایا ہو اور جو بندہ بھی اللہ تعالیٰ کے اس وعدہ پر اور اس کی شان کریمی پر دل کے پورے یقین کے ساتھ اس کا تجربہ کرے گا، انشاء اللہ وہ اس کا ظہور اپنی آنکھوں سے دیکھ لے گا۔

(۴۱) عَنْ سَهْلِ بْنِ سَعْدٍ قَالَ جَاءَ رَجُلٌ فَقَالَ يَا رَسُولَ اللهِ دُلَّنِي عَلٰى عَمَلٍ إِذَا أَنَا عَمِلْتُهُ أَحَبَّنِيَ اللهُ أَحَبَّنِيَ النَّاسُ قَالَ ازْهَدْ فِي الدُّنْيَا يُحِبَّكَ اللهُ وَازْهَدْ فِي مَا عِنْدَ النَّاسِ يُحِبَّكَ النَّاسُ۔

(رواہ الترمذی وابن ماجہ)

(ترجمہ) سہل بن سعد سے روایت ہو کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں ایک شخص حاضر ہوا اور عرض کیا یا رسول اللہ! مجھے ایسا کوئی عمل بتلائیے کہ جب میں اس کو کروں تو اللہ بھی مجھ سے محبت کرے اور اللہ کے بندے بھی مجھ سے محبت کریں ـــــ آپ نے فرمایا کہ دُنیا کی طرف سے اعراض اور بے رُخی اختیار کر لو تو اللہ تعالیٰ تم سے محبت کرنے لگے گا اور جو (مال و جاہ) لوگوں کے پاس ہو اُس سے اعراض اور بے رُخی اختیار کر لو تو لوگ تم سے محبت کرنے لگیں گے۔ (ترمذی وابن ماجہ)

(تشریح) یہ واقعہ ہو کہ دنیا کی محبت اور چاہت ہی آدمی سے وہ سارے کام کراتی ہو جن کی وجہ سے وہ خدا کی محبت کے لائق نہیں رہتا، اس لیے اللہ کی محبت حاصل کرنے کی راہ یہی ہو کہ دنیا کی چاہت اور رغبت دل میں نہ رہے ـــــ جب دنیا کی محبت دل سے نکل جائے تو دل اللہ کی محبت کے لیے فارغ ہو جائے گا اور پھر اس کی اطاعت اور فرمانبرداری ایسی خالص ہونے لگے گی کہ وہ بندہ اللہ کو محبوب اور پیارا ہو جائے گا۔

اسی طرح جب کسی بندہ کے متعلق عام طور سے لوگ یہ جان لیں کہ یہ ہماری کسی چیز میں حصہ

نہیں چاہتا اور نہ یہ مال کا طالب ہو، نہ کسی عہدہ اور منصب کا، تو پھر لوگوں کا اس سے محبت کرنا گویا انسانی فطرت کا لازمہ ہو۔

(فائدہ) زہد کے بارہ میں یہ ملحوظ رہنا چاہیے کہ جس شخص کے لیے دنیا کی لذتیں اور راحتیں حاصل کرنے کے مواقع ہی نہ ہوں، اور اس مجبوری کی وجہ سے وہ دنیا میں عیش نہ کرتا ہو، وہ زاہد نہیں ہو، زاہد وہ ہو جس کے لیے دنیا کے عیش و تنعم کے پورے مواقع میسر ہوں مگر اس کے باوجود وہ اس سے دل نہ لگائے، اور متنعّمین کی سی زندگی نہ گزارے ــــــ کسی شخص نے حضرت عبداللہ بن مبارک کو زاہد کہہ کے پکارا، انھوں نے فرمایا کہ زاہد تو عمر بن عبدالعزیز تھے کہ خلیفۂ وقت ہونے کی وجہ سے دُنیا گویا اُن کے قدموں میں تھی لیکن انھوں نے اُس سے حصہ نہیں لیا۔

(۴۲) عَنْ اَبِیْ هُرَیْرَةَ وَاَبِیْ خَلَّادٍ اَنَّ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ قَالَ اِذَا رَاَیْتُمُ الْعَبْدَ یُعْطٰی زُهْدًا فِی الدُّنْیَا وَقِلَّةَ مَنْطِقٍ فَاقْتَرِبُوْا مِنْهُ فَاِنَّهٗ یُلَقَّی الْحِکْمَةَ ــــــ (رواہ البیہقی فی شعب الایمان)

(ترجمہ) حضرت ابوہریرہ اور ابو خلاد سے روایت ہو کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا، جب تم کسی بندہ کو اس حال میں دیکھو کہ اُس کو زُہد یعنی دُنیا کی طرف سے بے رغبتی و بے رُخی اور کم سخنی (یعنی لغو اور فضول باتوں سے زبان کو محفوظ رکھنے کی صفت) اللہ نے نصیب فرمائی ہو تو اس کے پاس اور اس کی صحبت میں رہا کرو، کیونکہ جس بندے کا یہ حال ہوتا ہو اُس کو اللہ تعالٰے کی طرف سے حکمت کا القا ہوتا ہو۔ (شعب الایمان بیہقی)

(تشریح) حکمت کے القا ہونے کا مطلب یہ ہو کہ وہ حقیقتوں کو صحیح طور پر سمجھتا ہو اور اُس کی زبان سے وہی باتیں نکلتی ہیں جو صحیح اور نافع ہوتی ہیں۔ اس لیے اس کی صحبت کیمیا اثر ہوتی ہو۔ قرآن مجید میں حکمت کے بارہ میں فرمایا گیا ہو کہ "وَمَنْ یُّؤْتَ الْحِکْمَةَ فَقَدْ اُوْتِیَ خَیْرًا کَثِیْرًا" (جس کو حکمت عطا کی جائے اس کو خیر کثیر عطا کیا گیا)۔

(۴۳) عَنْ اَبِیْ ذَرٍّ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ مَا زَهِدَ عَبْدٌ فِی الدُّنْیَا اِلَّا اَنْبَتَ اللّٰهُ الْحِکْمَةَ فِیْ قَلْبِهٖ وَ انطق بها لسانه وبصّره عیب الدُّنْیَا وَداءها ودواءها اخرجه

منھا سالما الی دار السلام ——— (رواہ البیہقی فی شعب الایمان)

(ترجمہ) حضرت ابوذر غفاری سے روایت ہو کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جو بندہ بھی زہد اختیار کرے (یعنی دنیا کی رغبت و چاہت اپنے دل سے نکال دے اور اس کی خوش عیشی و خوش باشی کی طرف سے بے رغبتی اور بے رخی اختیار کرلے) تو اللہ تعالیٰ ضرور اس کے دل میں حکمت کو اگائے گا اور اسکی زبان پر بھی حکمت کو جاری کرے گا۔ اور دنیا کے عیوب اور اس کی بیماریاں اور پھر اس کا علاج معالجہ بھی اس کو آنکھوں سے دکھادے گا، اور دنیا سے اس کو سلامتی کے ساتھ نکال کر جنت میں پہونچادے گا۔

(شعب الایمان بیہقی)

(تشریح) اوپر کی حدیث سے بھی معلوم ہوا تھا کہ دنیا میں جو شخص زہد اختیار کرے، اللہ تعالیٰ کی طرف سے اس کو حکمت القا کی جاتی ہو۔ حضرت ابوذر غفاری کی اس حدیث سے اس کی اور زیادہ تفصیل اور تشریح معلوم ہوئی، اس حدیث میں "اَنْبَتَ اللّٰهُ الْحِكْمَةَ فِىْ قَلْبِهٖ" (اللہ اس کے دل میں حکمت اگاتا ہو) کے بعد جو کچھ فرمایا گیا ہو وہ گویا اسی حکمت کی تفصیل و تشریح ہو، اور مطلب یہ ہو کہ زہد اختیار کرنے والوں کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے اسی دُنیا میں پہلا نقد صلہ یہ ملتا ہو کہ اللہ تعالیٰ ان کے قلوب میں حکمت اور معرفت کا تخم ڈال دیتا ہو جو اللہ تعالیٰ کی خاص عنایت سے نشو ونما پاتا رہتا ہو، اور ترقی کرتا رہتا ہو اور پھر اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہو کہ ان کی زبانوں سے حکمت ہی کا چشمہ جاری رہتا ہو، اور دنیا کے عیوب و امراض گویا اُن کو آنکھوں سے دکھا دیے جاتے ہیں۔ اور ان کے علاج معالجہ میں بھی ان کو خاص بصیرت عطا ہوتی ہو —— اور دوسرا خاص انعام ان بندوں پر یہ ہوتا ہو کہ ان کو ایمان اور تقویٰ کی سلامتی کے ساتھ اللہ تعالیٰ اس دنیا سے اٹھاتا ہو اور وہ اس فانی دنیا سے نکال کر جاودانی عالم میں یعنی دار السلام جنت میں پہونچا دیے جاتے ہیں۔

(۱۴۴) عَنْ مُعَاذِ بْنِ جَبَلٍ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ لَمَّا بَعَثَ بِهٖ اِلَى الْيَمَنِ قَالَ اِيَّاكَ وَالتَّنَعُّمَ فَاِنَّ عِبَادَ اللّٰهِ لَيْسُوْا بِالْمُتَنَعِّمِيْنَ۔

(رواہ احمد)

(ترجمہ) حضرت معاذ بن جبل سے روایت ہو کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جب ان کو یمن کی طرف روانہ کیا تو نصیحت فرمائی کہ "معاذ! آرام طلبی اور خوش عیشی سے بچتے رہنا، اللہ کے خاص بندے آرام طلب

اور خوش عیش نہیں ہوتے۔ (مسند احمد)

(تشریح) دنیا میں آرام و راحت اور خوش عیشی کی زندگی گزارنا اگرچہ حرام اور ناجائز نہیں ہو لیکن اللہ کے خاص بندوں کا مقام یہی ہو کہ وہ دنیا میں تنعم کی زندگی اختیار نہ کریں۔ اَللّٰھُمَّ لَاعَیْشَ اِلَّا عَیْشُ الْاٰخِرَۃِ۔

(۴۵) عن ابن مسعود قال تلا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم "فَمَنْ یُرِدِ اللہُ اَن یھدیہ یشرح صدرہ للاسلام" فقال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ان النور اذا دخل الصدر انفسح فقیل یا رسول اللہ ھل لتلک من عَلَمٍ یُعْرَفُ بہ قال نعم التجافی من دار الغرور والانابۃ الی دار الخلود والاستعداد للموت قبل نزولہ۔

(رواہ البیہقی فی شعب الایمان)

(ترجمہ) حضرت عبداللہ ابن مسعود سے روایت ہو کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ آیت تلاوت فرمائی "فَمَنْ یُرِدِ اللہُ ان یھدیہ یشرح صدرہ للاسلام" جس کا مطلب یہ ہو کہ جس کے لیے اللہ تعالیٰ ارادہ کرتا ہو کہ اس کو اپنی راہ پر لگائے (اور اپنی رضا اور اپنا قرب نصیب فرمائے) تو کشادہ کر دیتا ہو، اس کا سینہ اسلام کے لیے، (یعنی عبدیت اور اللہ تعالیٰ کی فرمانبرداری والی زندگی کے لیے اس کا دل کھول دیا جاتا ہو) یہ آیت تلاوت فرمانے کے بعد اس کی تفصیل اور تشریح کرتے ہوئے آپ نے فرمایا کہ نور جب سینہ میں آتا ہو تو سینہ اس کی وجہ سے کھلتا ہو — عرض کیا گیا یا رسول اللہ کیا اس حالت کی کوئی علامت بھی ہو جس سے اسکو پہچانا جائے، آپ نے فرمایا کہ ہاں! دنیا جو دھوکے فریب کی جگہ ہو اس سے طبیعت کا ہٹ جانا اور اُچاٹ ہو جانا (یعنی زندگی میں زہد کی صفت آجانا) اور آخرت جو ہمیشہ قیام کی جگہ ہو طبیعت کا اسکی طرف رجوع ہو جانا اور موت کے آنے سے پہلے اس کی تیاری میں لگ جانا (یعنی توبہ و استغفار، اور معاصی سے اجتناب اور عبادت کی کثرت کے ذریعہ موت کی تیاری کرنا)

(تشریح) مطلب یہ ہو کہ اللہ تعالیٰ اپنے جس بندہ کو اپنی خاص عبدیت سے نوازنے کا ارادہ کرتا ہو تو اس کے دل میں ایک خاص نور اور جذبۂ ربانی پیدا کر دیتا ہو، جس سے اس کا سینہ عبدیت والی زندگی کے لیے کھل جاتا ہو اور پھر اس کے نتیجہ میں دنیا سے بے رغبتی و بے رخی اور آخرت کی فکر اور اللہ تعالیٰ کی لقا اور جنت کا شوق، اور اس کی تیاری۔ یہ ساری چیزیں اُس کی زندگی میں اُبھر جاتی ہیں۔ اور ان کے ذریعہ اس بات کو جانا جا سکتا ہو کہ اس بندہ کو وہ خاص نور نصیب ہو گیا، اور جذبۂ ربانی اس کے دل میں ڈال دیا گیا ہو۔

علامہ سید سلیمان ندوی
اور
علوم قرآن

از مولانا اویس صاحب ندوی

حضرت مولانا سید سلیمان ندوی رحمۃ اللہ علیہ کی وفات پر اُن کی خدمات کے تذکرہ اور اُن کے چھوڑے ہوئے کاموں کو آگے بڑھانے کی تحریک کی غرض سے "دار العلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ" میں جو اجتماع منعقد ہوا تھا، یہ مقالہ اسی اجتماع میں پڑھا گیا تھا ——— ہم محترم مقالہ نگار اور داعی اجتماع مولانا ابو الحسن علی صاحب حسنی ندوی کے ممنون ہیں کہ انھوں نے الفرقان میں اس کی اشاعت کی اجازت مرحمت فرمادی ہے اس اجتماع کے تمام مقالے عنقریب ندوہ کی طرف سے یکجا بھی شائع ہوں گے ——— ادارہ

آج دار العلوم کی عمارت میں یہ علمی اجتماع ہے، ملک کے اطراف وجوانب سے اہل ذوق زحمت فرما کر تشریف لائے ہیں۔ نگاہیں اس پیکر خوبی کو تلاش کر رہی ہیں، جس کا وجود ایسی ادبی محفلوں کے لئے باعث رونق ہوتا تھا۔

یہ ارباب علم وفضل، اسی کے فراق میں ملول وغمگین ہیں، ان کے قلوب اسی کی یاد میں اندوہ گیں ہیں، ان کو اپنی علمی مجلسیں سُونی معلوم ہوتی ہیں۔

یہ حالت ہو گئی ہے ایک ساقی کے نہ ہونے سے
کہ خُم کے خُم بھرے ہیں اور میخانہ خالی ہے

اللہ تعالیٰ کی قدرت اور حکمت کے معاملات عجیب وغریب ہیں، چشم زدن میں کیا سے کیا ہو جاتا ہے؟ کل تک جو دوسرے رجالِ علم ودین کی موت پر اظہار رنج وغم کیا کرتا تھا، آج تمام عالم اسلام اسی کی موت پر نوحہ خواں ہے۔ کل تک جو سلف کے علوم کا داعی، ان کی نشر واشاعت کا ذمہ دار، اور نئی نسلوں سے اُن کو روشناس کرانے کا فرض انجام دیتا تھا۔ آج خود اس کے علوم کی نشر واشاعت اور ان کے بقاء وتحفظ کا سوال درپیش ہے

ڈھونڈھ رہی ہے آج اک ٹوٹی ہوئی مینا اُسے
کل تلک گردش میں جس ساقی کے پیمانے رہے

اللہ تبارک وتعالیٰ نے حضرۃ الاستاذ رحمۃ اللہ علیہ کو جن علمی کمالات سے سرفراز فرمایا تھا اگر انکا تجزیہ کیا جائے تو سیرت، تاریخ، ادب، علم کلام، اور قرآن مجید ان کے خاص علوم قرار پائیں گے، مگر ان علوم میں بھی قرآن مجید کی حیثیت اساسی تھی، ان کے تمام علوم بنیادی طور پر اسی محور کے اردگرد گردش کرتے تھے، اُن کی سیرت اور ان کے علم کلام کا ماخذ قرآن مجید ہی تھا ان کا عربی علم ادب، قرآن مجید ہی کا خدمت گزار تھا۔ اشخاص ممالک اور علوم کی تاریخ پر ان کی نظر بہت گہری تھی مگر درحقیقت ان کی زندگی کا حقیقی مونس وہمدم قرآن مجید ہی تھا۔

خوب اچھی طرح یاد ہے کہ راقم سطور، دار العلوم کے درجہ ہفتم میں پڑھتا تھا، نصاب میں حضرت شاہ ولی اللہ صاحبؒ کی حجۃ اللہ البالغہ تھی، سید صاحب علاج کی غرض سے لکھنؤ تشریف لانے والے تھے اور دو ماہ قیام کا ارادہ تھا، اس لیے منتظمین دار العلوم کو دار المصنفین سے اطلاع ملی کہ حجۃ اللہ البالغہ کے اسباق نہ شروع کرائے جائیں، میں خود اپنے زمانۂ قیام میں پڑھاؤں گا، سید صاحب تشریف لائے اور حجۃ اللہ البالغہ کے اسباق شروع ہو گئے۔ ہماری پوری جماعت نے شہرت عام کے باعث خیال کیا کہ سید صاحب کا اصل فن تو تاریخ ہے اس لیے سید صاحب سے درخواست کی جائے کہ اس زمانۂ قیام میں تاریخ اسلام کے متعلق ہم لوگوں کو استفادہ کا موقع دیا جائے۔

پوری جماعت خدمت والا میں حاضر ہوئی اور اس آرزو کو ظاہر کیا، سید صاحب نے بڑے درد سے فرمایا کہ آپ لوگ تاریخ کے لیے کہتے ہیں قرآن مجید پڑھنے کے لیے کیوں نہیں کہتے؟۔

اسی طرح میں جب دار المصنفین میں بحیثیت رفیق کے حاضر ہوا تو پہلے ہی دن ارشاد فرمایا کہ تاریخ پر یہاں خوب کام ہوا، اب میں آپ کو خاص اسلامی علوم میں لگانا چاہتا ہوں، پھر قرآن مجید کے سلسلہ کے مختلف کام سپرد فرمائے۔

قدرت کو سید صاحب سے خاص کام لینا تھا اس لیے فطری طور پر ان کے اندر وہ صلاحیتیں ودیعت فرمائی گئی تھیں جن کے ذریعہ قرآنی حقائق آشکارا ہوتے ہیں۔

قرآن مجید سے عالمانہ طرز سے انتفاع اور استفادہ کے لیے پہلی اور ضروری شرط یہ ہے کہ صحیح ایمانی ذوق اور دینی مزاج نصیب میں آئے، اس رفیق کے بغیر اس راہ میں کامیابی کے ساتھ ایک قدم بھی اٹھانا مشکل ہے، اللہ تعالیٰ نے سید صاحب کو اس دولت کا حصہ وافر نصیب فرمایا تھا، اس گراں قدر سرمایہ کے اثرات اُن کی زندگی کے ہر گوشہ میں نمایاں تھے۔

آیات قرآنی کی گرہ کشائی کے لیے دوسری ضروری شرط یہ ہے کہ منصب نبوت سے تمام وکمال واقفیت ہو اور عہد نبوی (صلی اللہ علیہ وسلم) کی پوری علمی، عملی، اخلاقی، اعتقادی اور سیاسی تاریخ سامنے ہو، سید صاحب کی زندگی کا یہی موضوع تھا،

اس منزل کو طے کرنے کے لیے تیسری شرط یہ ہے کہ عربی زبان پر اس کے لوازم کے ساتھ محققانہ نظر ہو سید صاحب اس فن کے مسلم الثبوت استاد تھے۔

ان تینوں ضروری شرطوں کے ساتھ ساتھ وہ علوم جو فہم قرآن کے لیے ضروری ہیں، سید صاحب اُن کے بھی محقق اور متیقظ عالم تھے۔

توفیق الٰہی سے ان اسباب کی جامعیت نے سید صاحب پر آیات قرآنی کو کھول دیا تھا، وہ کسی آیت کی تشریح میں سلف صالحین کا دامن تو نہیں چھوڑتے تھے۔ مگر عصر حاضر کے مذاق کے مطابق اور موجودہ عہد کی زبان میں اس کی تعبیر اس طرح فرماتے تھے کہ سننے والا یہ سمجھتا تھا کہ اب سے پہلے یہ بات نہیں کہی گئی تھی!

راقم سطور کی بڑی سعادت تھی کہ سید صاحب سے استفادہ کا وہ زمانہ اس کو ملا جب کہ تحقیق و تدقیق کے مسلسل تجربات کے بعد اُن کی آراء اور خیالات میں پختگی پیدا ہو چکی تھی، قرآن مجید کے درس کے دوران میں اس کے آثار برابر ظاہر ہوتے تھے۔

مجھ کو سید صاحب سے قرآن مجید تین طرح سے پڑھنے کا موقع ملا۔ سب سے پہلے سید صاحب نے اپنے وطن دیسنہ (ضلع پٹنہ) میں احکام کی آیات کا درس دیا۔ ان کے پاس ایک کاپی پر قرآن مجید کے احکام کی آیتیں درج تھیں، فرمایا کرتے تھے کہ مولانا شبلی مرحوم نے ان آیات کو جمع کرایا تھا، یہ آیتیں مکمل نہ تھیں، سید صاحب نے فرمایا کہ ترتیب فقہی پر ہر باب کے ماتحت آیات کو جمع کیا جائے، جب آیات جمع ہو گئیں تو سید صاحب نے ان آیات کی تشریح فرمائی اور اس سلسلہ میں اپنے خاص افادات سے سرفراز فرمایا، آیات احکام کے درس کے موقع پر جصاص رازی اور ابن العربی مالکی کی احکام القرآن کے مطالعہ کی برابر تاکید فرماتے رہے۔

ان مسائل کی تشریح کے وقت سید صاحب نے یہ خیال بھی ظاہر فرمایا کہ قرآن مجید کی فقہ پر ایک کتاب تیار کی جائے اور جس طرح سیرت کی پانچویں جلد میں عبادات پر بحث کی گئی ہے اسی طرح تمام فقہی ابواب کی تشریح و تفصیل کی جائے، حاصل یہ کہ کلامی طرز پر فقہی مسائل کی ترتیب و تدوین ان کے مدنظر تھی!

اس کے بعد جب مخدومی مولانا مسعود علی صاحب ندوی مدظلہ کی شفقت اور توجہ نے مجھ کو دار المصنفین

پہونچایا تو سید صاحب نے پہلے قرآن مجید کے کلامی مباحث سمجھائے اور اس وقت یہ راز کھلا کہ سید صاحب پر "عقلیت" کا نہیں بلکہ "سلفیت" کا غلبہ ہے اور ان کا مسلک "تاویل" نہیں بلکہ "تفویض" ہے۔

اس سلسلہ کی ایک بات آج بھی یاد ہے، دار المصنفین کی مسجد میں حسب معمول ظہر کی نماز کے بعد درس ہو رہا تھا، قرآن مجید کے کلامی مسائل پر سید صاحب تقریر فرما رہے تھے، دو مشہور مصنفوں کی کتابیں جن میں تاویلات پر بہت زور دیا گیا تھا سامنے کھلی ہوئی تھیں، سید صاحب نے بڑی برہمی کے ساتھ ان کو بند فرمادیا اور کہا کہ یہ سب ظنون وادہام ہیں۔

کلامی سلسلہ کے بعد بالکل ابتداء سے قرآن مجید کا درس شروع ہوا، اور چھ سال میں بیس پارہ ہوئے اس مدت میں سید صاحب نے کیسے کیسے افادات سے نوازا؟ قرآن مجید کے کن کن علوم کی طرف متوجہ فرمایا؟ لفظی اور معنوی مشکلات کو کس کس طریقہ سے حل فرمایا؟ افسوس کہ اس مختصر وقت میں ان تفصیلات کی گنجائش نہیں ہے مثال کے طور پر صرف تین باتیں پیش کی جاتی ہیں!

(۱) قرآن مجید کی آیات سے معلوم ہوتا ہے کہ کفار نے حضرت نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے معجزات طلب کیے اور بار بار مطالبہ کیا کہ اگر یہ پیغمبر برحق ہیں تو معجزات کیوں نہیں دکھلاتے ہیں؟ کفار کے اس مطالبہ کے جواب میں پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے اعراض برتا جاتا ہے۔ اس موقع پر بعض نافہم یہ شبہ کرتے ہیں کہ حضرت نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس معجزات ہی نہ تھے ورنہ کفار کے اصرار کے بعد تاخیر یا انکار کی کیا وجہ تھی؟

سید صاحب نے پوری تفصیل کے ساتھ قرآن مجید کی تمام متعلقہ آیات کو پیش فرماکر ثابت کیا کہ معجزات کی تاخیر یا انکار کا سبب یہ نہ تھا کہ نعوذ باللہ حضور (صلی اللہ علیہ وسلم) کے پاس معجزات نہ تھے بلکہ سات اسباب ہیں جو معجزہ میں تاخیر یا انکار کا باعث تھے، ان ساتوں اسباب کو قرآن مجید سے مدلل فرمایا۔ ان میں سے ایک سبب یہ بھی ارشاد فرمایا کہ سنۃ اللہ یہ ہے کہ جب قوم معجزہ کا مطالبہ کرتی ہے اور نبی اس معجزہ کو خدا کے حکم سے ظاہر فرماتے ہیں، پھر بھی اگر قوم ایمان نہیں لاتی ہے تو اس نافرمانی کے نتیجہ میں ہلاک کردی جاتی ہے، اس لیے پیغمبر کا معجزہ میں تاخیر کرنا یا اس سے اعراض کرنا امت پر شفقت کی وجہ سے ہوتا ہے! اس تحقیق کے بعد غور فرمائیے کہ شبہہ کا کیا موقع باقی رہ جاتا ہے!

(۲) اسی طرح قرآن مجید میں جب تک وارثوں کے حقوق کی تعیین نہیں کی گئی تھی مسلمان آیت وصیت پر عمل کرتے تھے وہ جن کو مناسب سمجھتے تھے ان کے حق میں اپنے مال واسباب کے متعلق وصیت کردیتے تھے، آیت میراث کے نازل ہونے کے بعد یہ صورت باقی نہ رہی اس لیے عموماً مفسرین آیت وصیت کو آیت میراث سے منسوخ مانتے ہیں

سید صاحب فرماتے تھے کہ اصل یہ ہے کہ ابتدائے اسلام میں مسلمانوں کا کوئی خاندانی نظام نہ تھا، باپ مسلمان ہے تو بیٹا غیر مسلم، شوہر مسلمان ہے تو بیوی غیر مسلمہ، وقس علی ہذا۔

اس صورت میں میراث کی تعیین ممکن نہ تھی جب مسلمان مدینہ آگئے تو مواخاۃ کی بنیاد پر میراث تقسیم ہونے لگی، مگر جب جمعیت بڑھی اور خاندانی نظام قائم ہو گیا تو آیت میراث نازل ہوئی اور اس پر عمل آسان ہو گیا، اس لئے آیت وصیت کو منسوخ ماننے کی ضرورت نہیں ہے۔ بلکہ اس کا تعلق حالات سے ہے۔ خدانخواستہ اگر اب بھی ایسے حالات پیدا ہو جائیں کہ کہیں مسلمانوں کا نظام عائلی باقی نہ رہے تو ان کے لئے آیت وصیت سے استفادہ اب بھی ممکن ہے۔ اور نہ آیت میراث تو موجود ہی ہے اور یوں بھی آیت وصیت محجوب الارث کے حق میں مفید ہے اس لئے آیت وصیت کو منسوخ ماننا ضروری نہیں ہے۔!

(۳) سورہ بقرہ کی ایک آیت ہے۔

ان الذین اٰمنوا والذین ھادوا والنصاریٰ والصابئین من اٰمن باللہ والیوم الاٰخر وعمل صالحاً فلھم اجرھم عند ربھم ولا خوف علیھم ولا ھم یحزنون (بقرہ ۸)	بے شک جو لوگ مسلمان ہوئے اور جو لوگ یہودی ہوئے اور نصاریٰ اور صابئین (ان میں سے) جو ایمان لایا اللہ پر اور قیامت کے دن پر، اور نیک کام کیے تو ان کے لئے ان کا ثواب ان کے رب کے پاس ہے ان پر کچھ خوف نہیں اور نہ وہ غمگین ہوں گے۔

اسی مفہوم کی ایک آیت سورۂ مائدہ ۵ میں بھی ہے!

اس آیت کے آخری ٹکڑے سے بعض نافہموں کو یہ شبہہ ہوا کہ یہود، نصاریٰ اور صابئین اپنے دین پر قائم رہتے ہوئے اگر خدا اور قیامت کے دن پر یقین رکھتے ہیں اور اعمال صالحہ بھی کرتے ہیں تو وہ نجات پائیں گے!

ابھی چند سال ہوئے اس موضوع پر بڑی بحثیں ہو چکی ہیں!

سید صاحب اس آیت کی تشریح اس طرح فرماتے تھے کہ شبہہ کی گنجائش ہی نہیں باقی رہتی ہے، فرماتے تھے کہ ایمان باللہ ایک قرآنی اصطلاح ہے، اس میں ایمان بالملائکہ، ایمان بالکتب ایمان بالرسل سب داخل ہیں مقام اجمال میں صرف ایمان باللہ کا ذکر کیا جاتا ہے اور مراد پورا سلسلہ ایمانیات ہوتا ہے اور مقام تفصیل میں ایمانیات

کے ہر جزو کو ظاہر فرمادیا جاتا ہے، اس تحقیق میں سورہ تغابن رکوع (۱) اور سورہ نساء رکوع (۲۱) سے استدلال فرماتے تھے، اسی کی تائید میں حدیث وفد عبدالقیس کو بھی پیش فرماتے تھے کہ حضور (صلی اللہ علیہ وسلم) نے ارشاد فرمایا۔

کیا تم جانتے ہو کہ ایمان باللہ کا مطلب کیا ہے؟ صحابہ نے عرض کیا، کہ اللہ اور اس کا رسول بہتر جانتا ہے، حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ ایمان باللہ نام ہے، لاالہ الااللہ اور محمد رسول اللہ کی شہادت دینے کا۔ والی آخرہ

میری خوشی اور حیرت کی انتہا نہ رہی جب ابن العربی اندلسی کو بھی احکام القرآن سورہ حم سجدہ میں آیت ان الذین قالوا ربنا اللہ، ثم استقاموا۔ کے ذیل میں سید صاحب کا ہم خیال پایا۔

مختصر یہ کہ اسی قسم کے لطائف قرآنیہ سے درس قرآن کی مجلس معمور و منور رہا کرتی تھی۔

قرآن مجید کے مسائل کے سوا اس کے لغات، مصادر اور نحوی ترکیبوں پر بھی سید صاحب کافی توجہ فرماتے تھے اور اس سے مفہوم کی تعیین میں بڑی مدد لیتے تھے۔

ایک مثال ملاحظہ ہو۔

شرع اسلام میں دستور تھا کہ روزہ کے دنوں میں راتوں کو بھی میاں بیوی الگ رہتے تھے، بعض طبائع کو اس میں زحمت محسوس ہوتی تھی اس لیے قرآن مجید نے اس میں آسانی پیدا فرمادی اور یہ قید صرف دن کے لیے باقی رہ گئی، سورۂ بقرہ میں اسی مضمون کے بیان کے موقع پر فرمایا۔

عَلِمَ اللّٰهُ اَنَّكُمْ كُنْتُمْ تَخْتَانُوْنَ اَنْفُسَكُمْ — خدا جانتا تھا کہ تم اپنے نفس سے خیانت کرتے تھے۔

سید صاحب فرماتے تھے کہ خیانت کے سلسلہ میں جمع کا صیغہ استعمال ہوا ہے اس سے معلوم ہوا کہ اس خیانت کا تعلق جماعت سے تھا، دوسری بات یہ ہے کہ اس طرز ادا سے استمرار کا مفہوم بھی پیدا ہوتا ہے، تو کیا یہ سمجھا جائے کہ ایک جماعت میں یہ خیانت نفس جاری تھی؟

خود ہی ارشاد فرمایا کہ میری سمجھ میں یہ آتا ہے کہ لفظ "تختانون" "اختیان" سے ہے اور اختیان کے معنی خیانت کرنے کے نہیں بلکہ خیانت کی خواہش پیدا ہونے کے ہیں، مطلب یہ ہوا کہ یہ حکم بعض طبائع کے لیے پر از مشقت تھا اس لیے ان کے دلوں میں وساوس نفسانی پیدا ہوتے تھے، اگو وہ اس پر عمل نہ کرتے ہوں۔

اپنی اس تحقیق کے ظاہر فرمانے کے بعد سید صاحب نے فرمایا کہ کتابوں میں اس کو تلاش کرو، بالآخر امام راغب

کی مفردات میں بعینہ یہی بات مل گئی اور سید صاحب بیحد خوش ہوئے!

ایک بار درس قرآن کے موقع پر لفظ حنیف کی تشریح کرتے ہوئے ارشاد فرمایا کہ کتب احادیث میں نبوت سے قبل کے سلسلہ میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق ایک لفظ "یتحنث" آتا ہے جس کا ترجمہ یہ کیا جاتا ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم عبادت کیا کرتے تھے۔ فرمایا کہ میرے ذوق میں یہ لفظ اصل میں "یتحنف" ہے یعنی حضور صلی اللہ علیہ وسلم دین حنیفی (ابراہیمی) کی پیروی فرمایا کرتے تھے۔

اتفاق کی بات، میں کسی ضرورت سے ابن کثیر کی البدایہ والنہایہ جلد ثالث ص۵ دیکھ رہا تھا اس میں ابن الاعرابی کے حوالہ سے یہی قول درج ہے، میں نے سید صاحب کے ملاحظہ میں پیش کیا حسب معمول تبسم فرمایا اور اظہار طمانیت فرمایا

سید صاحب نے بائبل کا مطالعہ بہت غور و خوض سے کیا تھا، دار المصنفین میں بائبل کا جو نسخہ ان کے زیر مطالعہ تھا اس کے شروع سادہ اوراق حوالوں سے بھرے ہوئے تھے، قرآن مجید کی ان آیات کی تحقیق میں جن کا تعلق اہل کتاب سے تھا اس مطالعہ سے وہ بیحد فائدہ اٹھاتے تھے، مثلاً قرآن مجید میں یہود کا ایک قول نقل ہے۔

وقالوا قلوبنا غلف،

ہمارے مفسرین عموماً اس کا مطلب یہ بیان کرتے ہیں کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے یہود نے کہا کہ ہمارے دل تنگ ہیں اس لیے آپ کی بات ہماری سمجھ میں نہیں آتی ہے، سید صاحب فرماتے تھے کہ مفسرین کا یہ قول باعتبار مقصد اور مطلب کے صحیح ہے مگر درحقیقت یہ لفظ یہود کا ایک محاورہ ہے ایسے ہی مواقع پر وہ لفظ نامختون بولتے تھے جیسکے حوالے اعمال باب ۷-۱۰-۱۱- اور رومیوں باب ۲ میں موجود ہیں، غلف اسی مفہوم کا عربی ترجمہ ہے!

درس قرآن کے سلسلہ میں تفسیر طبری اور تفسیر روح المعانی سید صاحب کے پیش نظر رہا کرتی تھی، طبری کو بیحد پسند فرماتے تھے اور کہتے تھے کہ اس کی تالیف کے وقت تک قرآن مجید کی جو خدمت کی گئی تھی سب اس میں جمع کر دی گئی ہے نحوی مشکلات میں مغنی اللبیب ملاحظہ فرماتے اور کبھی کبھی ابوحیان کی البحر المحیط کی طرف بھی مراجعت فرماتے تھے۔

حضرت شاہ عبدالقادر صاحبؒ کے فوائد قرآنیہ کی ان کی نگاہوں میں بڑی اہمیت تھی، اس عہد کے علماء میں مولانا حمید الدین صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے قرآنی ذوق سے بے حد متاثر تھے اور فرمایا کرتے تھے کہ مولانا مضامین سفینوں سے نہیں بلکہ سینہ سے لاتے ہیں!

جمہور کے مسلک کی پابندی کا بے حد اہتمام تھا، ایک بار مجھ سے فرمایا کہ میں پچاس سال کی تصنیفی زندگی کے تجربہ کے بعد آپ کو نصیحت کرتا ہوں کہ کسی تحقیق میں جمہور امت سے علیحدگی نہ ہو، فرمایا کہ ہر محقق کے کچھ تفردات ہوتے ہیں مگر یہ

تفردات حسن قبول نہیں پاتے ہیں۔ اگران تفردات پر زور دیا جاتا ہے تو اس کے سوا اور کچھ نتیجہ نہیں کہ نظم ملت میں فرق پڑتا ہے!

قرآن مجید کے درس کا طریق یہ تھا کہ جو آیت زیر درس ہوتی، اس مفہوم کی تمام آیات کو جمع فرماتے، ان کا قرآن مجید آیات کے حوالوں سے بھرا ہوا تھا تمام آیات کو سامنے رکھ کر، سیاق و سباق کا لحاظ فرماتے ہوئے مفہوم معین فرماتے اور اسکو سنت اور اقوال سلف سے مدلل فرماتے!

قرآن مجید کی آیات کے باہمی ربط کا خاص خیال تھا، اور جب طبع سلیم کا علمی رجحان تصوف کیطرف ہوا تو علمی طرز کے صوفیانہ لطائف و نکات کی طرف بھی ذہن برابر منتقل ہوتا رہتا تھا، ایک دن ارشاد فرمایا کہ بتلایئے! حضرات صوفیہ کی نسبت مصطلحہ کا قرآن مجید کی کس آیت سے استنباط ہو سکتا ہے؟ پھر خود ہی ارشاد فرمایا کہ میرے خیال میں آیت "رضی اللہ عنہم ورضوا عنہ" اس نسبت کا حاصل ہے!

اس زمانہ میں قرآن فہمی کی وبا چل پڑی ہے، جس نے عربی زبان کی چند کتابیں پڑھ لیں وہ فہم قرآن کا مدعی ہے، سید صاحب اس صورت حال سے بیحد متاثر تھے اور اس کو امت کے حق میں ایک بڑا فتنہ سمجھتے تھے، اس زمانہ کے بعض مشاہیر کی غلطیوں کو بیان فرماتے تھے اور کہتے تھے کہ باقاعدہ تعلیم نہ ہونے کے یہ نتائج ہیں!

بے شبہ سید صاحب نے اپنے بعد قرآن مجید کی کوئی مستقل تفسیر نہیں چھوڑی مگر درحقیقت وہ قرآن مجید کی خدمت ایک نئے انداز سے کرنا چاہتے تھے ان کا خیال تھا کہ اس وقت سخت ضرورت اس بات کی ہے کہ قرآن مجید سے جو علوم مستنبط ہو سکتے ہیں ان کو عصری مذاق کے مطابق الگ الگ منضبط کیا جائے زندگی کے مختلف نظامہائے حیات کے نقشے قرآن اور احادیث صحیحہ سے مرتب کئے جائیں اس نظریہ کے ماتحت سید صاحب نے قرآن مجید کے علوم کا بڑا ذخیرہ سیرۃ نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کے آخری چار جلدوں میں جمع فرما دیا تھا، سیرۃ النبی کی ضخیم جلدوں میں قرآن مجید کو شمع راہ بنا کر سید صاحب نے اسلام کے اہم اور بنیادی مسائل کا ایک ایسا مدلل اور صحیح نظام مرتب فرما دیا جس کی نظیر سلف اور خلف میں نہیں ملتی ہے اور اسی سلسلہ میں آیات قرآنی کی ایسی گرہ کشائی فرمائی کہ پڑھنے والے کو طمانیت قلب اور شرح صدر کی دولت نصیب ہو جاتی ہے سیرۃ النبی صلعم کی تیسری جلد کا موضوع دلائل و معجزات ہیں اس میں معجزات کے سلسلے میں قدیم و جدید فلسفیانہ بحثوں اور بیان معجزات کے سوا آیات و دلائل اور قرآن مجید کے عنوان سے ایک

مستقل باب ہے یہ باب درحقیقت حضرت انبیاء علیہم السلام کی نبوت کی زندگی کے ایک حصہ کی قرآنی تشریح ہے اس باب کو پڑھنے کے بعد معجزات کا ایک مستقل نظام سامنے آتا ہے اور تمام متعلقہ آیات پوری طرح حل ہو جاتی ہیں، آپ اسلامی کتب خانوں کی تمام کتابوں کو پڑھ ڈالیں مگر غالباً اس موضوع پر قرآنی نقطہ نظر سے یہ بحثیں تفسیر کے سوا کہیں نہ ملیں گی۔ بے شبہ شیخ الاسلام ابن تیمیہؒ کی "کتاب النبوات" میں اس طرز کی باتیں ملتی ہیں مگر خوب معلوم ہے کہ سیرت کی اس جلد کی تالیف کے وقت سید صاحب کے پیش نظر یہ کتاب نہ تھی، سیرت کی چوتھی جلد کا موضوع منصب نبوت اور اسلام کے بنیادی عقائد ہیں، یہ جلد بھی درحقیقت قرآن مجید کی متعلقہ آیات کی بے نظیر تشریحات پر مشتمل ہے، نبوت کی حقیقت اور اس کے لوازم و خصوصیات پر امام غزالیؒ نے معارج القدس میں، شاہ ولی اللہ صاحبؒ نے حجۃ اللہ البالغہ میں گفتگو فرمائی ہے اور جو کچھ بیان فرمایا ہے وہ حرف بحرف صحیح ہے مگر گزشتہ زمانے کے مقابلے میں اس دور میں خیالات اسلوب تحریر اور طریقہ استدلال میں فرق آچکا ہے اس لیے سید صاحب کا اس باب میں اصل کارنامہ یہ ہے کہ انھوں نے اس زمانہ کے لوگوں سے ان کی اصطلاح میں گفتگو فرمائی اور جو اصول قائم فرمائے ان پر قرآن مجید سے اس طرح استدلال فرمایا کہ خواص اور علماء سے تحسین و آفریں کی عزت پائی اسی جلد میں سید صاحب نے قرآن مجید کو سامنے رکھ کر تبلیغ نبوی صلی اللہ علیہ وسلم اور اس کے اصول پر ایک بے مثل باب تحریر فرمایا ان مباحث کے بعد پھر پوری جلد اسلام کے بنیادی عقائد یعنی اللہ تعالیٰ پر ایمان، فرشتوں پر ایمان، رسولوں پر ایمان، اللہ کی کتابوں پر ایمان، یوم آخرت پر ایمان، اور عقیدۂ تقدیر پر ایمان کی قرآنی تشریحات پر مشتمل ہے ان مضامین کے ضمن میں قرآن مجید کی بعض اہم آیات کی قابل تشفی تحقیق فرمائی ہے ایک بار خود سید صاحب نے مجھ سے یہ ارشاد فرمایا کہ بتلائیے کسی زبان میں ان مباحث پر اس ترتیب اور قرآنی تشریح کے ساتھ کوئی کتاب موجود ہے؟ جواب ظاہر ہے کہ نفی میں تھا۔

سیرت کی پانچویں جلد عبادات پر مشتمل ہے اس جلد میں سید صاحب نے پہلے کتاب اللہ سے عبادت الٰہی کے مقصد اور مفہوم کو متعین فرمایا پھر عبادات روزہ، نماز، زکوٰۃ، حج اور جہاد کی تفصیل فرمائی، ان کی تدریجی تاریخ اور ان کے مصالح و حکم سے پردہ اٹھایا، مناظرانہ پہلو بچا کر دوسرے مذاہب سے مقابلہ اور موازنہ فرمایا مگر ان تمام مباحث میں بنیاد قرآن ہی رہا اور اس سلسلہ میں بعض مباحث قرآنیہ مثلاً نماز کے اوقات، نماز کی رکعات، سمت قبلہ، ایام روزہ کی تحدید وغیرہ پر ایسی محققانہ گفتگو فرمائی کہ بہت سے عصری فتنوں کا سد باب ہو گیا، آخر میں عبادات قلبیہ تقویٰ، اخلاص، توکل، صبر و شکر کے متعلق آیات قرآنی کو جمع کر کے ان کے حقائق کی پردہ کشائی فرمائی۔

سیرت کی چھٹی جلد کا موضوع اخلاق ہے، اس سلسلہ میں سید صاحب کا بے نظیر کارنامہ یہ ہے کہ انھوں نے

قرآن مجید سے اسلام کا اخلاقی فلسفہ مرتب فرمایا جو اپنے طرز کی بالکل پہلی چیز ہے، اس کے بعد حقوق، فضائل اخلاق، رذائل اور آداب کے ابواب مقرر فرمائے اور ان عنوانات کے تحت میں اسلام کی تعلیمات اخلاقی کی تشریح فرمائی ان تمام مواقع پر قرآن پاک کے استناد کو آگے رکھا اور اسی کے پرتو میں احادیث صحیحہ کو واضح فرمایا۔ سیرۃ النبی صلعم کے اس اجمالی تعارف سے اندازہ ہوا ہوگا کہ سیرت کا موضوع حضرت نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی حیات مبارکہ کے واقعات کا محض استقصاء نہیں ہے بلکہ اس سلسلہ میں قرآن مجید کو سامنے رکھ کر اسلام کے بنیادی مسائل کی حکیمانہ تشریح کی گئی ہے اور قرآن مجید کے علوم کو مختلف ابواب و عنوانات میں پھیلایا گیا ہے۔

سیرت النبی صلعم کی ساتویں جلد ناتمام رہی ورنہ اہل علم کی نگاہوں کے سامنے سید صاحب کے علوم قرآن کا ایک اہم دفتر سامنے آتا آہ ـــــ استاذ مرحوم۔

زمانہ بڑے غور سے سُن رہا تھا
تمہیں سو گئے داستاں کہتے کہتے

سید صاحب کے علوم قرآن کا یہ وہ ذخیرہ ہے جو سیرت کے اوراق میں موجود ہے اس کے سوا دوسری حیثیتوں سے بھی سید صاحب نے قرآن مجید کی بلند پایہ خدمتیں انجام دیں۔ اس کا مختصر حال بھی سُن لینا ضروری ہے۔

(۱) قرآن مجید میں بیسوں قوموں، شہروں اور مقامات کے نام آئے ہیں عجیب بات ہے کہ تیرہ سو برس کی مدت میں ان کی تاریخ پر کسی نے قلم نہیں اٹھایا اللہ تعالیٰ نے سید صاحب کو توفیق نصیب فرمائی اور انھوں نے دو جلد و میں ارض القرآن کے نام سے ایک کتاب لکھ کر اسلامی علوم میں ایک ایسے علم کا اضافہ فرمایا جس سے قرآن مجید کی صداقت اور معترضین کی لغزش آشکارا ہو گئی۔

(۲) فرقہ معتزلہ میں ابو مسلم اصفہانی ایک متبحر عالم گزرے ہیں جو اپنی جماعت میں قرآن مجید کی تحقیق میں ممتاز تھے مگر ان کی کوئی تفسیر اب موجود نہیں ہے البتہ امام رازی کی تفسیر میں ان کی رائیں اور ان کی تحقیقات درج ہیں۔ سید صاحب نے دار المصنفین کے ایک رفیق کے ذریعہ ان کو جمع کرایا اور تفسیر ابو مسلم اصفہانی کے نام سے اس کو شائع فرمایا۔

(۳) قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ نے مختلف مقامات پر مختلف چیزوں کی قسمیں کھائی ہیں۔ قرآنی علوم میں اقسام القرآن کے نام سے یہ قسمیں ایک مستقل فن قرار پا گئی ہیں اس پر مستقل کتابیں لکھی گئی ہیں۔ مولانا حمید الدین فراہی نے اس عنوان پر ایک محققانہ کتاب تحریر فرمائی تھی سید صاحب نے ایک مقدمہ لکھ کر مصر سے اس کتاب کو شائع کرایا۔

(۴) حافظ ابن قیمؒ کو فہم قرآن میں ایک خاص امتیاز حاصل ہے مگر چند سورتوں کی تفسیر کے سوا ان کی مستقل تفسیر

نہیں ملتی البتہ اُن کی تصانیف میں بے شمار تفسیری آیات موجود تھیں سید صاحب کے اشارے و تائید سے ان تمام تفسیری آیات کا ایک مجموعہ تیار ہوا اور دو تین برس ہوئے کہ پانچسو صفحات میں چھپ کر مصر سے "التفسیر القیم" کے نام سے یہ کتاب شائع ہوئی۔ ان مطبوعہ چیزوں کے سوا سید صاحب کی ہدایت و نگرانی میں قرآن مجید کی بعض اور خدمتیں بھی انجام پائیں جو ابھی طبع ہو کر منظر عام پر نہیں آسکی ہیں مگر وہ سُننے کے لائق ہیں"

(۱) سید صاحب فرماتے تھے کہ جب میں دارالعلوم میں ادب کا مدرس تھا اس وقت سے میرا خیال تھا کہ معانی بلاغت کی کتابوں میں مثال کے طور پر جن آیات کو پیش کیا گیا ہے اور اُن کے لطائف ادبیہ کو واضح کیا گیا ہے اگر ان کو جمع کر دیا جائے اور سورتوں کی ترتیب پر ان کو مرتب کر دیا جائے تو قرآن مجید پر ادبی حیثیت سے کام کرنے والوں کے ہاتھ میں ایک بہترین مجموعہ آجائے گا۔ الحمد للہ کہ سید صاحب کی نگرانی میں دو جلدوں میں یہ مجموعہ تیار ہوا"

(۲) اعجاز القرآن، علوم قرآن میں سے ایک مستقل علم ہے، متقدمین اور متاخرین نے اپنے اپنے مذاق کے مطابق برابر اس عنوان پر توجہ کی ہے اس موضوع پر مستقل کتابیں بھی لکھی گئی ہیں اور ضمناً بھی کتابوں میں اس بحث پر مواد موجود ہے سید صاحب کا خیال تھا کہ اسلام کے عہد تصنیف سے لے کر اس وقت تک اس موضوع پر جو کچھ لکھا گیا ہے سنین کی ترتیب کے ساتھ ان کو جمع کیا جائے تاکہ یہ واضح ہو سکے کہ ہر عہد میں اس عہد کے مذاق کے مطابق کیا کیا خیالات ظاہر کیے گئے اور اس عنوان پر ایک جامع کتاب تیار ہو جائے، خدا کے فضل و کرم سے یہ کتاب بھی ایک جلد میں تیار ہو چکی۔

(۳) دار المصنفین کے کتب خانہ میں حضرت شاہ ولی اللہ صاحب محدث دہلوی کی الفوز الکبیر فی اصول التفسیر کا ایک قلمی نسخہ ہے اس نسخہ میں شاہ صاحب کا ایک رسالہ اصول ترجمہ قرآن کے متعلق اور دوسرا رسالہ شاہ صاحب کے حواشی قرآن کے متعلق بھی ہے، مولانا عبید اللہ صاحب سندھی مرحوم نے دار المصنفین کے کتب خانہ سے اس کی نقل بھی حاصل فرمائی تھی۔ سید صاحب کی رائے تھی کہ ان رسالوں کو اس طرح شائع کیا جائے کہ شاہ صاحب کی کتابوں سے انکی تفسیری آیات کو جمع کر لیا جائے، اور فوز الکبیر میں مناسب حواشی تحریر کیے جائیں اسکے بعد اس پورے مجموعہ کو شائع کیا جائے جہاں تک شاہ صاحب کی تفسیری آیات اور فوز الکبیر کے حواشی کا تعلق بحمد للہ ایک معتدبہ حصہ اس کام کا انجام پا چکا ہے۔

(۴) قرآن مجید میں اللہ تبارک و تعالیٰ نے اس کائنات کی اکثر چیزوں کو بطور اپنی نشانیوں کے پیش فرمایا ہے، سید صاحب فرماتے تھے (کہ آیات اللہ فی کتاب اللہ) کے نام سے ایک کتاب تیار کی جائے جس میں ان تمام آیات کو جمع کر دیا جائے اور ان چیزوں کے متعلق جدید تحقیقات کو ان آیات کی تشریح کے سلسلہ میں درج کیا جائے

قرآن مجید کی یہ بہترین خدمت ہوگی۔

امام غزالی نے بھی قریب قریب اسی موضوع پر "الحکمۃ فی مخلوقات اللہ عزوجل" کے نام سے ایک رسالہ لکھا ہے سید صاحب کے ارشاد کے موجب الگ الگ عنوانات کے ماتحت بفضل خدا یہ آیات جمع کردی گئی ہیں، البتہ جدید تحقیقات کے جمع کرنے کا کام نہیں ہوسکا ہے۔

(۵) دوسرے محققین کی طرح سید صاحب کا بھی خیال تھا کہ قرآن مجید کی آیات کی حیثیت کلیات کی ہے اور احادیث انھیں کلیات کی تشریحات ہیں، اسی خیال کے ماتحت سید صاحب قرآن مجید نیز احادیث پر غور فرماتے تھے اونھوں نے اپنی یادداشت کی کاپی میں دو عنوانات قائم فرمائے تھے۔

ایک عنوان کے ماتحت ان احادیث کے حوالوں کو جمع فرمایا جن میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے ارشاد گرامی کے بعد بطور استشہاد کے کسی آیت کو تلاوت فرمایا تھا۔

دوسرے عنوان کے ماتحت ان احادیث کے حوالوں کو جمع فرمایا تھا جنھیں حضور اکرم نے کسی آیت کو تو نہیں تلاوت فرمایا مگر اس حدیث شریف کے اندر ایسے لفظ موجود ہیں جو اشارہ کرتے ہیں کہ اس حدیث کا ماخذ فلاں آیت ہے، ان دونوں عنوانات کے ماتحت سید صاحب نے جو کچھ جمع فرمایا تھا وہ بہت مختصر ہے جو صرف نمونہ کا کام دے سکتا ہے، مگر یہ کام کرنے کا ہے اور اس کام کے لیے بڑی عمیق نظر کی ضرورت ہے۔

اللہ تعالیٰ سید صاحب کی دینی خدمات کو قبول فرمائیں اپنی رضا و مغفرت سے ان کو نوازیں اونھوں نے اپنے بعد کے لوگوں کے لیے کام کا ایک نقشہ چھوڑا ہے، بڑی ضرورت ہے کہ ان کاموں کو اخلاص کے ساتھ پورا کیا جائے اور ضبط و تحقیق میں انھیں کے نقش قدم کی پیروی کی جائے۔

خاتمۂ سخن پر سید صاحب کی ایک خواہش کا اظہار مناسب معلوم ہوتا ہے۔

جب انکے دل میں خاکسار کو دار المصنفین سے خدمت قرآن کے سلسلہ میں دار العلوم ندوہ لانے کا خیال پیدا ہوا تو ارشاد فرمایا کہ میرا دل چاہتا ہے کہ دار العلوم میں ایک قرآنی سوسائٹی قائم کی جائے ملک کے اہل ذوق سے اشتراک عمل کیا جائے دار العلوم کے مستعد اور ہونہار طلبہ کا انتخاب کیا جائے، اس کے بعد قرآن مجید کے مختلف شعبوں پر کام کیا جائے

سید صاحب کا یہ خیال اہل علم اور اصحاب ذوق کی توجہ کے لائق ہے، بے شبہ قرآن مجید کی علمی خدمت کا میدان ابھی بہت وسیع ہے اور اس میں کام کرنے کی بڑی ضرورت ہے، موجودہ دور کی روز افزوں الجھنیں اور پریشانیاں اس عہد کے علوم کی شکست کا اعلان ہیں، آج کی امن و سلامتی کی متلاشی دنیا کے لیے صرف قرآن ہی کے پیغام میں طمانیت و سکون مل سکتا ہے اس لیے ضرورت ہے کہ اس پیغام کو ہر ممکن اور مناسب صورت سے پیش کیا جائے۔"

وہی دیرینہ بیماری وہی نامحکمی دل کی
علاج اس کا وہی آب نشاط انگیز ہے ساقی

واٰخر دعوانا ان الحمد للہ رب العٰلمین

طالبانِ سلوک کی ہمت افزائی

اور

ابتدائی مشورہ

حضرت خواجہ محمد معصوم کے ایک مکتوب کا ترجمہ

[یہ مکتوب حضرت ممدوح نے ایک ایسے صاحب کو لکھا تھا جنھوں نے اپنے ایک خط میں راہِ سلوک کی طلب اور اس کے شوق کا اظہار کیا تھا ——— محمد منظور نعمانی]

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

اِستَجِیبُوا لِرَبِّکُم مِن قَبلِ اَن یَاتِیَ یَومٌ لَا مَرَدَّ لَہٗ مِنَ اللّٰہِ مَا لَکُم مِن مَلجَاءٍ یَومَئِذٍ وَ مَا لَکُم مِن نَکِیرٍ۝

نامۂ گرامی جو برادرم مولانا محمد حنیف کے ساتھ ارسال فرمایا تھا، اور جس کے ذریعہ اس گمنام کو یاد فرمایا گیا تھا، اس کے مطالعہ سے یہ معلوم کرکے بے انتہا مسرت اور فرحت ہوئی کہ مطلوبِ حقیقی کی طلب اور اس کے شوق کی حرارت آپ کے دل میں پیدا کر دی گئی ہو ——— کتنی بڑی نعمت ہو کہ اس آخری زمانہ میں حق تعالےٰ اپنی بارگاہِ قدس کی طرف بڑھنے کا سودا کسی بندہ کے سر میں پیدا فرمائے۔ اور اپنی محبت کی شمع اس کے دل میں روشن فرمادے۔ اور اپنے ہجر کی سوزش سے کسی سینہ کو سرفراز فرمادے ——— اس نعمتِ عظمیٰ کا شکر ادا کرنا چاہیے، اور اللہ پاک کے اس مبارک عطیہ کا نہایت ممنون ہونا چاہیے۔ اور کمرِ ہمت باندھ کر ھل من مزید کہتے ہوئے اس مرضِ عشق کی اضعافاً مضاعفاً ترقی و زیادتی کا جویاں و خواہاں رہنا چاہیے، اور اللہ تعالےٰ کی اس عنایت کے لیے

چشم براہ رہنا چاہیے کہ مطلوب حقیقی کی طلب اور محبوب حقیقی کے عشق کا یہ سودا بڑھ کر درجۂ جنون تک پہونچ جائے اور اس کے تمام ماسوا سے بیگانہ کردے، اور دنیا کی فضول ولاطائل کشاکش سے نجات دے دے۔ اور محبت کی بھڑکتی آگ انانیت ونفسانیت کے اس منارہ کو جلاکر خاک کردے جس کا سرچشمہ نفسِ امارہ کی سرکشی اور خودسری ہو، تاکہ کمالِ لایزال کے انوار کی روشنی نصیب ہو وعدۂ الٰہی ہو "لَئِن شَكَرْتُمْ لَأَزِيدَنَّكُمْ"۔ (اگر تم نے ہماری نعمت کا شکر کیا تو ہم تم کو اور زیادہ دیں گے)

عزیز سعید! جب تم کو ان حضرات اکابر کے طریق کا شوق نصیب ہوگیا ہے تو چاہیے کہ جہاں تک ہوسکے اس مبارک اور عالی طریقہ کے شرائط وآداب کی رعایت کی پوری کوشش کرو، سُنّت کی پیروی اور بدعت سے پرہیز کو لازم پکڑو۔ کیوں کہ اسی پر ہمارے اس طریقہ کی بنیاد ہے، اور اقوال وافعال اور اخلاق میں دیندار اور متقی علماء کے فتوے کا اتباع کرو۔ اور صالحین کی روش کو اپنا شعار بناؤ اور فقراء سے محبت رکھو اور سونے کھانے اور بات چیت کرنے میں حد اعتدال کی رعایت لازم پکڑو، اور تاامکان سحر کے وقت اٹھنے کو ہاتھ سے نہ دو اور اس مبارک وقت کی نماز اور دعا واستغفار اور گریہ وزاری کو بہت غنیمت جانو اور صالحین کی صحبت کی طلب اور رغبت اپنے اندر پیدا کرو، تم نے یہ حدیث سنی ہوگی "دین المرء دین خلیلہ" (آدمی اپنے دوست کے طریقہ پر ہوتا ہے)

اور معلوم ہونا چاہیے کہ آخرت کے طالب کے لیے ترک دنیا ضروری ہے، اگر حقیقی ترک آسان نہ ہو تو کم از کم حکمی ترک تو لابدی ہے، تاکہ نجات کی امید کی کوئی صورت ہو۔

اور حکمی ترک کا مطلب یہ ہے کہ مال کی جن اقسام میں زکوٰۃ واجب ہو، کتب شرعیہ میں لکھی ہوئی تفصیل کے مطابق اس کو ادا کیا جائے، اور جن لوگوں کو اس کے پہونچانے کا حکم ہے، ممنونیت کے ساتھ ان کو پہونچائی جائے، اور اسی طرح اہل قرابت کے ساتھ حُسن سلوک اور پڑوسیوں کے حقوق اور سوال کرنے والوں اور قرض مانگنے والوں کی امداد

وغیرہ کے متعلق شریعت کے جو احکام ہیں ان کی پوری رعایت کی جائے اور مال میں اسراف نہ کیا جائے اور اس کو لہو ولعب اور تفاخر و تکاثر کا ذریعہ نہ بنایا جائے، جب ان امور کی پابندی کی جائے گی تو مال میں کوئی دینی مضرت باقی نہیں رہے گی اور دنیا آخرت کے ساتھ صحیح طور پر جمع ہو جائے گی۔ بلکہ اس صورت میں دنیا دنیا نہیں رہے گی، بلکہ سراسر دین بن جائے گا۔

اور معلوم ہونا چاہیے کہ نماز دین کا ستون ہے، جو اس کو قائم رکھے گا اپنے دین کو قائم رکھے گا اور جو اس کو ڈھائے گا وہ اپنے دین کو ڈھادے گا، اس لیے نہایت ضروری ہے کہ ہر نماز کو مستحب وقت میں ان آداب و شرائط کے ساتھ ادا کرنے کا پورا اہتمام کیا جائے جو کتب فقہ میں مذکور ہیں اور ہمیشہ اس کی کوشش کی جائے کہ تکبیر تحریمہ فوت نہ ہو، اور پہلی صف میں جگہ ملے۔ اور جب ان میں سے کوئی ایک بات بھی چھوٹ جائے تو رنج و غم ہو، نماز کا معاملہ یہ ہو کہ جن بندوں کی نماز کامل ہو چکی ہے وہ نماز ادا کرتے وقت گویا اس جہان دنیا سے جس میں قرب کی دولت بہت کم نصیب ہوتی ہے، اور جو ہوتی بھی ہو وہ قرب اصلی کی نہیں، بلکہ قرب ظلی کی ہوتی ہے —— بے تعلق ہو جاتے ہیں، اور اس وقت ان کا ربط اس عالم آخرت سے قائم ہو جاتا ہے جو قرب اصلی کا مقام ہے اور وہاں کی خاص الخاص دولت سے وہ ایک گونہ مناسبت حاصل کر لیتے ہیں۔ اور نماز ہی کے چشمۂ زلال سے تشنہ کامانِ حیرت و فراق انسیت اور سیرابی حاصل کرتے ہیں، اور سرگشتگانِ بارگاہِ جلال و کبریائی نماز ہی کی خلوت میں بوئے وصال پا کر مست و مدہوش ہوتے ہیں رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وسلم ارشاد فرماتے ہیں "جب بندہ نماز میں کھڑا ہوتا ہو تو اس وقت اسکے واسطے جنت کے دروازے کھول دیے جاتے ہیں اور اس کے اور اس کے رب کے درمیان پردے اٹھا دیے جاتے ہیں اور حورعین اس کا استقبال کرتی ہیں جب تک کہ وہ ناک سے ریزش نہ نکالے۔"

اور اے عزیز جب تک کہ تم کو اس راہ کے کسی رہبر کامل کی خدمت میں پہونچنا نصیب نہ ہو اس وقت تک اپنے اوقات کو طاعات و عبادات اور تلاوت قرآن اور

اُن وظائف و اوراد میں مصروف رکھو جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے ثابت ہیں۔ اس فقیر نے بھی اس قسم کے بعض اعمال اور اوراد و وظائف کو ایک رسالے میں جمع کیا ہے، وہ رسالہ غالباً ملّا محمد حنیف کے پاس ہوگا، اور خاص کر کلمۂ طیبہ لا الٰہ الا اللہ کی خوب کثرت رکھیں، اور اپنے زیادہ اوقات کو اس مبارک کلمہ کے ورد سے معمور رکھیں کیونکہ اس میں باطن کو پاک کرنے کی خصوصی تاثیر ہے، اور ایسا بھی کر سکتے ہو کہ اس کلمہ کی ایک تعداد معین کر کے اس کو اپنا روزانہ کا معمول بنالو، اور باوضو اور بے وضو ہر حال میں اس کو پڑھا جا سکتا ہو، نیز بزرگانِ طریق کی محبت کو سرمایۂ سعادت جانو، اور اسی کو کامیابی کا دار و مدار سمجھو۔

دادیم ترا از گنج مقصود نشاں

گر ما نرسیدیم تو شاید برسی

والسلام علیکم وعلیٰ سائر من اتبع الھدیٰ والتزم متابعۃ المصطفیٰ وعلیہ وعلیٰ آلہ الصلوات والبرکات العلیٰ وعلیٰ جمیع الانبیاء والمرسلین والملٰئکۃ وسائر الصلحین ـــ آمین

(مکتوب ۱۴۲)

انتخاب!

فتنۂ انکارِ حدیث

(از ماہر القادری)

انسانی تاریخ کے آغاز سے لے کر آج تک کوئی دور ایسا نہیں گزرا جس میں حق اور باطل کے درمیان کسی نہ کسی عنوان سے آویزش نہ رہی ہو، ہر زمانہ میں "شرارِ بولہبی" "چراغِ مصطفوی" سے ستیزہ کار رہا ہے۔ حزب اللہ کے مقابلہ میں حزب الشیطان کے وجود سے بھی دنیا کبھی خالی نہیں رہی، سچائی کو جھوٹ اور دغا نے ایک لمحہ کے لیے بھی چین سے نہیں بیٹھنے دیا، اور گمراہی نے ہمیشہ ہدایت کا منھ چڑانے کی کوشش کی ہے۔

حق و باطل کی اس مسلسل کش مکش میں اللہ تعالیٰ کی بہت بڑی مصلحت اور حکمت پوشیدہ ہے! اگر یہ کش مکش نہ ہو تو حق شناسوں اور باطل پرستوں میں امتیاز کس طرح ہو، حق و باطل کا یہ تصادم و نزاع حقیقت میں قدرت کی طرف سے امتحان و آزمایش ہے کہ جماعتیں اور افراد ان دونوں میں سے کس کا ساتھ دیتے ہیں! یہ انسانوں کے فکر و نظر کی، فہم و شعور کی، یقین و ایمان کی، ایثار و تقویٰ کی اور جذبات و داعیات کی آزمایش ہے، اس کسوٹی پر کھوٹے کھرے کی تمیز ہوتی ہے اور اس امتحان میں اہل نفاق اور صاحبان اخلاص الگ الگ ہو جاتے ہیں اور اُن کے درمیان کسی قسم کا التباس یا اشتباہ باقی نہیں رہتا۔

تاریخ ہمیں یہ بتاتی ہے کہ دنیا میں جب بھی فتنہ و فساد کے شعلے بھڑکے ہیں تو مفسدین و اشرار نام نہاد مصلحین کا روپ دھار کر منظرِ عام پر آئے ہیں، ظالموں نے سدا عدل و انصاف کے نام پر ظلم کیا ہے اور غارت گروں نے تعمیر کا نام لے کر شہروں کو لوٹا اور بستیوں کو اجاڑا ہے! کتنے بھیڑیے ہیں جو گوسفندوں کی کھالیں اوڑھ کر نمودار ہوئے ہیں اور کتنے لٹیرے ہیں جنھوں نے لوگوں کو پاسبانی اور حفاظت کا یقین دلا کر شب خوں مارے ہیں۔

پاکستان میں آج اسی قسم کا ایک فتنہ ابھر رہا ہے، جس کی روک تھام اگر بروقت نہ ہوئی اور

مسلمانوں کے دین و ایمان کو اس فسادسے بچانے کی تدابیر اختیار نہ کی گئیں تو اندیشہ ہے کہ اس "شجر خبیث" کی جڑیں مضبوط ہو جائیں گی اور یہ آگ پھیلتی چلی جائے گی اس کی لپیٹ میں جو مسلمان بھی آجائے گا، اُس کے پاس یقین و ایمان کی خاکستر کے سوا اور کچھ نہ رہے گا۔

اب سے تقریباً ساٹھ سال قبل پنجاب میں چکڑالوی کے عبداللہ نامی ایک نیم مفلوج شخص نے حفاظت قرآن کے نام پر "انکار حدیث" کا فتنہ کھڑا کیا تھا اُس کے زمانہ میں یہ فتنہ ابھرنے نہیں پایا، کسی نے جانا کسی نے نہ جانا، یہاں تک کہ چالیس سال تک یہ فتنہ دبا رہا، اتنی مدت کے بعد تاریخ الامت کے مصنف اسلم صاحب جیراج پوری نے اس دبے ہوئے فتنہ کو پھر سے ابھارا اور وہ اپنے مضامین کے ذریعہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی مقدس احادیث کو مسلمانوں کی نظر میں بے اعتبار ٹھیرانے کی جد وجہد کرتے رہے!

حافظ محمد اسلم صاحب جیراج پوری دلی میں رہتے تھے (اور اب بھی رہتے ہیں) اور جامعہ ملیہ میں استاذ تھے، اُسی زمانہ میں مسٹر غلام احمد پرویز گورنمنٹ آف انڈیا کے کسی دفتر میں کلرک تھے، پرویز صاحب کو مضمون نگاری کا شوق تھا اور اُن کے مضامین بعض رسالوں میں چھپا بھی کرتے تھے، دلی میں جیراج پوری کے ساتھ اُن کی صحبتیں رہیں اور اُن کا رنگ چڑھنا شروع ہوا، پرویز صاحب کا دینی مطالعہ اتنا کم تھا کہ نہ ہونے کے برابر تھا، عربی نہ جاننے کے سبب قرآن و حدیث کے علوم سے وہ براہ راست استفادہ بھی نہ کر سکتے تھے، اُن کے پاس اگر کوئی چیز تھی تو لے دے کے اُن کا افسانوی طرز تحریر تھا، اس کم علمی اور دینی علوم سے بے خبری کا نتیجہ یہ ہوا کہ اسلم صاحب جیراج پوری نے احادیث نبوی کے بارے میں اپنے جن گمراہ کن نظریوں کی تلقین کی پرویز صاحب اُن پر ایمان لے آئے اور انھوں نے پھر اپنے مضامین کے ذریعہ احادیث کی مخالفت شروع کر دی۔

تقسیم ہند کے بعد پاکستانی حکومت کے اسسٹنٹ سکریٹری مسٹر پرویز کو سرکاری حلقوں کے کچھ مغرب زدہ حاشیہ نشیں جو ہاتھ لگے تو "یہ لے" اور زیادہ بڑھ گئی اور حضور خاتم النبیین علیہ الصلوٰۃ والتسلیم کی احادیث کی مخالفت کا جذبہ جنون کی حد تک پہونچ گیا۔

اب مسٹر پرویز نے احادیث رسول کے خلاف باقاعدہ ایک محاذ قائم کر لیا ہے "تحریک مخالفِ حدیث" "ANTI HADITH MOVEMENT" کے یہ حضرت خود ہی سربراہ کار بلکہ قائد ہیں، قیادت

کی تمنا پرویز صاحب مدتوں سے دل میں لئے بیٹھے ہیں اور اب چند سفہا اور ممتاز کی بے دانشی مغرب زدگی اور دین سے بے خبری کی بدولت اُن کی یہ دیرینہ تمنا پروان چڑھ رہی ہے۔

فتنۂ انکار حدیث پہلے رسالہ طلوع اسلام کے صفحات اور چند کتابوں تک محدود تھا اب اس فتنہ نے ایک مستقل ادارہ بلکہ تحریک کی صورت اختیار کرلی ہے "حفاظتِ قرآن" کا فریب دے کر ہندوستان اور پاکستان میں "منکرین حدیث" کو ڈھونڈ ڈھونڈ کر اس ادارہ کا رکن بنایا جا رہا ہے، بہت بڑے سرمایہ سے ایک روزنامے کے اجراء کی اسکیم بھی پیش نظر ہے، اس سلسلہ میں نشر و اشاعت کے تمام ذرائع اختیار کئے جا رہے ہیں۔

فتنۂ "انکار حدیث" اپنے دور رس نتائج کے اعتبار سے اُلحاد و دہریت سے کسی طرح بھی کم خطرناک اور کم ضرر رساں نہیں ہے

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی احادیث کا انکار حقیقت میں منصب رسالت کا انکار ہے! اس لئے اس فتنہ کو حقیر جان کر اس سے صرف نظر نہیں کیا جا سکتا!

دورِ حاضر کی مادہ پرست فطرت نے عام طور پر لوگوں کو آخرت فراموش اور ہوا و ہوس کا پرستار بنا دیا ہے، لوگ دین کی تکلیفات، شریعت کی پابندیوں اور مذہب کے بندھنوں سے چھٹکارا چاہتے ہیں اور اگر کوئی "شخص دین" (؟) کا ایسا تصور پیش کردے کہ جس میں نہ نماز کو کوئی اہمیت حاصل ہو اور نہ روزے کی پابندی ضروری ہو اسی طرح شریعت کی تمام پابندیوں کو "دین ملا" کہہ کر ایک جھٹکے میں توڑ دے اور دین سے کھلی ہوئی بغاوت پر خدا پرستی اور قرآنی نظام کی تجدید و احیا کا لیبل لگا دے تو ایسے "مفسر قرآن" (؟) اور "مبلغ دین متین" (؟) کو اُن لوگوں میں یقیناً مقبولیت حاصل ہوگی جن کی نفسانی خواہشوں کی راہ میں دین کی پابندیاں سب سے بڑی رکاوٹ بنی ہوئی ہیں ——— جناب پرویز نے ٹھیک یہی طریقہ اختیار کیا ہے اور اُن کی تحریروں کا زیادہ تر وہی افراد اثر قبول کرتے ہیں جن کی فطرت دین سے بغاوت پر آمادہ ہے اور جن کے فکر و نظر پر مغرب زدگی اور مادہ پرستی کا غلبہ ہے۔

پرویز صاحب نے مسلمانوں کو ایک دھوکا یہ بھی دیا ہے کہ رسالہ طلوع اسلام کے سرورق پر پورے علامہ اقبال کی تصویر شائع کی ہے اور خود کو شاعر مشرق کا بہت بڑا عقیدت مند اور اُن کے کلام کا شارح بنا کر پیش کیا ہے! بعض لوگ اس دھوکے سے کہاں بچ سکے ہوں گے کہ پرویز صاحب طلوعِ اسلام کے ذریعہ جن نظریوں کی تبلیغ کرتے اور احادیث رسول کو بے اعتبار ٹھہراتے ہیں ——— علامہ اقبال

کے بھی یہی معتقدات اور نظریے ہوں گے! حالانکہ اقبال کے شاگرد و ہم نشیں، اُن کے دوست اور دیکھنے والے آج بھی موجود ہیں اور وہ اس پر گواہ ہیں کہ اقبال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اقوال و افعال کو دین میں حجت سمجھتے تھے اور اگر وہ آج زندہ ہوتے اور پرویز صاحب اُن کے سامنے حدیث کی مخالفت میں لب کشائی فرماتے تو علامہ اقبال اُن کو اپنی محفل سے اٹھوا دیتے، اقبال کی دینی غیرت منصب رسالت کی اس توہین کو گوارا نہیں کر سکتی تھی۔

منصبِ رسالت اور اس کی ذمہ داریاں

وہ حضرات جن کو صلح و آشتی کا وہم ہو جاتا ہے، اُن کی طرف سے یہ اعتراض وارد کیا جا سکتا ہے کہ "انکار حدیث" کو "انکار منصب رسالت" کہنا ایک درشت آمیز طنز ہے! حالانکہ نہ یہ طنز ہے اور نہ اس میں درشتی و خشونت پائی جاتی ہے، یہ واقعیت کی ہو بہو ترجمانی اور حقیقت کی صحیح عکاسی ہے، خود قرآن پاک جس نے "جدال احسن" کا حکم دیا ہے، کافروں، مشرکوں، منافقوں، ریاکاروں، فاسقوں اور شیطان کی پیروی کرنے والوں کو انھیں القاب اور ناموں سے یاد کرتا ہے۔ جن کے وہ مستحق تھے اور ہیں۔

جو لوگ حدیث کی مخالفت میں گمراہی کی اس حد تک پہونچ جائیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اطاعت بس حضورؐ ہی کی زندگی ہی تک تھی، آپ کی وفات کے بعد یہ اطاعت ختم ہو گئی ——— تو اس قسم کا عقیدہ رکھنے والے منصب رسالت کے منکر نہیں تو اور کیا ہیں؟

منکرین حدیث کو قرآن فہمی کا بڑا زعم ہے اور اپنی تحریروں اور تقریروں میں اللہ کی کتاب کا اس انداز سے ذکر فرماتے ہیں جیسے وہ قرآن سے والہانہ عقیدت رکھتے ہیں ——— مگر اس ہٹ دھرمی اور بے بصری کو کیا کیجئے کہ قرآن پاک جس ذات گرامی پر نازل ہوا تھا، اور اُس کا جو منصب قرآن میں بتایا گیا ہے اُس سے یہ لوگ جان بوجھ کر صرف نظر کر جاتے ہیں! قرآن سے یہ عشق اور مہبط قرآن اور حامل کتاب سے اس قدر بیزاری! اس تضاد اور شتر گربگی کو "نفاق" نہ کہیں تو اور کیا کہیں!

اللہ تعالیٰ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو جو فرائض سپرد فرمائے ہیں ——— وہ (۱) قرآن کریم کی تلاوت (۲) قرآن کی تعلیم کے ساتھ حکمت کی تعلیم اور (۳) تزکیہ نفس ——— ہیں! اور یہ ہم اپنی طرف سے نہیں کہہ رہے ہیں اور نہ کسی آیت سے استنباط کر کے کوئی مفہوم اخذ کیا گیا ہے اور نہ یہ حدیث ہے جس پر جرح و تعدیل ہو سکتی ہے، بلکہ یہ قرآن پاک کی محکم آیت ہے:۔

لقد من اللہ علی المومنین اذ	اہل ایمان پر اللہ نے احسان کیا ہے کہ ان کے
بعث فیھم رسولا من انفسھم	درمیان خود انہی میں ایک ایسے رسول کو مبعوث
یتلوا علیھم اٰیٰتہ ویزکیھم	فرمایا جو اس کی آیتیں انہیں سناتا ہے، ان کا تزکیہ
ویعلمھم الکتٰب والحکمۃ (آل عمران)	کرتا ہے اور ان کو کتاب و حکمت کی تعلیم دیتا ہے

ہم ان "نظام ربوبیت" کے علمبرداروں اور قرآن کریم کی حفاظت و تبلیغ کے نام نہاد دعویداروں سے قرآن پاک ہی کو درمیان میں لاکر پوچھتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جس اسلوب پر صحابہ کرام کی زندگیوں کا تزکیہ فرماتے تھے اس کی اور تعلیم کتاب و حکمت کی تفصیل کہاں ملتی ہے؟ جواب دیا جا سکتا ہے کہ یہ تفصیل قرآن پاک ہی میں موجود ہے۔ اگر یہ تفصیل قرآن کریم ہی میں پائی جاتی ہے تو پھر "یتلوا علیھم آیتہ" ہی کہہ دینا کافی تھا، یہ "ویزکیھم ویعلمھم الکتاب والحکمۃ" کس لئے فرمایا گیا، پرویز صاحب اور ان کے ہمنواؤں کے نقطۂ نگاہ کے اعتبار سے تو یہ الفاظ (معاذ اللہ) ...... خاک بدہن گستاخ، اللہ تعالیٰ نے یوں ہی زائد فرمادیے ہیں۔

اگر اللہ تعالیٰ صرف "یعلمھم الکتاب" ہی فرماتا تو بھی اللہ تعالیٰ کے حکم ہی کی بنا پر جو اہل ایمان اطاعتِ رسول کو قیامت تک کے لئے منصوص سمجھتے ہیں، ان لفظوں کا وہی مفہوم لیتے جو اس وقت لیتے ہیں مگر "منکرین حدیث" کو تاویل واستنباط کا ایک بہانہ مل جاتا اور وہ کہتے کہ "تعلیم کتاب" سے صرف "تلاوتِ کتاب" مراد ہے لیکن اللہ تعالیٰ کی حکمت بالغہ کے قربان جائیے کہ اس نے اس بعید از قیاس تاویل کے لئے بھی کوئی گنجائش نہیں رہنے دی اس نے "تلاوتِ آیات" کا پہلے ذکر کیا اور پھر فرمایا کہ یہ رسول تزکیہ اور تعلیم کتاب و حکمت کا فرض بھی انجام دیتے ہیں۔

معمولی سے معمولی سمجھ کا آدمی بھی اس بات کو جانتا ہے کہ جب کوئی "معلم" کسی کتاب کی تعلیم دیتا ہے تو وہ کتاب کی اصل عبارت کی قرأت پر ہی قناعت نہیں کرتا اور جہاں وہ خود ضرورت محسوس کرتا ہے متن کی شرح بھی کرتا جاتا ہے اور اس کے شاگرد جب کسی مشکل مقام کے بارے میں استفسار کرتے ہیں تو وہ شرح و بیان کے ذریعہ شاگردوں کے استفسار کا جواب بھی دیتا جاتا ہے۔ "تعلیم" میں کتاب کی اصل عبارت کی تلاوت اور قرأت کے علاوہ اس کا پڑھانا اور سکھانا بھی لازمات سے ہے۔

کیا عقل کسی طرح اس بات کو باور کر سکتی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تقریباً تیئس سال تک صحابہ کرام کے سامنے قرآن پاک کی صرف تلاوت فرماتے رہے اور آپ نے کسی آیت کی شرح و تفسیر نہیں فرمائی

اور نہ صحابہ میں سے کسی ایک صحابی نے بھی حضور سے کسی آیت کے بارے میں کوئی بات دریافت کی! اگر کوئی ایسا خیال کرتا ہے تو وہ عقل کا، مشاہدہ کا، تجربہ کا، اور خود اصول تعلیم و تربیت کا مذاق اڑاتا ہے۔

یہ واقعہ ہے اور ایسا واقعہ ہے جس میں ذرا سا بھی شبہ نہیں کیا جا سکتا، یہ حقیقت ہے اور ایسی حقیقت ہے جو درایت اور روایت کے اعتبار سے ثابت اور مسلم ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم قرآنی آیات کی شرح و تفسیر بھی فرماتے تھے اور صحابہ کرام قرآن کے سلسلہ میں اپنی مشکلات بھی حضورؐ کے سامنے پیش کرتے تھے اور حضورؐ کی تعلیم و تبیین سے صحابہ کرام کی مشکلات دور ہوتی تھیں۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا قیاس کالجوں کے پروفیسروں اور مکتبوں کے معلموں پر نہیں کرنا چاہئے کہ جو تعلیم کا کام اجرت پر کرتے ہیں اور جن کا کام کتابیں پڑھانے کے بعد ختم ہو جاتا ہے حضور معلمِ کتاب و حکمت ہونے کے علاوہ مزکّی اور مربّی بھی تھے، اللہ تعالیٰ نے اہل ایمان کی تربیت اور اُن کی زندگیوں کے سنوارنے (تزکیہ) کا فرض بھی آپ سے متعلق کیا تھا اور اس فرض کو سرکار آخر دم تک انجام دیتے رہے

اللہ تعالیٰ کے احکام کی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے صرف زبانی طور پر ہی شرح نہیں فرمائی بلکہ اُن کو برت کر دکھایا، کتاب اللہ کے الفاظ حضورؐ کی زندگی میں عملی نمونہ بن جاتے تھے بلکہ وہ بولنے چالنے اور حرکت کرنے لگتے تھے اسی لئے تو ام المومنین حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا نے فرمایا تھا کہ رسول اللہ علیہ وسلم کا خلق سراپا قرآن تھا۔

حضور نبی کریم علیہ الصلوٰۃ والتسلیم نے کتاب و حکمت کی جو تعلیم دی تھی اور جس اسلوب و نہج پر صحابہ کرام کی زندگیوں کا تزکیہ فرمایا تھا کیا اُس کو صحابہ کرام نے بھلا دیا، اور اپنے شاگردوں سے، اپنی اولاد سے، اپنے احباب سے اور دوسرے مسلمانوں سے اُس کا ذکر تک کرنا گوارا نہ کیا —— کیا ایسا ہونا ممکن ہے؟ کیا عقل عمومی اُس کو باور کر سکتی ہے؟ کیا یہ بات انسانی فطرت اور تجربہ و مشاہدہ کے خلاف نہیں ہے؟

عام قاعدہ ہے کہ اصاغر اپنے اکابر کی زندگیوں کے واقعات اور اُن کے اقوال وارشادات کا آپس میں تذکرہ کرتے رہتے ہیں اور ایک نسل سے دوسری نسل تک یہ تذکرے پہونچتے رہتے ہیں۔

صحابہ کرام کو... محمد ابن عبداللہ سے غیر معمولی عقیدت تھی اس لئے کہ وہ اللہ کے سچے رسول تھے، سراج منیر

تھے، رحمۃ للعالمین تھے، اللہ نے آپ کے ذکر کو بلند فرمایا تھا، اور آپ کی محفل میں بات چیت کہنے کے آداب تک صحابہ کو سکھائے تھے اور یہاں تک تنبیہ کر دی تھی کہ تم اگر رسول اللہ کی محفل میں اُن کی آواز پر آواز بلند کرو گے تو اس سوء ادب کی پاداش میں تمہارے اعمال حبط ہو جائیں گے۔ اللہ تعالیٰ نے حضورؐ کے "اسوۂ حسنہ" کو انسانیت کے لیے معیار قرار دیا تھا اور فرمایا تھا:-

من يطع الرسول فقد اطاع الله	جس نے رسول کی اطاعت کی اس نے دراصل خدا کی اطاعت کی

تو اتنے عظیم المرتبت انسان، واجب الاطاعت پیشوا اور کائنات کی سب سے زیادہ محترم شخصیت کے احوال افعال اور اقوال کو زیادہ سے زیادہ یاد رکھنا اور اُن کا تذکرہ کرتے رہنا صحابہ کرام کی عقیدت، محبت اور ایمان کا عین تقاضا ہونا چاہیے تھا اور تھا۔

پس اللہ تعالیٰ کے لئے ہوئے منصب کی بنا پر رسول اللہ نے کتاب وحکمت کی جو تعلیم دی تھی اور تزکیۂ نفس کے جو اصول بتائے تھے، اسی کا نام "سنت" اور "حدیث" ہے! دوسرے لفظوں میں یوں سمجھئے کہ قرآن متن ہے حدیث اُس کی شرح وتفسیر ہے، "قرآن" اصل ہے "حدیث" فرع ہے۔

قل ان كنتم تحبون الله فاتبعونى يحببكم الله ويغفر لكم ذنوبكم والله غفور رحيم ه قل اطيعوا الله والرسول فان تولوا فان الله لا يحب الكافرين ه	اے نبی لوگوں سے کہہ دو کہ اگر تم حقیقت میں اللہ سے محبت رکھتے ہو تو میری پیروی اختیار کرو، اللہ تم سے محبت کرے گا اور تمہاری خطاؤں سے درگزر فرمائے گا، اور اللہ بڑا معاف کرنے والا ہے، ان سے کہو کہ "اللہ اور رسول کی اطاعت قبول کر لو۔ پھر اگر وہ اللہ اور رسول کی اطاعت قبول نہ کریں تو اللہ کافروں سے ہرگز محبت نہیں کرتا۔

یہ آیت دو ٹوک انداز میں بتا رہی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اطاعت اللہ تعالیٰ کی محبت کا عین تقاضا ہے، جو شخص حضورؐ کی اطاعت سے روگردانی کرتا ہے وہ دراصل اللہ تعالیٰ کا نافرمان ہے اور حضورؐ کی اطاعت سے انحراف کرنے والے کا اللہ تعالیٰ کے ساتھ محبت کا دعویٰ

باطل اور بے اصل ہے۔

اور قرآن پاک میں یہ بھی ارشاد فرمایا گیا ہے۔

فلا وربك لا يومنون	اے محمدؐ! تمہارے رب کی قسم یہ کبھی مومن
حتی یحکموك فیما شجر	نہیں ہو سکتے، جب تک کہ اپنے باہمی اختلافات
بینهم ثم لا یجدوا فی	میں یہ تم کو فیصلہ کرنے والا نہ مان لیں پھر جو
انفسهم حرجا مما قضیت و	تم فیصلہ کرو اُس پر اپنے دلوں میں کوئی
یسلموا تسلیما	تنگی نہ محسوس کریں بلکہ سربسر تسلیم کرلیں۔

"منکرین حدیث" سے ہم دریافت کرتے ہیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جو فیصلے فرمایا کرتے تھے وہ کہاں محفوظ ہیں؟ اگر وہ محفوظ نہیں ہیں، تو ایسے فیصلے جن کے قبول کرنے میں کوئی اپنے اندر تنگی اور بھچاوٹ محسوس کرے تو اُس کے ایمان تک پر حرف آجائے ——— کیا صحابہ کرام اور اُن کے شاگردوں نے بالکل بھلا دیئے ؟

ہم کہتے ہیں بلکہ پوری ذمہ داری کے ساتھ دعویٰ کرتے ہیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا "اسوۂ حسنہ" آپ کی دی ہوئی کتاب وحکمت اور تزکیہ کی تعلیم اور آپ کے کئے ہوئے فیصلے احادیث کی کتابوں میں محفوظ ہیں اور چونکہ اللہ تعالٰی نے آپ کی اطاعت کا حکم دیا ہے۔ اس لئے آپ کی "سنت" قیامت تک کے لئے دین میں حجت ہے، اور جو کوئی آپ کی سنت کو دین میں حجت نہیں سمجھتا، وہ حقیقت میں منصب رسالت کی نفی اور انکار کرتا ہے، حضورؐ کی اطاعت کو صرف آپ کی حیات مقدسہ تک محدود سمجھنا خود کتاب اللہ کے منشا اور مفہوم کے ساتھ ایک طرح کا مذاق ہے! یہ تو دہریوں، ملحدوں اور خدا اور رسول کے دشمنوں کے سوچنے کا انداز ہے، وہ "منکرین حدیث" سے ایک قدم آگے بڑھ کر یہی تو کہتے ہیں کہ قرآن کریم بے شک الہامی کتاب ہے مگر وہ جس دور کے لئے بھیجی گئی تھی وہ دور ختم ہوگیا، یہ ہمارا دور ایمان بالغیب کا نہیں تجربہ و شہود کا دور ہے، اس دور کے تقاضوں کا قرآنی تعلیمات ساتھ نہیں دے سکتیں (معاذ اللہ! اس تصور سے سو بار خدا کی پناہ)

اللہ تعالیٰ کا بہت بڑا احسان ہے کہ اُس نے کتاب کے ساتھ معلم کتاب کو بھیجا اور وہ اس لئے بھیجا کہ اللہ تعالیٰ بندوں کے سامنے محسوس و مشہود ہو کر نہیں آسکا، اُس نے "اقامت صلوٰۃ" کا حکم دیا اور

رسول اللہ نے نماز پڑھ کر دکھا دی کہ "اقامت صلوٰۃ" کی تعمیل و تکمیل اس طرح ہونی چاہئے۔ اللہ تعالیٰ نے "آتوا الزکوٰۃ" ارشاد فرمایا، اور حضورؐ نے زکوٰۃ کی شرح کی تعیین فرما دی، پھر زکوٰۃ جمع کرائی اور اسے مستحقین میں تقسیم کر کے بتا دیا۔ اللہ تعالیٰ نے جہاد فرض کیا اور حضورؐ نے خود غزوات میں شریک ہو کر صحابہ کو دکھا دیا کہ جہاد میں یہ اللہ کے حدود ہیں اور اُن کی اس طرح حفاظت کی جاتی ہے! غرض وضو، غسل، طہارت، نکاح، طلاق، بیع، رہن، تجارت، زراعت، حکومت، سفر، حضر، خلوت، جلوت، صلح و جنگ، تبلیغ و تذکیر، نشست و برخاست، اکل و شرب کے وہ پہلو جو ہدایت، اخلاق، اقامت دین اور زندگی سنورنے (تزکیہ) سے تعلق رکھتے ہیں، اُن پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی کوئی نہ کوئی حدیث (قولی و فعلی) ضرور ملتی ہے اور جس طرح اللہ تعالیٰ مکڑی اور مچھر کی مثال دینے سے نہیں شرماتا اسی طرح رسول اللہ بھی استنجے کے ڈھیلوں کی تعداد بتانے میں عار محسوس نہیں فرماتے۔

اگر دینی معاملات میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا قول اور فعل سند، حجت، نظیر اور مثالی نمونہ نہیں اور آپ کی تعلیمات کو قابل اتباع نہیں سمجھا جا سکتا ——— تو پھر اسلم صاحب جیراج پوری اور مسٹر پرویز دین، اسلام اور قرآن کے بارے میں جو کچھ بتاتے ہیں کیا اُس کو قابل اعتبار اور لائق اتباع سمجھا جائے؟ اور وہ کون سی سند اور "OUTHORTY" ہے جس کی بنا پر یہ لوگ قرآن کی تفسیر کرتے ہیں اور دینی مسائل پر بولتے ہیں۔

حدیث تاریخ سے بلند ہے مسٹر پرویز احادیث کو "تاریخ" کہتے ہیں، اور اُن کا یہ کہنا ایک طرف تو حدیث دشمنی کے جذبہ کا ثبوت ہے اور دوسری طرف اُن کی جاہلانہ اُپج بھی اس سے ظاہر ہوتی ہے! احادیث کو "تاریخ" کہہ کر وہ علم حدیث کو بے وقار ٹھیرانا چاہتے ہیں! حالانکہ دنیا جانتی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی احادیث کو جس حزم و احتیاط، ذمہ داری اور خدا ترسی کے ساتھ جمع کیا گیا ہے، فن تاریخ کو درایت و روایت کی وہ بلندیاں کہاں نصیب ہیں

جن حدیثوں میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے نماز پڑھنے کی تفصیل بیان کی گئی ہے کیا وہ محض تاریخی واقعات ہیں، اُن میں مسلمانوں کے لئے کوئی نمونہ نہیں ہے؟ اگر پرویز صاحب دین قرآن کو اسی انداز پر سوچتے ہیں تو پھر اُن کے غور و فکر کے نتائج سے اللہ تعالیٰ مسلمانوں کو محفوظ رکھے۔

جن احادیث میں حضور کسی کام کے کرنے کا حکم دیتے ہیں، اور کسی کام کے کرنے سے روکتے ہیں ——— کیا یہ اوامر و نواہی بکرماجیت، سکندر، قسطنطین، ہارون الرشید، بابر اور اکبر کے احکام کی طرح ہیں جو وہ اپنی رعایا یا ماتحت حاکموں کو دیا کرتے تھے، ان میں کیا کسی قسم کا کوئی فرق نہیں ہے؟

کیا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تاریخ کے صرف ایک ہیرو تھے؟ اور منصب رسالت کی جن ذمہ داریوں کو آپ نے پورا کیا تھا اور جو کتب احادیث کے اوراق پر آج تک ثبت ہیں ——— کیا آپ کی وفات کے بعد وہ معاذ اللہ "OUT OF DATE" ہو کر رہ گئیں!

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد صحابہ کرام سے بڑھ کر قرآن کا جاننے والا اور کون ہو سکتا ہے کہ ان نفوس قدسیہ نے براہ راست ہبط وحی سے تعلیم پائی تھی اور اسی کی تربیت نے ان کی زندگیوں کو سنوارا تھا ——— تو کیا احادیث اور سیر و تاریخ میں ایک دو نہیں ہزاروں ایسے واقعات نہیں ملتے کہ صحابہ کرام نے دینی معاملات میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت (احادیث) کو حجت سمجھ کر اس کا اتباع کیا ہے!

احادیث کے پرکھنے اور جانچنے کے لئے رجال و اسانید کا جو فن مدون ہوا ہے، وہ خالص علمی اور تحقیقی نقطۂ نگاہ سے مسلمانوں کا اتنا بڑا کارنامہ ہے کہ دنیا کی کوئی قوم آج تک اس کا جواب پیش نہیں کر سکی، اور اس فن میں محدثین اپنا کوئی حریف نہیں رکھتے ——— پرویز صاحب اور اُن کے حواریین مسلمانوں کے اس قابل فخر کارناموں کو مشکوک، مشتبہ اور بے اعتبار ٹھیرانے کے لئے جان توڑ کوشش کر رہے ہیں۔

تاریخ دنیا کے کسی پیشوا، لیڈر اور بڑے آدمی کا پتہ نہیں دیتی کہ جس کی زندگی کو حضور نبی کریم علیہ الصلوٰۃ والتسلیم کی سیرت مقدسہ کی طرح محفوظ کیا گیا ہو، انسان جتنی امکانی کوششیں کر سکتا ہے اور جس قدر احتیاط اور دیانت برت سکتا ہے وہ پوری ذمہ داری کے ساتھ احادیث کی جمع و ترتیب اور تدوین میں صرف کی گئیں ——— اللہ تعالیٰ کی اس میں بڑی حکمت پنہاں ہے کہ قرآن کی حفاظت اس نے اپنے ذمہ لی اور مہبط قرآن کے اقوال و افعال (احادیث) کی حفاظت کی ذمہ داری اہل ایمان پر ڈال دی اور اللہ کا شکر ہے کہ صحابہ کرام نے، تابعین نے اور محدثین نے اس ذمہ داری کو جس احتیاط، اخلاص جوش اور محبت کے ساتھ پورا کیا ہے اس کی نظیر کسی نبی اور رسول کی امت میں نہیں ملتی ———

حقیقت میں "خاتم النبیین" کی سنت اس کی مستحق تھی کہ اسے پوری تفصیل اور تمام جزئیات کے ساتھ محفوظ کرلیا جائے!

نقد و احتساب مگر پرویز صاحب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی مقدس احادیث کی مخالفت میں اس گراوٹ تک پہونچ چکے ہیں جہاں ضمیر بے حس، قلب مردہ، بصیرت زائل اور عقل مخبوط ہوجاتی ہے ——— اس تلخ نوائی کے لئے افسوس ہے کہ ہم معذور ہیں اور وہ اس لئے کہ مسٹر پرویز نے احادیث کی جمع و تدکیر کی کوششوں کو "قرآن کے خلاف عجمی سازش" سے تعبیر کیا ہے، اور ان کے اس شرمناک الزام کی زد ان نفوس قدسیہ پر جاکر پڑتی ہے، جو نہ صرف محدثین تھے بلکہ حاملینِ قرآن بھی تھے اور جن کے خدا اور بندوں کے ساتھ معاملات عدل و اخلاص اور خشیت و تقویٰ پر مبنی تھے!

خلفاء راشدین کے عہد سے لے کر اس ہمارے زمانہ تک اسلام کی تاریخ میں ایک لمحہ بھی ایسا نہیں گزرا کہ علماء، صلحاء اور خواص و عوام نے رسول اللہ کی سنت کو دین میں قابلِ حجت نہ سمجھا ہو ——— مگر پرویز صاحب کے نقطہ نگاہ سے ساڑھے تیرہ سو سال سے پوری امت قرآن کے خلاف "عجمی سازش" میں دانستہ یا نادانستہ شریک مبتلا رہی ہے!

قرآن کے خلاف سازش کرنے کے بعد مسلمان، مسلمان ہی کب رہتا ہے، یہ تو کھلا ہوا کفر ہے تو پرویز صاحب کے کہنے سے کیا ہم تمام محدثین کو معاذ اللہ بے دین اور قرآن کے خلاف سازش کرنے والا سمجھ لیں! اور تفسیر، حدیث، فقہ اور اسلامی تاریخ کی تمام کتابوں کو آگ لگا کر اور تمام متقدم اور متاخر اکابر دین کو چھوڑ کر، پرویز صاحب کو اہل ذکر، راسخ العلم اور مصلح و مجدد مان لیں!

یہ خود پرویز صاحب (علیہ ما علیہ) کے دل کا چور ہے، جو اس طرح ظاہر ہو رہا ہے، قرآن کے نام پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی احادیث کو بے اعتبار ٹھیرانا حقیقت میں دین کے خلاف سازش ہی جن بزرگوں نے بستی بستی پھر کر رسول اللہ کی احادیث کو جمع کیا ہے، سماعِ حدیث کے لئے سیکڑوں میل کے سفر کئے ہیں، پھر احادیث کے پرکھنے اور جانچنے کے لئے درایت و روایت کے معیار و اصول مقرر فرمائے ہیں، ان سے بڑھ کر دین کا خیر خواہ اور کون ہو سکتا ہے، پوری امت مسلمہ پر ان کی کوششوں کا احسان ہے ——— مگر پرویز کی نگاہ بد بیں میں اتنی عظیم الشان خدمتِ دین "عجمی سازش" نظر آتی ہے۔

اس موقع پر کہا جا سکتا ہے کہ مسلمانوں میں بعض ایسے بدبخت بھی گزرے ہیں، جو کذاب اور وضاع

تھے اور جھوٹی حدیثیں بیان کرتے تھے ــــــ یہ بات یقیناً صحیح ہے کہ حدیثیں وضع بھی کی گئی ہیں، مگر یہ کتنا بڑا ظلم ہے کہ چند جھوٹوں کو دیکھ کر سیکڑوں "سچوں" کو بھی ہم انھی جھوٹوں کا بھائی بند سمجھ لیں!

ایک مثال دـــــ کبھی کبھی ایسا بھی ہوتا رہا ہے اور ہوتا رہتا ہے کہ بعض لوگ دواؤں میں زہر ملا دیتے ہیں، جس کے اثر سے موت تک واقع ہو جاتی ہے ــــــ تو ان چند ظالموں اور جعل سازوں کی اس حرکت کی وجہ سے یہ سمجھ لیا جائے کہ "فن طب" انسانی جانوں کے خلاف ایک سازش ہے، اور جتنے دوا خانے، ہسپتال، لیبارٹریز اور دواؤں کی دوکانیں ہیں اُن کو آگ لگا دی جائے! اور تمام ڈاکٹروں اور طبیبوں کے بارے میں یہ رائے قائم کرلی جائے کہ یہ سب کے سب قاتل، ظالم اور سازشی ہیں۔

احادیث پر بھی اس مثال کا انطباق ہوتا ہے اور یہ مثال بہت سے شکوک و شبہات کا ازالہ کرسکتی ہے، مگر وہ لوگ جو،

فی قلوبھم مرضٌ فزادھم اللہ مرضا

کے مصداق ہیں، اُن پر کوئی نصیحت اور موعظت کارگر نہیں ہوسکتی۔

پرویز صاحب اور ڈاکٹر جیلانی برق جیسے کم سواد اہل قلم بعض احادیث کی کمزوریاں دکھا کر لوگوں پر یہ دھونس جمانا چاہتے ہیں جیسے یہ سب اُن کی تحقیق اور ریسرچ کے علمی نتائج ہیں، حالانکہ خود محدثین نے متعدد احادیث کی علتوں اور کمزوریوں کو ظاہر کیا ہے اور اس پر ان کی کتابیں موجود ہیں ـــــ زرکشی، ابن جوزی، صنعانی، عسقلانی، سخاوی، ذہبی، ابن تیمیہ، ملّا علی قاری (رحمہم اللہ تعالیٰ) یہ وہ چند ناقدین حدیث ہیں جنھوں نے دودھ کا دودھ اور پانی کا پانی الگ کرکے رکھ دیا ہے۔

محدثین پر اللہ کی رحمت ہو کہ اُنھوں نے احادیث کے پرکھنے میں انتہائی دیانت اور ذمہ داری کا ثبوت دیا ہے اور جس حدیث میں جو کمزوری اور سقم انھیں نظر آیا ہے اُنھوں نے بلا تامل ظاہر کردیا ہے، اگر وہ اس معاملہ میں معاذ اللہ بدنیت ہوتے تو وہ ان عیوب سے صرف نظر بھی کرسکتے تھے ــــــ

مثلاً حسناتُ الابرارِ سیئاتُ المقربین

حدیث مشہور ہوگئی ــــــ اس قول میں کوئی ایسی بات بھی نہیں ہے جس پر گرفت کی جاسکے لیکن محدثین نے پتہ لگایا کہ یہ حدیث نہیں ہے بلکہ ابو سعید خزار رحمۃ اللہ علیہ کا قول ہے! موضوعاتِ کبیر اور

تذکرۃ الموضوعات میں متفق طور پر بھی لکھا ملتا ہے۔

صحابہ کرام کے بعد تابعین کا درجہ ہے، مگر جن تابعین نے اسرائیلی روایتیں بیان کی ہیں ان کی بھی محدثین نے نشان دہی کر دی ہے! اسلامی لٹریچر میں جرح و تعدیل کا فن تحقیق، فکر و تعمق اور عدل و دیانت کے اعتبار سے اپنی آپ مثال ہے۔

کسی بھی محدث، فقیہ اور عالم نے یہ نہیں کہا کہ احادیث کے جتنے مجموعے پائے جاتے ہیں، اُن کا ایک ایک لفظ صحیح ہے اور اُن کی ہر روایت دین میں حجت ہے! احادیث کی کتابوں کے بھی درجات ہیں، سب ایک برابر نہیں ہیں اور نہ تمام احادیث ایک درجہ کی ہیں! قرآن اور حدیث میں امتیازی فرق یہ ہے کہ قرآن کی کسی آیت پر جرح نہیں کی جا سکتی مگر حدیث پر جرح کی جا سکتی ہے، امام مالک اور بخاری و مسلم (رحمہم اللہ تعالیٰ) کو بھی ہم معصوم نہیں سمجھتے اور اُن کی جمع کی ہوئی حدیثوں میں سے کوئی حدیث اگر آج بھی درایت، روایت اور قرآنی معیار پر پوری نہ اُترے تو اُسے چھوڑا جا سکتا ہے، مگر جو حدیث اس کسوٹی پر پوری ثابت ہو وہ یقیناً دین میں حجت ہے اور حضور سید الاولین والآخرین علیہ الصلوٰۃ والتسلیم کے ثابت شدہ قول کو اہلِ نفاق اور اہلِ ضلالت ہی رد کر سکتے ہیں، کوئی مسلمان جس کے دل میں ایمان کی رمق بھی پائی جاتی ہے ایسی جرات کر کے اپنے دین اور ایمان کو برباد نہیں کر سکتا۔

"منکرین حدیث" مسلمانوں کو ایک دھوکا یہ بھی دیتے ہیں کہ احادیث قرآن پر اضافہ ہیں اور اس طرح قرآن کی جامعیت اور شانِ تکمیل پر حرف آتا ہے ـــــ یہ بہت بڑی جاہلانہ بات ہے اس لئے کہ کسی متن کی شرح متن پر اضافہ نہیں ہوا کرتی، ہم (بلا تشبیہ) عرض کرتے ہیں کہ دیوانِ غالب کی شرحیں کیا غالب کی شاعری پر اضافہ ہیں؟

یہ منکرین حدیث کی طبع نازک پر احادیث رسول گراں گزرتی ہیں تو وہ اس کا شکوہ اللہ تعالیٰ سے کریں کہ اس نے کتاب کے ساتھ معلم کتاب کو کیوں بھیجا، اور تنزیلِ قرآن کے سلسلہ میں ایک انسان کو مخصوص کرنے کی کیا ضرورت تھی، وحی کو عام ہونا چاہئے تھا۔ اور پھر اللہ تعالیٰ نے آخر یہ کیا کیا کہ جس پر وحی بھیجی اُس کی اطاعت کو اپنی اطاعت کی طرح لازم قرار دیا اور اُس کے اسوۂ حسنہ کو معیار انسانیت ٹھیرایا۔ ... ...

قرآن پاک کہتا ہے کہ یہ رسولؐ تزکیۂ نفس کرتے ہیں اور کتاب و حکمت کی تعلیم دیتے ہیں ـــــ

اور یہ بھی ارشاد ہوتا ہے :-

وما ینطق عن الھوی ان ھو الا وحی یوحیٰ

تو جس وقت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم صحابہ کرام کو تزکیۂ نفس اور کتاب وحکمت کی تعلیم دیتے ہوتے تھے تو آپ کے نطق سے "وحی یوحیٰ" کی صفت کیا علیحدہ اور جدا کرلی جاتی تھی —— تھوڑی دیر کے لئے فرض کرلیا جائے کہ حضورؐ کتاب وحکمت کی تعلیم اپنی سمجھ اور اپنی رائے سے دیتے تھے اور وحی الٰہی کو اس میں دخل نہ ہوتا تھا تو پھر ہم عرض کرتے ہیں کہ رسول کی فہم وبصیرت سے زیادہ صحیح اور حضورؐ کی رائے سے بڑھ کر رائے اور کس کی ہوسکتی ہے ؟

تفسیر بالرائے دین میں، قرآن میں، اللہ کی آیات میں اور مظاہر قدرت میں ہر شخص کو تدبر کرنے کی اجازت ہے اور قرآن پاک میں تو تدبر وتفکر کی بار بار دعوت دی گئی ہے، مگر اس تدبر وتفکر کی بھی کچھ حدود ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے غور وفکر کی دعوت دے کر لوگوں کو اس بات کی چھٹی نہیں دیدی کہ وہ کتاب اللہ میں غور وفکر کرنے کے بعد جس نتیجہ پر چاہیں پہونچ جائیں اور جو کچھ اُن کی عقل کا فیصلہ ہو اُسی کو قرآن کا صحیح مفہوم اور اللہ تعالیٰ کا عین منشا سمجھ لیں! مثلاً ایک شخص قرآن میں غور وفکر کرنے کے بعد نیک نیتی کے ساتھ اس نتیجہ پر پہونچتا ہے کہ ملائکہ اور اجنہ بھاپ اور روشنی کی طرح قوتوں کے نام ہیں، یہ کوئی مستقل مخلوق نہیں ہیں! اس نتیجہ میں بظاہر چاہے کتنی ہی تنویر فکر پائی جاتی ہو، مگر یہ نتیجہ کتاب وسنت کے منشار کے مطابق نہیں ہے اس لئے غلط اور گمراہ کن ہے اور اسی کو "تفسیر بالرائے" کہتے ہیں۔

مسٹر پرویز نے قرآن کی شرح وتفسیر میں "تفسیر بالرائے" کا ریکارڈ قائم کردیا ہے! قرآن کریم کی مظلومیت کی انتہا ہے کہ اس کے "مفسرین" میں پرویز جیسے لوگ بھی شامل ہیں، جنھوں نے کتاب اللہ کی تفسیر ناول اور افسانہ کے رنگ میں کی ہے اور دین کو بازیچۂ اطفال بنا دیا ہے، ایک شخص کے ہاتھ میں قلم ہے اور لکھنے لکھانے کی مشق بھی ہے، اسی کے زور پر جو جی میں آتا ہے لکھے چلے جاتا ہے اور اپنی ان "سفوات" کو قرآن کی معارف وغوامض سے تعبیر کرتا ہے۔

قرآن پاک میں جگہ جگہ "آخرت" کا لفظ ملتا ہے، اور اس لفظ سے تقویٰ، خشیت الٰہی، روزِ حساب کی جواب دہی اور اسی قسم کے تمام پاکیزہ معتقدات کا سلسلہ وابستہ ہے، "آخرت" کا نام سن کر گناہگار سے

گناہ گار مسلمان کا بھی دل ہل جاتا ہے ——— مگر پرویز صاحب نے "آخرت" کی اس اہمیت کو غارت کرنے کے لئے اس کا ترجمہ "مستقبل" کیا ہے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اللہ کی کتاب کے معلم تھے اور صحابہ کرام کو حضورؐ نے کتاب اللہ کی تعلیم دی تھی، انھی واسطوں اور ذریعوں سے ہم قرآن کو اچھی طرح سمجھ سکتے ہیں، جب یہ واسطے ہی درمیان سے اٹھا دیے جائیں اور ایک شخص قرآن فہمی کے زعم میں اپنی عقل و بصیرت کو معیار بنا لے تو اس کی تفسیر گمراہ کن افکار، غلط نتائج اور خود ساختہ نظریوں کا طومار نہ ہوگی تو اور کیا ہوگی؟

قرآن پاک میں "اقیموا الصلوٰۃ" جگہ جگہ آیا ہے اور یہ بات مسلمان تو مسلمان کسی کافر اور ملحد کے نزدیک بھی مشتبہ نہیں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نماز پڑھتے تھے، نماز پڑھاتے تھے اور حضورؐ کی بعثت سے لے کر آج تک مسلمان نماز پڑھتے چلے آئے ہیں ——— مگر پرویز صاحب نماز کے بارے میں یہ رائے رکھتے ہیں:-

"اقامتِ صلوٰۃ کو مسلمانوں نے نماز میں تبدیل کر دیا ...."

اس طنز کی زد عام مسلمانوں پر ہی نہیں بلکہ خود ذات رسالت مآب پر جا کر پڑتی ہے، اس لئے کہ اللہ تعالیٰ نے "اقامتِ صلوٰۃ" کا جو حکم دیا تھا اس کی تعمیل میں حضورؐ نماز ادا فرمایا کرتے تھے، اگر نماز پڑھنا اقامتِ صلوٰۃ کی بدلی ہوئی شکل ہے تو اس کا الزام (خاک بدہن گستاخ) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر آتا ہے، نہ آپ نماز پڑھتے، اور نہ صحابہ کرامؓ اس کا اتباع کرتے اور نہ مسلمانوں میں یہ طریقِ عبادت عام ہوتا۔

یہ ہے اس "مفسرِ قرآن" اور "نظام ربوبیت" کے داعی کا اندازِ فکر، نہج تدبر اور پروگرام بھی! پرویز صاحب کے افکار اگر مسلمانوں میں خدانخواستہ مقبول ہو گئے، تو دین کی عمارت کا کوئی ستون بھی سلامت رہ سکے گا؟ یہ دین نہیں بے دینی ہے، یہ قرآن کے ساتھ مذاق ہے، یہ اللہ کی آیتوں کا مضحکہ اور منصب رسالت کا کھلا ہوا انکار ہے۔

باطل کی حمایت

مغرب زدہ اشخاص کا جس طرح خاصہ ہے کہ وہ جب دین کے کسی رکن یا نظریہ کو قبول کرنا نہیں چاہتے تو اس پر "دین ملا" کی پھبتی چست کر دیتے ہیں، ان پرویز صاحب نے بھی یہی انداز اختیار کیا ہے اور وہ "ملا ازم" کی طنز کی آڑ میں اسلام کا مذاق

اڑاتے رہتے ہیں۔

نگار کے ایڈیٹر نیاز فتحپوری نے شروع میں "مولوی" کا مذاق اڑایا تھا، ان حضرت کو تمام دنیا کی برائیاں مولوی میں نظر آتی تھیں اور اس میں علماء سوء اور علماء حق کی کوئی تفریق نہیں تھی ——— پھر انھوں نے فقہ کو باطل ٹھیرایا، اس کے بعد احادیث پر ہاتھ صاف کیا یہاں تک کہ قرآن کریم بھی اس شخص کی تنقید سے محفوظ نہ رہ سکا ——— پرویز صاحب بھی انھی لائنوں پر دین کی تخریب کر رہے ہیں۔ اور دین پر طنز و تنقید کے سلسلہ میں انھوں نے نیاز فتحپوری کا انداز اڑا لیا ہے۔

نیاز نے "مولوی" پر طنز کی آڑ میں جنت کا جنت کی نہروں کا، حوروں کا اور وہاں کی نعمتوں کا دل کھول کر مذاق اڑایا ——— اور پرویز نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی معراج کے سلسلے میں جو تفصیلات احادیث میں ملتی ہیں اُن پر پھبتیاں کسیں اور اُن احادیث کے پیش کرنے والے ایک بہت بڑے اسلامی مفکر کو "ماڈرن ملّا" کا خطاب دیا ——— ضلالت کے یہ دونوں راستے شاید ایک ہی دوراہے سے پھٹتے ہیں۔

پرویز صاحب کو متاثرین اور "ADMIRERS" کی ایک ٹولی جو مل گئی ہے تو اس نے اُن کو اس غلط فہمی میں مبتلا کر دیا ہے کہ میں تجدید و احیاء دین کے منصب پر فائز ہوں اور قرآنی علوم پر میری ذات سند ہے اور مجھ سے بہتر قرآن کا جاننے والا آج تک پیدا نہیں ہوا ——— پرویز صاحب اس بھلاوے میں نہ رہیں کہ یہ جو اُن کو چند ہم خیال ہاتھ آگئے ہیں تو یہ کوئی حق کی فتح و نصرت کی دلیل ہے، دنیا میں حق ہی کو نہیں باطل کو بھی ہمیشہ مؤیدین ملتے رہے ہیں، مسیلمہ کذاب کی جھوٹی نبوت نے کتنے سرفروش اور جاں بازارادتمندوں کو اپنے گرد جمع کر لیا تھا، خود پاکستان میں ڈیڑھ دو لاکھ کے قریب ایسے احمق موجود ہیں جو قادیان کے خود ساختہ اور کاذب نبی غلام احمد کی خانہ ساز نبوت پر ایمان رکھتے ہیں۔

اور آج کل تو لوگوں کو جدت پسندی کا ہیضہ ہو گیا ہے اس حماقت اور سفاہت کی کوئی انتہا ہے کہ ننگوں اور جھوٹوں کے کلب قائم ہیں اور لوگ اُن کے رکن بننے میں ذرہ برابر شرم محسوس نہیں کرتے۔

بمصطفیٰ برساں خویش را کہ دیں ہمہ اوست
اگر بہ او نہ رسیدی تمام بولہبی است

(فاران کے شکریہ کے ساتھ)

تعارف و تبصرہ

نظرۃ اجمالیۃ فی تاریخ الدعوۃ الاسلامیۃ فی الھند والپاکستان

از مولانا مسعود عالم صاحب ندوی، سائز خورد۔
۱۶۰ صفحات ـــــــ مطبوعہ قاہرہ
ملنے کا پتہ:۔ مرکزی مکتبہ جماعت اسلامی پاکستان
اچھرہ (لاہور)

کتاب جیسا کہ نام سے ظاہر ہے، عربی میں ہے۔ اردو میں اس کا نام ہوگا "ہند و پاکستان میں دعوت اسلامی کی تاریخ پر ایک اجمالی نظر"۔ یہ مصنف کی مفصل تصنیف کا خلاصہ ہو جو پہلے شایع کیا گیا ہو، امید ہو کہ اس کی اصل یعنی مفصل تاریخ بھی عن قریب شائع ہو جائے گی۔

وہ اصل تو غالباً تاریخ ہی ہوگی، مگر پیش نظر کتاب کے متعلق یہ کہنا غالباً زیادہ مطابق واقعہ ہوگا، کہ اس کا مقصد عالم عربی کو جماعت اسلامی سے متعارف کرانا ہو ـــــــ ورنہ اس کو اجمالی تاریخ کے بجائے ادھوری تاریخ کہنا پڑے گا، کیونکہ تاریخ دعوت اسلامی کے بعض گوشے، اس میں اجمالی طور سے بھی سامنے نہیں آئے ہیں ـــــــ مگر اس کا یہ مطلب نہیں ہو کہ جماعت کے تعارف کے سوا اس سے کچھ اور حاصل نہ ہوگا، نہیں! دعوت اسلامی کے بہت سے مشاہیر اور اداروں سے بھی عربی دنیا کو اس کتاب کے ذریعہ اجمالی تعارف حاصل ہوگا، اور ہم ہندوستان کے باشندے اس بات کے لیے مولانا کے ممنون ہیں کہ خود ان کے قلم سے ان کی حکومت کے اس پروپگنڈے کی تردید ہو گئی کہ "ہندوستان میں اب برائے نام مسلمان بستے ہیں" ـــــــ یہ بھی کتاب کا یقیناً ایک بہت بڑا فائدہ ہو۔

تذکرۃ الاعزاز

یعنی حضرت مولانا محمد اعزاز علی صاحب رشیخ الادب و الفقہ

دار العلوم دیوبند) کی سوانحعمری، از مولوی سید محمد انظر شاہ صاحب، صفحات ۱۱۲ ___ مجلد قیمت ۱۲/

ناشر:- مکتبۂ ابناء علامۂ انور شاہؒ، شاہ منزل، دیوبند

دار العلوم دیوبند کے فیض یافتگان میں سے شاید کوئی ایک بھی ایسا نہ ہوگا جو حضرت مولانا اعزاز علی صاحب مدظلہ کی علمی عظمت اور ان کی حیرت انگیز مہر و شفقت کے امٹ نقوش اپنے دل میں نہ لیے ہو. اسی کا اثر ہے کہ آپ کے ایک لائق شاگرد مولوی انظر شاہ صاحب کے دل میں یہ خواہش پیدا ہوئی کہ آپ کے حالات قلبند کرکے محفوظ کر دیے جائیں، امید ہے کہ اردو داں شائقین علم کو ایک ایسے مثالی استاد کے حالات زندگی سے ضرور فائدہ پہونچے گا۔

معلّم الانشاء (حصۂ اول)

از مولوی عبد الماجد صاحب ندوی (استاذ دار العلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ) صفحات ۱۸۰، کتابت وطباعت وکاغذ بہتر،

قیمت ایک روپیہ آٹھ آنے ___ ناشر:- دار العلوم ندوۃ العلماء، لکھنؤ

یہ کتاب عربی مدارس کے نصاب میں انشاء و ترجمہ کی کمی کو پورا کرنے کی غرض سے مرتب کی گئی ہے ___ کتاب پچیس اسباق پر مشتمل ہے، ہر سبق کی ترتیب اس طرح ہے کہ پہلے صرف و نحو کا کوئی ضروری قاعدہ بیان کیا گیا ہے، اور پھر اس قاعدہ کو جاری کرانے کے لیے اردو و عربی کی مشقیں دی گئی ہیں، اور ان مشقوں میں دلچسپی کے ساتھ سبق آموزی کا بھی التزام کیا گیا ہے.

ہمیں امید ہے کہ اس کتاب سے طلبہ میں عربی زبان کی استعداد بھی پیدا ہوگی، اور دینی رجحانات پیدا کرنے میں بھی مدد ملے گی، جو ان مدارس کا اصل مقصد ہے.

تمرین النحو

از مولوی محمد مصطفےٰ صاحب ندوی و عبد الماجد صاحب ندوی، ۱۳۶ صفحات، قیمت ایک روپیہ ___ یہ بھی دار العلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ سے ملے گی.

عربی مدارس میں عام طور پر ابتدائی صرف و نحو جس طرح پڑھائی جاتی ہے، اس میں دو باتیں ہیں، ایک یہ کہ کتابوں کی زبان فارسی ہوتی ہے، دوم یہ کہ صرف قواعد پڑھائے اور رٹائے

جاتے ہیں، ان کے اجراء اور تطبیق کی عملی مشق نہیں کرائی جاتی —— زیر تبصرہ کتاب کی تالیف اس خیال کی بناپر کی گئی ہے کہ یہ دونوں باتیں قابل ترک ہیں۔ اور ان کے بجائے یہ ہونا چاہیے کہ قواعد کی تعلیم بچوں کو ان کی مادری زبان میں دی جائے، اور عملی مشق و تمرین پر زیادہ زور دیا جائے، چنانچہ یہ کتاب اسی انداز میں لکھی گئی ہو۔

نور (پندرہ روزہ) یہ رسالہ ادارہ الحسنات رام پور سے چھوٹے بچوں کے لیے نکلنا شروع ہوا ہے —— سالانہ چندہ تین روپے آٹھ آنے ہو، اور ایک کاپی کی قیمت ڈھائی آنے ہے۔

بچوں کی نفسیات کو سمجھنا، اور سنجیدہ باتوں کو ان کے لیے دلچسپ اور آسان بنا دینا، واقعہ یہ ہے کہ بہت مشکل کام ہے، مگر بعض لوگوں کو اس سے خاص مناسبت ہوتی ہے —— مولانا ابو سلیم محمد عبدالحئی صاحب مدیر "الحسنات" بھی انھیں لوگوں میں سے ہیں، انھیں اللہ تعالیٰ کی طرف سے اس کا خاص سلیقہ اور ملکہ عطا ہوا ہے، اور وہ اس دین سے خوب کام لے رہے ہیں، اب تک وہ یہ کام "الحسنات" کے ذریعہ کر رہے تھے، مگر اب اس کی سطح کچھ بلند ہوتی جا رہی ہے، چنانچہ اب ایک دوسرا پندرہ روزہ (یعنی نور) نکالنا شروع کیا ہو جو صرف بچوں کے کام کا ہو، اس میں ظاہری دلکشی کا بھی اچھی طرح اہتمام کیا گیا ہے تاکہ بچہ کھلونا سمجھ کر اٹھا لے، اور مضامین بھی اس طرح کے کہ بچے پڑھیں تو دلچسپی کی خاطر، مگر ان کے ناشگفتہ دل و دماغ میں دینی روح سرایت کر جائے۔

جو بچے سرکاری اسکولوں کی دین کش فضا میں تعلیم پاتے ہوں ان کے سرپرستوں کو تو ضرور ہی نور سے فائدہ اٹھانا چاہیے۔

الحسنات حدیث نمبر مرتبہ مولانا ابو سلیم محمد عبدالحئی صاحب (ایڈیٹر رسالہ) اس نمبر کی قیمت ایک روپیہ چار آنے، ضخامت ۱۴۰ صفحات

ملنے کا پتہ:- دفتر رسالہ الحسنات، رام پور

پندرہ روزہ الحسنات کے اس خاص نمبر میں حدیث پر مختلف پہلوؤں سے مضامین لکھے گئے ہیں۔ بعض مضامین، دین میں حدیث کی اہمیت واضح کرنے والے ہیں، بعض سے صاحب حدیث (رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم) کے منصب رسالت کے متضمنات پر روشنی پڑتی ہے، اور بعض میں ان شکوک کو رفع کرنے کی کوشش کی گئی ہے جو حدیث و سنت کے حجت ہونے کے بارے میں پھیلائے جا رہے ہیں۔ ایک مضمون فنِ حدیث کی اصطلاحات سے متعلق ہے، ان کے علاوہ اور بھی چند مضامین ہیں جن میں خاص مسائل پر احادیث کی روشنی میں غور کیا گیا ہے، مثلاً قبرِ الٰہی، عورت کے حقوق، اور اجتماعی معاملات وغیرہ۔

چند اہم کتابیں

علم الفقہ

از

حضرت مولانا عبدالشکور صاحب مدظلہ

اس کتاب میں ہر چیز کے متعلق جسقدر احکام ہیں وہ سب ایک جگہ جمع کر دیے گئے ہیں تاکہ ہر شخص کو مسئلہ نکالنے میں آسانی ہو۔ نیز ہر مسئلہ میں وہی قول لکھا گیا ہو جس پر فتویٰ ہے، مختلف اقوال اور روایات کا ذکر اس لیے نہیں کیا گیا کہ دیکھنے والے کے ذہن میں انتشار نہ پیدا ہو!

بعض مسائل کو ضرورت کا لحاظ کرکے دلیلیں بھی دی گئی ہیں، زمانہ کے بدلنے سے جو احکام بدل گئے ہیں ان کا بھی تفصیل سے ذکر آگیا ہو، جن معتبر کتب سے مسائل نقل کیے گئے ہیں ان کا حوالہ صفحہ و سطر کے ساتھ لکھ دیا گیا ہے، تاکہ اصل تلاش کرنے والوں کو زحمت نہ ہو

فقہ میں اردو میں بے نظیر کتاب ہے، قیمت مکمل لعہ

اسلام کا نظام مساجد

اسلام کے نظام مساجد کے تمام گوشوں، اور تمام پہلوؤں پر ایک معتبر و مستند، جامع و مکمل کتاب جو ہماری زبان میں پہلی مرتبہ وجود میں آئی ہو، بڑے بڑے عنوانات ملاحظہ ہوں، قدرتی نظام اجتماع، دعوت اجتماع، قدرتی نظام وحدت، باطنی اصلاح، دربار الٰہی، اسلام کی نظر میں، مسجدوں کی تزئین، مواضع مسجد، دربار الٰہی میں دنیا کے کام، دربار الٰہی کی صفائی۔ وقف اور تولیت، متفرق احکام مساجد۔

ابتدا میں نقاب کشائی کے عنوان سے حضرت مولانا سید مناظر احسن صاحب کا ایک مختصر تعارف ہو۔ جس کے آخر میں موصوف تحریر فرماتے ہیں " عربی میں شام کے ایک عالم جمال الدین القاسمی کی کتاب اس باب میں مشہور تھی، مگر میرا خیال ہو کہ احتوا و احاطہ میں مولانا ظفیر الدین کی کتاب کو دیکھ کر کم ترک الاول للآخر کا اعتراف کرنا پڑتا ہو۔ تقطیع ۲۰×۲۶ صفحات ۲۴۴، قیمت تین روپے آٹھ آنے

مجلد چار روپے آٹھ آنے

مَا اٰتٰکُمُ الرَّسُوْلُ فَخُذُوْہُ وَمَا نَھٰکُمْ عَنْہُ فَانْتَھُوْا

معارف الحدیث

یعنی

"احادیثِ نبوی کا ایک جدید انتخاب"

اُردو ترجمہ اور تشریحات کے ساتھ

جو

اِس زمانہ کے عام تعلیم یافتہ مسلمانوں کی علمی سطح اور فِکری حالت کو

پیشِ نظر رکھ کر مُرتّب کیا گیا ہے!

جلد اوّل

"کِتابُ الایمان"

تالیف

محمد منظور نعمانی

نکتہ سنجاں را صلائے عام دہ   از نبیِ اُمّیِ پیغام دہ

پیشکش

اُن سب اخوانِ دینی کی خدمت میں ——— جو

"نبیِ اُمّیِ" "سیدنا حضرت محمد عربی (فداہ اُمّی وابی وروحی وقلبی) پر ایمان رکھتے ہیں، اور
آپ کی ہدایت اور اُسوۂ حسنہ کی پیروی ہی میں اپنی، اور تمام اولادِ آدمؑ کی نجات یقین
کرتے ہیں ——— اور اِسلئے آپ کی تعلیم اور طرزِ زندگی سے صحیح واقفیت حاصل کرنا چاہتے ہیں،
آیئے! علم و تصوّر ہی کے راستہ سے مجلسِ نبویؐ میں حاضر ہو کر آپ کے ارشادات سُنیں، اور
اِس چشمۂ انوار سے اپنے تاریک دلوں کیلئے روشنی حاصل کریں!

عاجز و عاصی
محمد منظور نعمانی عفا اللہ عنہ

فہرست مضامین "معارف الحدیث" کتاب الایمان ۔ بقیدِ صفحہ

تمت

ماہنامہ الفرقان لکھنؤ

ہماری دعوت

لا الٰہ الا اللّٰہ محمد رسول اللّٰہ

اسی کلمہ پر اسلام کی بنیاد ہے اور ہمارا ایمان ہے کہ یہی انسانیت کی نجات کا کلمہ ہے
لیکن یہ صرف ایک بول ہی نہیں ہے، بلکہ ایک شہادت، ایک اصول اور ایک اہم فیصلہ ہے، در اصل یہ
اس بات کا عہد ہے کہ ہم صرف اللہ کی عبادت اور بندگی کریں گے اور زندگی کے ہر شعبہ میں اس کی بھیجی ہوئی
اور حضرت محمد صلعم کی لائی ہوئی ہدایت اور شریعت کی پیروی کریں گے اور اسی حال میں جئیں گے اور مریں گے۔
جو لوگ اس کلمہ پر ایمان لا چکے ہیں ان کا فرض ہے کہ زندگی اس عہد کے مطابق گزاریں اور اسی ایمانی
زندگی کو دنیا میں رواج دینے کی کوشش کریں، وہ اسی لیے پیدا ہوئے ہیں۔ ہم اس کا
عہد کرتے ہیں اسی کی دعوت دیتے ہیں اور اسی پر جینا اور مرنا چاہتے ہیں۔

فاطر السمٰوٰت والارض انت ولیی فی الدنیا والآخرۃ
توفنی مسلما والحقنی بالصالحین

"ادارہ الفرقان"

مدیر و مسئول

محمد منظور نعمانی عفا اللہ عنہ

فی کاپی ...... آٹھ آنے

جلد ۲۱ | ماہ شعبان المعظم ۱۳۷۳ھ مطابق اپریل ۱۹۵۴ء | نمبر ۸

پاکستان میں چندہ:- سکریٹری ادارۂ اصلاح وتبلیغ، آسٹریلین بلڈنگ لاہور
کے نام بھیجئے اور ہمیں فوراً اطلاع دیجئے

تاریخ اشاعت ـــــ ہر انگریزی مہینے کی ۱۵ ر

اگر رسالہ نہ پہونچنے کی اطلاع ۲۵ تاریخ تک دیدی جائے تو دوبارہ بلا قیمت ارسال کر دیا جائے گا

اگر اس دائرہ میں سرخ نشان لگا ہے تو مطلب یہ ہے کہ آپ کا چندہ ختم ہو چکا ہے

سرخ نشان ◯ براہ کرم نئے سال کے لئے چندہ ارسال فرمائیں، ورنہ اگلا رسالہ بذریعہ
وی پی ارسال کیا جائے گا، وی پی چھ کا ہوگا

(مولوی) محمد منظور نعمانی پرنٹر وپبلشر نے نامی پریس لکھنؤ میں چھپوا کر دفتر الفرقان گوئن روڈ لکھنؤ سے شائع کیا

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

نگاہِ اولین

پچھلے مہینے ہمارے صوبہ یو۔پی میں جماعتِ اسلامی کے تین مرکزی رہنماؤں کو گرفتار کر کے جماعت کے خلاف جو قدم اٹھایا گیا ہے، اس پر ہندوستان کے تقریباً سبھی مسلم حلقوں کی طرف سے حیرت اور افسوس کا اظہار کیا گیا ہے، بلکہ صوبہ کے ایک مشہور غیر مسلم سیاسی لیڈر تک نے حکومت کے اس اقدام پر کڑی نکتہ چینی کی ہے۔ اور کوئی شبہ نہیں کہ یہ اقدام اسی حیرت و افسوس اور نکتہ چینی کا مستحق ہے مگر اس سے بھی زیادہ حیرت انگیز اور افسوسناک بات یہ ہے کہ حکومت نے اس احتجاج پر کان دھرنا تو درکنار ابھی تک اس سلسلہ میں کوئی وضاحتی بیان تک دینے کی ضرورت نہیں محسوس کی!

ہماری سمجھ میں نہیں آتا کہ یہ گرفتاریاں آخر کیوں عمل میں آئی ہیں، اور جماعتِ اسلامی کے ان رہنماؤں سے وہ کون سی خطا سرزد ہوئی ہے جس کی پاداش میں ان کی آزادی سلب کرلی گئی ہے۔ —— یہ نہ مسلمانوں کی کوئی جداگانہ سیاسی تنظیم کر رہے ہیں —— اگر اس کو جرم سمجھا جائے! نہ منافرت اور تشدد کا رجحان پھیلا رہے ہیں اور نہ فرقہ پرستی کے علمبردار ہیں۔ ان کا کام اور ان کے مقاصد خفیہ نہیں ہیں بلکہ صحیح معنی میں ایک کھلی ہوئی کتاب کی طرح ہیں کہ جس کا جی چاہے پڑھ کر دیکھ لے بلکہ یہ تو دعوت دیتے ہیں کہ ہر شخص پڑھ کر دیکھے —— اور ہمیں یقین ہے کہ جو بھی انھیں اور ان کے کام کو براہ راست جاننے کی کوشش کرے گا وہ اسی نتیجہ پر پہونچے گا کہ ان کی موجودہ تمام تر جدوجہد ایک پُرامن ذہنی انقلاب کے لئے ہے، جس کا کوئی تعلق کسی قسم کے تخریبی عزائم سے نہیں! ——

وہ جس قسم کا ذہنی انقلاب لانا چاہتے ہیں اُسے صرف مسلمانوں ہی کے لئے نہیں بلکہ وہ اسے پورے ملک کے لئے مفید سمجھتے ہیں اور ان کی نظر میں وہ ملک کی بھلائی اور تعمیر کے لئے سب سے زیادہ

ضروری چیز ہے ـــــ ہم جانتے ہیں کہ ملک کے موجودہ ناخداؤں کے اوران کے نقطہ نظر میں بہت بڑا اختلاف ہے مگر اس کا یہ مطلب تو نہیں ہے کہ مخالف نقطۂ نظر کے سلسلہ میں کسی پُر امن اور آئینی جد وجہد کو بھی شبہ کی نگاہ سے دیکھا ئے۔

لوگوں کا خیال ہے کہ حکومت نے کسی غلط فہمی کے باعث ایسا اقدام کیا ہے۔ مگر ہم تو یہ سمجھتے ہیں کہ یہ اقدام مسلمانوں کے بارے میں حکومت کی ضرورت سے زیادہ "بیداری" کا نتیجہ ہے، ایک طرف تو حال یہ ہے کہ غیر مسلم فرقہ پرست اپنے فرقہ پرستانہ عزائم ہی نہیں سرگرمیوں کے ساتھ ملک کے اس سرے سے اُس سرے تک دندناتے پھرتے ہیں، اوران سے کوئی بات تک پوچھنے والا نہیں! اور دوسری طرف اُن مسلم جماعتوں پر بھی کڑی نگرانی رکھی جاتی ہے جن کے دامن کو فرقہ پرستی چھو کر بھی نہیں گئی ہے (حتیٰ کہ وہ اس بات کو بھی غلط سمجھتے ہیں کہ ہندوستان کے مسلمان اپنے سیاسی حقوق کے لئے دوسروں سے کشمکش کریں) اور پارلیمنٹ اور اسمبلیوں میں ان کے متعلق سوال وجواب سے ایک عجیب قسم کے شک وشبہ کی فضا پیدا کی جاتی ہے!

ابھی لوگ علامہ سید سلیمان ندوی رحمۃ اللہ علیہ کا غم بھولے نہیں تھے کہ ان کے ایک لائق فخر شاگرد اور ندوہ کے چشم وچراغ مولانا مسعود عالم ندوی نے بھی پیچھے ہی پیچھے رخت سفر باندھ لیا اور بالکل اچانک یہ اطلاع ملی کہ مولانا موصوف کراچی میں انتقال کر گئے۔ انا للہ وانا الیہ راجعون!

لکھنؤ میں یہ خبر مولانا کے احباب ومتعلقین پر بجلی بن گری۔ تھوڑی دیر تک تو یقین کرنے کو جی نہیں چاہتا تھا ـــــ مگر جی نہ چاہنے سے کیا ہوتا ہے؟ اللہ تعالیٰ مرحوم کو اپنے آغوش رحمت میں جگہ دے اور ان کے پسماندگان خصوصاً ان کے بوڑھے والد ماجد کو اس صدمہ جانکاہ پر صبر او را جر وافر عطا فرمائے۔

مرحوم ایک قابل قدر شخصیت کے مالک تھے، ان کا علم وفضل ہندوستان وپاکستان ہی میں نہیں عالم اسلامی میں بھی مانا جاتا تھا اور ایک عرصہ سے وہ وہاں کے علمی حلقوں میں متعارف تھے، اُردو اور عربی پر یکساں قدرت رکھتے تھے از بان میں ملکت تھی اس لئے ان کے اصل جوہر تحریر میں کھلتے تھے، اپنے دیرینہ دوستوں کے بیان کے مطابق شرافت ومروت کا نمونہ تھے، لیکن دین

کے معاملہ میں اتنے ہی بے لاگ اور سخت تھے، کسی استخفاف اور استہزا کو برداشت نہیں کر پاتے تھے حضرت سید احمد شہید رحمۃ اللہ علیہ سے عشق کی حد تک تعلق رکھتے تھے اور شاید اسی نسبت کا اثر تھا کہ باوجود دمہ کے عارضہ سے نحیف و نزار رہنے کے اعلاء کلمۃ الحق کے لئے مہاجرت کی صعوبتوں کو گوارا کیا، اسی حالت میں قید و بند کا ذائقہ بھی چکھا اور آخری دم تک اس راہ میں مصروف عمل اور سرگرم سفر رہے جس کو انھوں نے اعلاء کلمۃ اللہ کے لئے منتخب کیا تھا، یہاں تک کہ اللہ کا پیغام آ پہنچا اور اس طرح وہ اسی سرزمین کے حصہ میں آ گئے جس کے حصہ میں تقسیم نے مشہد بالاکوٹ دیدیا ہے۔

حق مغفرت کرے عجب آزاد مرد تھا

اعلان

۱۔ ناظرین اور ایجنٹ صاحبان نوٹ فرمالیں کہ مئی میں رسالہ شائع نہیں ہوگا بلکہ رمضان اور شوال (دونوں مہینوں) کا یکجائی رسالہ جون میں حسب قاعدہ ۱۵ تاریخ کو شائع ہوگا، لہذا مئی میں رسالہ کا انتظار نہ فرمایا جائے۔

۲۔ کئی ماہ سے ڈاک خانہ کے قوانین پر سختی سے عمل درآمد ہو رہا ہے جس کا نتیجہ یہ ہے کہ اگر ہم ۱۵ تاریخ کے علاوہ کسی اور تاریخ کو رسالہ روانہ کرتے ہیں تو فی رسالہ ایک پیسہ کے بجائے، چھ پیسے کے ٹکٹ لگانا پڑتے ہیں۔ ایک طرف تو یہ سختی ہے اور دوسری طرف بدنظمی اور لاپرواہی کا یہ عالم ہے کہ اپنی امکانی احتیاط اور جانچ پڑتال سے رسالہ پوسٹ کرنے کے باوجود ہر ماہ کافی شکایتیں رسالہ نہ پہونچنے کی موصول ہوتی ہیں اور اس طرح ہر شکایت کے تدارک پر دفتر کے ۱۰/ بمد محصول ڈاک خرچ ہوتے ہیں۔ یہ بار ہم تقریباً چھ مہینے سے برداشت کر رہے ہیں۔ مگر اب مزید زیر باری کی طاقت نہیں ہے اس لئے مجبوراً یہ عرض کیا جا رہا ہے کہ آئندہ سے جن صاحب کو رسالہ نہ پہونچنے کی شکایت ہوگی، ان کو رسالہ اگلے مہینے کی ۱۵ تاریخ کو روانہ کیا جائے گا —— اور اگر کسی صاحب کو جلدی ہو تو وہ ۱/ چھ پیسے کا ٹکٹ بھیجیں یا بیرنگ منگائیں!

ناظم الفرقان لکھنؤ

طالبانِ علومِ نبوّت کا مقام اور اُن کی ذمہ داریاں

(از مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندوی)

اسی مارچ کے پہلے ہفتے میں دارالعلوم دیوبند کے طلبہ کی ایک انجمن نے رفیق محترم مولانا سید ابوالحسن علی ندوی کو اپنے ایک خاص جلسے کی صدارت کے لئے مدعو کیا اور حضرت مولانا سید حسین احمد صاحب مدنی مدظلہ سے اُن کے نام سفارش نامہ بھی لکھوایا ـــــ ہمارے اکثر ناظرین بھی جانتے ہوں گے کہ اس قسم کے جلسوں کی صدارت کی دعوت کا مطلب دراصل تقریر کرنے یا مقالہ پڑھنے کی دعوت دینا ہوتا ہے ـــــ اتفاق سے رفیق موصوف ان دنوں ایسے بیمار تھے کہ اُن کے اعزہ اور احباب کے لئے اُن کی بیماری سخت فکر اور تشویش کا باعث بنی ہوئی تھی لیکن انھوں نے اس دعوت کو منظور کر لیا اور ایسی حالت میں کہ کسی دوسرے کے لئے خط لکھنا بھی مشکل ہوتا وہ طویل و بسیط اور تاثیر سے لبریز مقالہ لکھا جس کو ناظرین کرام اگلے صفحات میں پڑھیں گے،

اس عاجز نے یہ مقالہ دیوبند سے اُن کی واپسی کے قریباً دو ہفتے کے بعد دیکھا اور بے اختیار زبان سے نکلا کہ یہ مقالہ آپ نے لکھا نہیں ہے بلکہ یہ آپ سے لکھوایا گیا ہے ـــــ اور میرے دل میں اس کا شدید داعیہ پیدا ہوا کہ ہمارے علم دینی کے حلقوں میں، خاص کر دینی درسگاہوں میں اس کو زیادہ سے زیادہ پہنچایا جائے اور پھیلایا جائے

مولانا موصوف ہی سے یہ بھی معلوم ہوا کہ دارالعلوم کے طلبہ کی اس انجمن کا ارادہ بھی اس کو شائع کرنے کا ہے، اس کے باوجود الفرقان کے صفحات میں بھی اس کو شائع کیا جا رہا ہے اور ضرورت سمجھی گئی تو مزید اشاعت کے لئے اور انتظام بھی انشاءاللہ کیا جا سکتا ہے، بہر حال اپنی استطاعت کی حد تک اس کی پوری کوشش کی جائے گی کہ زیادہ سے زیادہ دینی درسگاہوں

تک اور اُن سے تعلق رکھنے والے حضرات تک اس کو پہنچا دیا جائے

یہ مقالہ اگرچہ مقالہ ہی ہے کوئی کتاب نہیں ہے لیکن اپنا یہ احساس اور تاثر بے تکلف ظاہر کر دینے کو جی چاہتا ہے کہ اس عاجز کی نظر میں اس کی قیمت اور اہمیت سیکڑوں صفحات والی بہت سی کتابوں سے بھی زیادہ ہے اس لئے میرا جی چاہا کہ اُس کے ناظرین کو مقالہ کے متعلق میں چند ایسی باتیں اپنے ذاتی علم کی بنا پر اس کے مطالعہ سے پہلے بتلا دوں جن کے معلوم ہو جانے سے وہ اس کے وزن کو میری طرح محسوس کر سکیں۔ اور پھر اس کا مطالعہ ان کے لئے زیادہ فائدہ مند ہو۔

میری ان باتوں کا تعلق زیادہ تر بلکہ تمام تر اپنے محترم و محبوب رفیق کی ذات اور ان کی زندگی سے ہوگا اور میرا خیال ہے کہ میرے اُن کے تعلق کی جو نوعیت ہے اُس کے لحاظ سے اُن کے بارے میں اپنے ان احساسات و معلومات کو اُن کی زندگی میں میرا ظاہر کرنا دنیا کی عام رسم کے لحاظ سے اچھا نہ سمجھا جائے گا بلکہ بعض لوگ شاید نیت کے بارہ میں بدگمانی بھی کریں لیکن صرف دنیا کی رسم کے خیال سے یا کچھ بے چاروں کی بدگمانی کے اندیشہ سے کسی ایسی حقیقت کو ظاہر نہ کرنا جس کا اظہار اللہ کے بہت سے بندوں کے لئے بہت مفید ہو سکتا ہے عند اللہ کوئی اچھی بات نہیں، اس لئے ان سب چیزوں کو نظر انداز کر کے میں مقالہ کے ناظرین سے چند باتیں عرض کرنا چاہتا ہوں۔

---

(۱) پہلی بات یہ ہے کہ یہ مقالہ لکھنے والے کے قلم کی صرف قوالی ہی نہیں ہے بلکہ یہ اس کے دل کا درد اور یہی اُس کا حال ہے اور جن باتوں کی طرف دینی مدارس کے طلبہ اور فضلاء کو اس میں توجہ دلائی گئی ہے، اللہ کی خاص عنایت اور توفیق سے مقالہ نگار خود اس کا زندہ نمونہ ہے۔

(۲) دوسری بات مجھے یہ عرض کرنی ہے کہ اس عاجز کا سن تو اگرچہ ابھی پچاس سے بھی کم ہے لیکن زندگی مختلف میدانوں میں کچھ ایسی رواں دواں گزری ہے کہ اتنی ہی عمر میں بہت کچھ دیکھ لیا اور میں سمجھتا ہوں کہ میرا تجربہ اور میری واقفیت اتنی ہے کہ اپنی اس رائے کے اظہار کا مجھے

بجا حق ہے کہ ہماری اس دنیا میں ایسے لوگ بہت ہی کم پیدا ہوتے ہیں جن کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے ذہن ثاقب بھی ملا ہو اور دلِ روشن بھی، جو اس دوڑتی ہوئی اور کروٹیں بدلتی ہوئی دنیا کے حالات و مزاج اور اُس کے نت نئے تقاضوں سے پورے باخبر بھی ہوں اور دینی و ایمانی حقائق کے بارے میں وارثین انبیاء کی طرح صاحبِ یقین بھی ——— الغرض ہماری اس دنیا میں یہ جنس بہت ہی کمیاب ہے اور اللہ کے ایسے بندے جو ان دونوں صفتوں کے جامع ہوں اس عاجز نے غالباً اتنے بھی نہیں دیکھے جتنی کہ اپنے ایک ہاتھ میں انگلیاں ہیں لیکن جو دو چار دیکھے ہیں ان میں ایک ذات رفیق محترم مولانا سید ابوالحسن علی کی بھی ہے۔ اللہ کی خاص عنایت اور توفیق سے وہ صاحبِ نظر و فکر بھی ہیں اور صاحبِ قلب بھی، وہ اپنے علم و معلومات کے لحاظ سے جدید بھی ہیں اور ایمان و یقین اور رسوخ فی الدین اور طرز زندگی کے لحاظ سے قدیم بھی، اُن کی ذات میں مدرسہ بھی ہے اور خانقاہ بھی ——— اُن کی گہری علمی بصیرت اور دقت نظر کی شہادت کیلئے اُن کی ایک کتاب "ماذا خسر العالم بانحطاط المسلمین" کافی ہے جو گزشتہ دو ڈھائی برس ہی میں مصر میں بار بار چھپ کر ختم ہو چکی ہے اور اس وقت پھر چھپ رہی ہے۔

مصر کے نامور فاضل اور ممتاز اہل قلم سید قطب نے اُس پر جو مقدمہ لکھا ہے اُس میں انھوں نے کتاب اور مولف کتاب کے بارہ میں بالکل صحیح لکھا ہے کہ:۔

"اس کتاب کی ایک نمایاں خصوصیت یہ ہے کہ مصنف نے اسلام کے اصول و کلیات کو اُن کے وسیع دائرہ کے اندر اسلام کی صحیح روح کے مطابق سمجھا ہے، اس بناء پر یہ کتاب نہ صرف دینی و اجتماعی تحقیق علمی کا نمونہ ہے بلکہ اس کا بھی نمونہ ہے کہ اسلامی زاویہ نگاہ سے تاریخ کو کس طرح مرتب کرنا چاہیئے"

پھر چند سطر کے بعد لکھتے ہیں

بلا شبہ اس کتاب میں انسانی زندگی پر اثر ڈالنے والے تمام عوامل کا ایک مربوط اور منظم تصور ہے اسی مربوط و منظم تصور کے ساتھ تاریخ کا جائزہ لیا گیا ہے اور امت اسلامیہ کو ایسا مشورہ دیا گیا ہے جس میں اعتدال و تناسب پایا جاتا ہے، اور اسی خصوصیت کی بناء پر یہ کتاب تاریخ نویسی کا ایک کامیاب نمونہ ہے، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ایک مسلمان کو یورپ کے اسلوب نگارش سے بے نیاز ہو کر جس میں ارتباط و توازن، مورخانہ انصاف اور علمی تحقیق کی بالعموم کمی ہوتی

ہے) تاریخی مباحث پر کس طرح قلم اٹھانا چاہیے اور کس انداز سے اس کو مرتب کرنا چاہیے"

(مقدمہ "ماذا خسر العالم بانحطاط المسلمین" از سید قطب صفحہ ۱۱)

الغرض علم و فکر میں رفیق محترم کا جو خاص مقام ہے اور جو بالغ نظری اور حقیقت رسی اللہ تعالیٰ نے ان کو عطا فرمائی ہے اُس کو ان کی اسی ایک کتاب میں دیکھا جا سکتا ہے[1]۔ اور اُن کی زندگی کے دوسرے پہلوؤں کو اُن کے احباب و محبین اُن کی کتاب زندگی میں دیکھتے رہتے ہیں اور وہ پہلو کسی کتاب کے صفحات کے بجائے اوراقِ زندگی ہی میں دیکھے جا سکتے ہیں۔

معاف فرمایا جائے! بات میرے لئے کچھ لذیذ تھی اس لئے ذرا طویل ہو گئی ورنہ میں مقالہ کے ناظرین سے اُس کے مطالعہ سے پہلے صرف یہ عرض کرنا چاہتا تھا کہ وہ اس کو ایک "ندوی ادیب اور انشا پرداز مولوی" کا مقالہ سمجھ کر نہ پڑھیں بلکہ یہ جان کر پڑھیں کہ یہ حقیقتِ دین کے ایک واقف و عارف، ایک بالغ نظر مفکر، اور دل میں درد اور سوزش رکھنے والے کسی بندۂ خدا کا ایک مخلصانہ مشورہ اور دردمندانہ پیغام ہے۔

---

(۳) تیسری اور آخری بات مجھے ناظرین سے یہ عرض کرنی ہے کہ اس مقالہ میں علم دین کے حاملوں اور طالبوں کو دین اور علم دین کے بلند مقام کو پیش نظر رکھ کر دنیا اور متاع دنیا کو اُس کے مقابلہ میں حقیر و ذلیل سمجھنے کی اور فقر و افلاس کی حالت میں قناعت اور اہل دنیا سے استغنا کو اپنا شیوہ بنانے کی جو نصیحت کی گئی ہے اس کو صرف "واعظانہ بات" اور "قصہ ماضی" نہ سمجھا جائے، یہ اس دور کا نہایت اہم مسئلہ ہے، واقعہ یہ ہے کہ مستقبل میں دین کی عظمت اور اہل دین کے وقار کا بڑا انحصار اب اسی پر ہے کہ دین کے نمائندے مادہ پرستی کے اس طوفانی دور میں اپنی زندگی سے اس کا ثبوت دیں کہ جس مال و دولت اور جس خوش عیشی کو زمانے نے اپنا مقصود و معبود بنا رکھا ہے وہ اُس کے طالب و خریدار نہیں ہیں بلکہ وہ اِس کو انسانیت کی پستی سمجھتے ہیں اگر اہل دین نے اپنی زندگی سے اس کا ثبوت دیدیا تو قلوب میں دین کی عظمت کا سکہ بٹھانے کے لئے ہزاروں کلامی دلیلوں سے بڑھ کر یہ دلیل ہو گی۔

---

[1] خوشی کی بات ہے کہ اس کتاب کا اُردو ترجمہ بھی خود مصنف کی نگرانی میں مکمل ہو گیا ہے بلکہ اس وقت طباعت کے مرحلہ میں ہے امید ہے کہ انشاء اللہ رمضان مبارک تک کتاب چھپ کر تیار ہو جائے گی۔ اس کا نام ہے "اسلامی قیادت اور اُس کے عالمگیر اثرات"

الحمدللہ دین کی دنیا میں اس کے نمونے اب بھی کچھ نہ کچھ موجود ہیں لیکن وقت کا تقاضا ہے کہ ایسے بندوں کی تعداد موجودہ تعداد سے بہت زیادہ ہو۔

محترم رفیق مولانا سید ابوالحسن علی کا کردار اس بارہ میں بھی ہم جیسوں کے لئے بڑا سبق آموز ہے جی تو چاہتا ہے کہ اس باب میں اُن کا جو حال معلوم ہے اُس کو بھی کچھ کھولدوں لیکن یہ چیز اُن کے لئے ناقابل برداشت ہوگی اس لئے اسی پر اکتفا کرتا ہوں　　جو کچھ ان سطروں میں لکھ دیا ہے یہ بھی اُن کے لئے یقیناً گرانی کا باعث ہوگا، لیکن جس مقصد سے لکھا گیا ہے وہ اس عاجز کے نزدیک اتنا اہم ہے کہ اس کے لئے اُن کے مزاج کی گرانی کا مجھے اور اُن کو بھی تحمل کرلینا چاہئے واللہ بصیر بالعباد

اب اصل مقالہ پڑھیے!　　　　محمد منظور نعمانی

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

رب اشرح لی صدری ویسر لی امری واحلل عقدۃ من لسانی یفقھوا قولی

برادرانِ عزیز! میرے لئے بڑی مسرت اور عزت کی بات ہے کہ آپ سے باتیں کرنے کا موقع مل رہا ہے، میں سب سے پہلے اس کا اظہار ضروری سمجھتا ہوں کہ میں اس سرزمین کے لئے نامانوس اور اجنبی نہیں، اس عزیز درسگاہ سے میرے گوناگوں تعلقات ہیں، سب سے قدیم اور سب سے عزیز تعلق اُس عظیم المرتبت شخصیت کی بدولت ہے، جس کا نام لینے کے لئے بے اختیار زبان پر یہ شعر آتا ہے۔ ؎

ہزار بار بشویم دہن زمشک وگلاب
ہنوز نام تو گفتن کمالِ بے ادبیست

یعنی حضرت سید احمد شہیدؒ جو اس درسگاہ کے قیام سے پہلے اپنے قافلہ کے ساتھ یہاں تشریف لائے، بزرگانِ دیوبند میں یہ روایت ابھی تک مشہور ہے کہ دارالحدیث کی افتادہ زمین کی طرف آپ نے اشارہ کرکے فرمایا، کہ:۔ "مجھے یہاں سے علم کی خوشبو آتی ہے" دیوبند کی تین نسلوں نے ان کے نام اور پیغام کو سینہ سے لگائے رکھا اور ہر جانے والے نے رہنے والے کو یہ امانت سپرد کی وجعلوا الکلمۃ باقیۃ فی عقبہ لعلھم یرجعون آپ کے بزرگوں نے اپنا انتساب اسی جماعت کی طرف کیا، اور اس انتساب کی قیمت پوری فراخدلی اور فیاضی سے ادا کی، میرا دل اس وفاداری کی عظمت کے احساس سے معمور ہے، میری حاضری صرف آپ کی فرمائش کی تعمیل ہی نہیں، ایک دیرینہ تعلق کی تجدید، ایک بڑی سعادت کے حصول اور قلب ودماغ کے سکون کا باعث ہے۔

اِس قدیم تعلق میں ہمیشہ استحکام اور تازگی پیدا ہوتی رہی، ۱۳۱۲ھ میں میرے والد ماجد مولانا حکیم سید عبدالحی صاحب مرحوم ناظم ندوۃ العلماء اپنی نوجوانی میں دار العلوم دیکھنے اور یہاں کے اساتذہ و شیوخ سے ملنے تشریف لائے، یہ مولانا ذوالفقار علی صاحب، مولانا حافظ احمد صاحب مہتمم دار العلوم، اور مولانا محمود حسن صاحب (حضرت شیخ الہندؒ) مدرس دار العلوم کا زمانہ تھا، ان حضرات نے اسی دیرینہ تعلق کی بنا پر نوجوان مہمان کو ہاتھوں ہاتھ لیا، انھوں نے جس گرمجوشی، جس گہری محبت اور جس خلوص کے ساتھ آنے والے کی پذیرائی کی اس کا اثر والد صاحب پر برسوں رہا، اور اس کے نقوش ابھی تک اُن کے روزنامچہ "ارمغانِ احباب" کے صفحات پر تاباں ہیں؛ حضرت شیخ الہندؒ کے ساتھ والد صاحب کا عقیدت و محبت کا تعلق آخر آخر تک رہا، ۱۳۲۹ھ میں میرے برادرِ معظم اور مربی ڈاکٹر حکیم مولوی سید عبدالعلی صاحب ناظم ندوۃ العلماء دورۂ حدیث میں باقاعدہ داخل ہوئے، اور حضرت شیخ الہندؒ کی خصوصی شفقتوں اور مولانا سید انور شاہ صاحبؒ کے علمی افادات سے مستفید ہوئے، مجھ بے ہنر کو بھی ۱۹۳۲ء میں چند مہینے مولانا مدنی دامت برکاتہ کے درسِ حدیث اور مولانا اعزاز علی صاحب مدظلہ کے درسِ فقہ میں شرکت کا شرف حاصل ہوا ہے، مجھے اس سعادت پر فخر ہے، اور عمرِ رفتہ کا وہ حصہ اسی وجہ سے عزیز ہے۔

دوستو! اور عزیزو! ان چند در چند تعلقات کا تقاضا یہ ہے کہ میں آپ کے سامنے اپنی زندگی کے تجربات اور اپنے محدود مطالعہ کے نتائج بے تکلف رکھ دوں، اور زندگی کے سفر کی سب سے قیمتی اور عزیز سوغات آپ کے سامنے پیش کر دوں، آپ نے مجھے یہاں بلا کر عزت بخشی ہے، آپ نے مجھ پر اعتماد کا اظہار کیا ہے، میری خواہش اور کوشش ہونی چاہئے کہ میں اس اعتماد کا اہل ثابت ہوں، اور اس تھوڑے سے وقت سے پورا پورا فائدہ اٹھاؤں، اسلئے کہ یہ وقت آپ نے بڑے قیمتی مشاغل میں سے نکالا ہے، اور یہ اُن لوگوں کا وقت ہے جن کی ساعتیں اور لمحات مہینوں اور برسوں کے حساب سے تلنے چاہئیں۔

دوستو! ہم آپ اِس وقت برِ اعظم ایشیا کے سب سے بڑے دینی مدرسہ میں جمع ہیں، مدرسہ کیا ہے؟ مدرسہ مرکزِ زندگی ہے، مدرسہ سب سے بڑی کارگاہ ہے، جہاں آدم گری اور مردم سازی کا کام ہوتا ہے، جہاں دین کے داعی اور اسلام کے سپاہی تیار ہوتے ہیں، مدرسہ عالمِ اسلام کا بجلی گھر (پاور ہاؤس) ہے، جہاں سے اسلامی آبادی بلکہ انسانی آبادی میں بجلی تقسیم ہوتی ہے، مدرسہ وہ کارخانہ ہے جہاں قلب و نگاہ اور ذہن و دماغ ڈھلتے ہیں، مدرسہ وہ مقام ہے جہاں سے پوری کائنات کا احتساب ہوتا ہے، اور پوری

انسانی زندگی کی نگرانی کی جاتی ہے، جہاں کا فرمان پورے عالم پر نافذ ہے، عالم کا فرمان اس پر نافذ نہیں، مدرسہ کا تعلق کسی تقویم، کسی تمدن، کسی عہد، کسی کلچر، کسی زبان و ادب سے نہیں، کہ اس کی قدامت کا شبہ اور اسکے زوال کا خطرہ ہو، اس کا تعلق براہِ راست نبوتِ محمدیؐ سے ہے، جو عالمگیر بھی ہے اور زندۂ جاوید بھی، اس کا تعلق اُس انسانیت سے ہے جو ہر دم جوان، اُس زندگی سے ہے جو ہمہ وقت رواں اور دواں ہے، مدرسہ درحقیقت قدیم و جدید کی بحثوں سے بالاتر ہے، وہ تو ایسی جگہ ہے جہاں نبوتِ محمدیؐ کی ابدیت اور زندگی کا نمو اور حرکت دونوں پائے جاتے ہیں۔

حضرات! کسی مدرسہ کے لئے اِس سے بڑھ کر قابلِ احتجاج اور قابلِ اعتراض لفظ نہیں ہو سکتے "کہ وہ محض ایک دارالآثار یا کسی قدیم عہد کی یادگار ہے"، میں اس کو مدرسہ کے حق میں ازالۂ حیثیتِ عرفی کے مرادف سمجھتا ہوں میں مدرسہ کو ہر مرکز سے بڑھ کر مستحکم، طاقت ور، زندگی کی صلاحیت رکھنے والا، اور حرکت و نمو سے لبریز سمجھتا ہوں اس کا ایک سرا نبوتِ محمدیؐ سے ملا ہوا ہے، دوسرا سرا اس زندگی سے، وہ نبوتِ محمدیؐ کے چشمۂ حیواں سے پانی لیتا ہے، اور زندگی کی ان کشت زاروں میں ڈالتا ہے، وہ اپنا کام چھوڑ دے تو زندگی کے کھیت سوکھ جائیں اور انسانیت مرجھانے لگے، نہ نبوتِ محمدیؐ کا دریا پایاب ہونے والا ہے، نہ انسانیت کی پیاس بجھنے والی ہو نہ نبوتِ محمدیؐ کے چشمۂ فیض سے بخل اور انکار ہے، نہ انسانیت کے کاسۂ گدائی کی طرف سے استغنا کا اظہار، ادھر سے انما انا قاسم واللہ یعطی کی صدائے مکرر ہے، تو ادھر سے ھل من مزید ھل من مزید کی فغانِ مسلسل، مدرسہ سے بڑھ کر دنیا میں کون سا زندہ متحرک اور مصروف ادارہ ہو سکتا ہے، زندگی کے مسائل بےشمار، زندگی کے تغیرات بےشمار، زندگی کی ضرورتیں بےشمار، زندگی کی غلطیاں بےشمار، زندگی کی لغزشیں بےشمار، زندگی کے فریب بےشمار، زندگی کے رہزن بےشمار، زندگی کی تمنائیں بےشمار، زندگی کے حوصلے بےشمار، مدرسہ نے جب زندگی کی رہنمائی اور دستگیری کا ذمہ لیا، تو اسے اب فرصت کہاں؟ دنیا میں ہر ادارہ ہر مرکز، ہر فرد کو راحت اور فراغت کا حق ہے، اس کو اپنے کام سے چھٹی مل سکتی ہے، مگر مدرسہ کو چھٹی نہیں! دنیا میں ہر مسافر کے لئے آرام ہے لیکن اس مسافر کے لئے راحت حرام ہے! اگر زندگی میں ٹھہراؤ ہو، سکون اور وقوف ہو، تو حرج نہیں کہ مدرسہ بھی چلتے چلتے دم لے لے، لیکن جب زندگی رواں اور دواں ہے تو مدرسہ میں جمود اور تعطل کی گنجائش کہاں ہے، اس کو قدم قدم پر زندگی کا جائزہ لینا ہے، بدلتے ہوئے حالات میں احکام دینے ہیں، نئے نئے فتنوں کا مقابلہ کرنا ہے، بہکے ہوئے قدموں کو راستے پر لگانا ہے، ڈگمگاتے ہوئے پیروں کو جمانا ہے، وہ زندگی سے

پیچھے رہ جائے یا تھک کر بیٹھ جائے، یا کسی منزل پر قیام کرلے، یا اُس کو کوئی مقام خوش آجائے، تو زندگی کی رفاقت اور قیادت کون کرے، سرودِ ازلی اور پیغامِ محمدیؐ اُسے کون سُنائے، مدرسہ کا تعطل، قیادت سے کنارہ کشی، کسی منزل پر قیام خودکشی کا مرادف اور انسانیت کے ساتھ بے وفائی کا ہم معنی ہے، اور کوئی خودشناس، اور فرض آشنا مدرسہ اس کا تصور نہیں کرسکتا۔

دوستو! مدرسہ کے طالب علم کی حیثیت سے آپ کا کام سب سے زیادہ نازک اور سب سے زیادہ عظیم ہے، میں نہیں جانتا کہ اس وقت دُنیا کی کسی جماعت یا کسی گروہ کا کام اتنا نازک، وسیع اور اہم ہو، ان الفاظ پر دوبارہ غور کیجئے کہ آپ کا ایک سرا نبوتِ محمدیؐ سے ملا ہوا ہے، دوسرا سرا زندگی سے یہی آپ کے کام کی نزاکت کی وجہ اور آپ کی عظمت کی دلیل ہے، نبوتِ محمدیؐ سے وابستگی اور اتصال جہاں ایک بہت بڑی خوش نصیبی اور سرفرازی ہے وہاں ایک عظیم ذمہ داری بھی ہے، آپ کے پاس حقائق اور عقائد کی سب سے بڑی دولت اور سب سے عظیم سرمایہ ہے، اس وابستگی سے آپ پر چند ذمہ داریاں عائد ہوتی ہیں، آپ میں غیر متزلزل یقین اور راسخ ایمان ہونا چاہئے، آپ میں یہ حوصلہ اور ہمت ہونی چاہئے، کہ ساری دُنیا ملتی ہو تو اسکے ایک نقطے سے بھی دستبردار ہونے کے سوال پر غور نہ کرسکیں، آپکے دلوں میں اسکی حمایت و نصرت کا جذبہ موجزن ہونا چاہئے، آپ کا دل اس بے بدل دولت پر فخر اور شکر سے لبریز ہو، آپ کو اسکی صداقت اس کی معقولیت، اس کی ابدیت، اس کی ہر زمانہ میں صلاحیت، اس کی بلندی و برتری، اور اس کی معصومیت پر غیر متبدل یقین ہو، آپ اسکے مقابل ہر چیز کو پورے اطمینان کے ساتھ جاہلیت، اور جاہلیت کی میراث سمجھتے ہوں، آپ جہاں احکامِ خداوندی اور تعلیماتِ اسلامی کو سُن کر سمعنا و اطعنا کہیں، وہاں جاہلیت کے نظام اور جاہلیت کے علمبرداروں کو مخاطب کرکے کہیں، کہ کفرنا بکم وبدا بیننا وبینکم العداوۃ والبغضاء ابداً حتی تؤمنوا باللہ وحدہٗ، آپ اسلام ہی کی رہنمائی اور اُسوۂ محمدیؐ ہی کی روشنی میں دُنیا کی نجات کا یقین رکھتے ہوں، اور آپ کا اس پر عقیدہ ہو کہ اس طوفانِ نوح میں سفینۂ نوح صرف محمد رسُول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت اور امامت ہو آپ یقین کرتے ہوں کہ افراد اور اقوام کی سرفرازی اور سربلندی کی شرط صرف رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا اتباع ہے، اور یہ بالکل حقیقت ہے، کہ:- ؎

محمدؐ عربی کہ آبروئے ہر دو سراست		کسیکہ خاک درش نیست خاک برسر او

آپ تعلیماتِ نبوت کو علم کا لب لباب اور حقیقۃ الحقائق سمجھتے ہوں، آپ اسکے مقابلے میں تمام دنیا کی الٰہیات

اور فلسفۂ مابعد الطبیعیات اور قیاسات و روایات کو افسانہ و خرافات سے زیادہ وقعت دینے کے لئے تیار نہ ہوں، آپ توحید کی حقیقت سے واقف اور اس پر مصر ہوں، اور شرک اور تمام دنیا کے علم الاصنام کو خواہ وہ کیسے ہی پُرجلال علمی اصطلاحات اور فلسفہ کی زبان میں بیان کیا گیا ہو حقارت کی نظر سے دیکھتے ہوں، اور نہ زخرف القول غرور اسے زیادہ مرتبہ دینے کے لئے آمادہ نہ ہوں آپ سنت کے اتباع کے حریص، اور خیر الھدی ھدی محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر یقین رکھتے ہوں، اور بدعات کے مضر اور نامقبول ہونے پر آپ کو شرح صدر ہو، غرض آپ اعتقادی، ذہنی، فکری، قلبی، ذوقی اور عملی حیثیت سے نبوتِ محمدیؐ کی جامعیت اور عملیت کے قائل اور اس کی عملی تفسیر ہوں۔

دوستو! دنیا کے دوسرے مسلمانوں کے مقابلہ میں آپ کا امتیاز یہ ہے کہ ان حقائق پر دوسروں کا اجمالی ایمان کافی ہے، مگر آپ کو اس پر پورا ذہنی اطمینان اور شرح صدر ہونا چاہئے، آپ کا صرف قائل ہونا کافی نہیں، اس کا داعی ہونا ضروری ہے، دوسروں کا یقین لازمی ہو تو کافی ہے، آپ کا یقین متعدی ہونا چاہئے، جو سیکڑوں ہزاروں انسانوں کو یقین سے لبریز کر دے، اور یہ اُس وقت تک ممکن نہیں جب تک کہ آپ کا یہ سر در سر خوشی و سرمستی اور بیخودی کی حد تک نہ پہونچا ہو، اور آپ میں یکرہ ان یعود الی الکفر کما یکرہ ان یقذف فی النار کی حقیقت نہ پائی جاتی ہو، تعلیماتِ نبوت سے دوسروں کی سرسری واقفیت کافی ہے، مگر آپ کے لئے علوم نبوت میں رسُوخ، علوم نبوت سے عشق، علوم نبوت میں مقامِ فنائیت، علوم نبوت پر اصرار ضروری ہے، اسکے بغیر دعوت کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا، بلکہ دعوتوں اور تحریکوں کے اِس طُوفانی دور میں اسکے بغیر اپنی خصوصیات اور سرمایہ کی حفاظت بھی مشکل ہے۔

یہ بھی یاد رکھئے کہ نبوتِ محمدی نے جس طرح علوم و احکام کا ایک بے پایاں دفتر اور وسیع ترین ذخیرہ چھوڑا فان الانبیاء لم یورثوا دینارًا ولا درھمًا ولکن ورثوا ھذا العلم یہ ذخیرہ قرآن، حدیث، فقہ و احکام کی صورت میں محفوظ ہے، اور آپ کا مدرسہ بحمد اللہ اس کی خدمت و اشاعت کا بہت بڑا مرکز ہے اسی طرح نبوتِ محمدی نے کچھ اوصاف، خصوصیات، اور کیفیات بھی چھوڑے، جس طرح پہلا سرمایہ نسل در نسل منتقل ہوتا رہا، اور اللہ تعالیٰ نے اس کی حفاظت و اشاعت کا انتظام کیا، اسی طرح دوسرا سرمایہ بھی برابر منتقل ہوتا رہا ہے، اور اللہ تعالیٰ نے اس کی حفاظت کا بھی انتظام فرمایا ہے یہ اوصاف و خصوصیات کیا ہیں؟ یقین، اخلاص، ایمان و احتساب، تعلق مع اللہ، انابت، اخبات، خشوع و خضوع،

دعا و ابتہال، استغناء و توکل، اعتماد علی اللہ، درد و محبت، خود شکنی و خود داری، نبوت علوم و احکام اور اوصاف و کیفیات دونوں کی جامع تھی، ھو الذی بعث فی الامیین رسولا منھم یتلو علیھم آیتہ و یزکیھم و یعلمھم الکتاب والحکمۃ، نبوتِ محمدی سے صرف علوم و احکام لینا اور کیفیات و اوصاف کو ترک کر دینا ناقص وراثت ہے اور نامکمل نیابت، دنیا میں جن لوگوں نے نبوت کی نیابت کی اور اسلام کی امانت ہم تک پہونچائی، وہ صرف ایک حصہ کے امین نہ تھے، وہ دونوں دولتوں سے مالا مال تھے، اب بھی اسلام کی دعوت، اور اسلامی انقلاب صرف پہلے حصہ سے برپا نہیں کیا جا سکتا، آپ کو جن اسلاف کی طرف نسبت کا شرف حاصل ہے، وہ بھی ان دونوں خصوصیتوں کے جامع تھے، آپ اگر حقیقی نیابت کے منصبِ بلند پر سرفراز ہونا چاہتے ہیں تو آپ کو اس جامعیت کی کوشش کرنی پڑے گی، اسکے بغیر علم و فن کی صناعی کاغذی پھول ہیں، جن میں نہ خوشبو نہ تازگی، آج دنیا کے بازار میں کاغذی اور ولایتی پھولوں کی کمی نہیں، ہم اور آپ اس میں کوئی قابلِ ذکر اضافہ نہیں کر سکتے، یہاں تو نبوت کے باغ کے شاداب پھول چاہئیں، جو مشامِ جاں کو معطر کر دیں، اور جن کے سامنے دنیا کے پھول شرما جائیں، فوقع الحق وبطل ما کانوا یعملون، آپ بُرا نہ مانیں، کہنے والا بھی آپ ہی میں سے ہے، عرصہ سے ہمارے مدارس ان شاداب پھولوں سے خالی ہوتے جا رہے ہیں، ان اوصاف میں روز افزوں انحطاط ہے، ہم کو دل پر پتھر رکھ کر سننا چاہئے اور دیکھنا چاہئے کہ کہنے والے نے کہاں تک صحیح کہا ہے، کہ :۔

اٹھا میں مدرسہ و خانقاہ سے غمناک
نہ زندگی نہ محبت نہ معرفت نہ نگاہ

اس کا نتیجہ یہ ہے کہ ہمارے مدارس سے جس تعداد میں لوگ فارغ ہو کر نکلتے ہیں کبھی اس تعداد میں نہیں نکلتے تھے، لیکن زندگی پر کوئی اثر نہیں ڈال رہے ہیں، پہلے اسی مُلک میں خواجہ معین الدین اجمیریؒ، یا سید علی ہمدانی کشمیریؒ جیسا ایک فقیر بے نوا آتا اور پورے کے پورے مُلک کو اپنے قلب کی حرارت اور اپنے ایمان کے نور سے بھر دیتا، حضرت مجدد الف ثانیؒ نے حکومتِ مغلیہ میں انقلاب برپا کر دیا، انھیں کی خاموش مساعی کا نتیجہ تھا کہ ہم اکبر کے تخت پر اورنگ زیب جیسے فقیہ و متشرع بادشاہ کو دیکھتے ہیں، شاہ ولی اللہ صاحبؒ نے اس طویل و عریض مُلک کا رجحان بدل دیا، اور پورے نظامِ فکر اور نظامِ تعلیم پر گہرا اثر ڈالا، مولانا محمد قاسم صاحبؒ نے ایک عام مایوسی اور پسپائی کے دور میں اتنا بڑا اسلامی قلعہ تعمیر کر دیا، اور علومِ شریعت کو ایک نئی زندگی بخش دی، ابھی پچھلے عرصہ میں مولانا

محمد الیاسؒ نے ایمان اور دینی جدوجہد کی ایک نئی روح پھونک دی، غرض۔ ؎

جہانے را دگرگوں کرد یک مرد خود آگاہے

آج ہمارے فضلاء اس رُوح سے خالی، ان کیفیات سے عاری، اور اس قوت سے محروم ہیں، جو لوگوں کو نئے سرے سے سوچنے اور بدل جانے پر مجبور کر دیتی تھی، زمانہ بڑا حقیقت شناس ہے، وہ صرف بلندی کے سامنے جھکتا ہے، دماغ بلند دماغ کے سامنے جھکتے ہیں، اور خالی اور سرد دل ہمو اور گرم دل کا لوہا مانتے ہیں، ہمارے مدارس میں دماغی انحطاط بھی روز افزوں ہے اور قلبی افسردگی بھی رو بہ ترقی، مقررین اور واعظین کی اب بھی کمی نہیں، مگر بقول حضرت جگرؔ:- ؎

آنکھوں میں سُرورِ عشق نہیں چہرہ پہ یقیں کا نور نہیں

مدارس جو کبھی طاقت اور زندگی کا مرکز تھے، اور جہاں انقلاب آفریں شخصیتیں پیدا ہوتی تھیں، وہ مایوسی، افسردگی اور احساسِ کمتری کا شکار ہیں، آج مدارس کی تعداد میں، ان کے طلبہ کی تعداد میں، درس کی کتابوں کی تعداد میں، کتب خانے کے مندرجات کی تعداد میں، وظائف کی تعداد میں بہت بڑا اضافہ ہے، مگر زندگی کی نبض سُست اور قلب کی دھڑکن کمزور ہے، کوئی حساس درد مند کبھی بھی اس طرف نکل جاتا ہے تو اس کا دم گھٹنے لگتا ہے، اور وہ اس بحر کاہل کو دیکھ کر کہنے لگتا ہے۔ ؎

خدا تجھے کسی طوفاں سے آشنا کر دے	کہ تیرے بحر کی موجوں میں اضطراب نہیں
تجھے کتاب سے ممکن نہیں فراغ، کہ تو	کتاب خواں ہے مگر صاحبِ کتاب نہیں

لیکن اب تو مدارس کے حق میں کسی طوفان سے آشنا ہونے کی دُعا کرتے ہوئے بھی دل ڈرتا ہے، آج مدارس میں طوفان کے آثار نظر آتے ہیں، لیکن یہ باہر کے طوفان کے تھپیڑے اور موجیں ہیں جو مدارس کے در و دیوار سے ٹکرا رہی ہیں، یہ باہر کے ہنگاموں اور سطحی اور عوامی تحریکات کی صدائے بازگشت ہے، جس میں ہمارے مدارس کے طلبہ کا مقام محض نقال یا آلہ صوت کا ہو، یہ بڑا افسوسناک منظر، اور بڑی دلخراش حقیقت ہے کہ جو تحریکیں اور دعوتیں، جو ہنگامے اور شور، جو انتشار و اضطراب جو تنظیمیں اور طریقۂ احتجاج آج عصری درسگاہوں اور دنیاوی تعلیم گاہوں میں نامقبول ہو رہے ہیں، اور پیش پا افتادہ اور کہنہ و فرسودہ سمجھے جانے لگے ہیں، وہ ہمارے مدارس میں اب بار پا رہے ہیں، اور جن کو زمانہ کا محتسب، اپنے عصر کا امام، اور خود صاحبِ دعوت اور صاحبِ مقام ہونا چاہئے تھا وہ لادینی درسگاہوں کا متبع اور مقلد ہونے پر فخر کر رہے ہیں۔ ؎

کرسکتے تھے جو اپنے زمانہ کی امامت ؎

وہ کہنہ دماغ اپنے زمانہ کے ہیں پیرو

آج مدارس کا سب سے بڑا فتنہ اور سب سے بڑا ذہنی طاعون بڑھتا ہوا احساسِ کمتری ہے، جو گھُن کی طرح اس درخت کو کھاتا چلا جارہا ہے، کسی ادارہ کو اگر یہ گھُن لگ جائے تو پھر اُس کی زندگی محال ہے۔

عزیزو! آپ احساسِ کمتری کا کیوں شکار ہوں؟ دوسروں کا احساسِ کمتری ایک نفسانی مرض ہے، مگر آپ کا احساسِ کمتری دینی کمزوری، ضعفِ عقیدہ، اور ضعفِ ایمان کی دلیل ہے، جس کے نتائج بہت سنجیدہ اور دور رس ہیں، انبیاء کے نائبین اور علوم نبوت کے حاملین کو اپنی کمتری اور حقارت کا احساس ہو تو اسکے معنی یہ ہیں کہ وہ نبوت کے مقام سے ناآشنا اور یقین سے خالی ہیں، آپ تو اُن ہستیوں کے جانشین ہیں جن کے متعلق عارف رومی نے بجا طور پر کہا تھا:۔

نخوت و ناموس دارند چو شہاں

چاکری خواہند از اہلِ جہاں

اور جن کے متعلق سعدیؒ کے الفاظ میں یہ کہنا بالکل صحیح ہوگا، کہ:۔ ؎

شہان بے کلہ و خسروانِ بے کمر اند

آپ کے پاس جو دولت ہے اُس سے دنیا کا دامن خالی ہے، آپکے سینہ میں علوم نبوت ہیں، اور وہ حقائق ہیں جو دنیا سے گم ہو چکے ہیں، اور جن کے گم ہونے سے آج عالم میں اندھیرا ہے، اضطراب و انتشار ہے، شر و فساد ہے، آپ اپنے ان سادہ کپڑوں، ان حقیر جسموں، اور اس خالی جیب و دامن پر نظر نہ کریں، آپ دیکھیں کہ آپ کا سینہ کن دولتوں سے معمور، اور آپ کے اندر کیسا بدرِ کامل مستور ہے۔ ؎

بر خود نظر کشا ز تہی دامنی مرنج

در سینۂ تو ماہ تمامے نہادہ اند

آپ یاد رکھیں حقارت و ذلت کا تعلق انسان کے اندرون سے ہے، عالم خارجی اور بیرونی دنیا سے بہت کم ہے، حقارت ایک نفسیاتی کیفیت کا نام ہے، احساسِ حقارت نتیجہ ہے انسان کے شک و شبہ، ضعف و تذبذب، اور خود شناسی کا، انسان خود اپنے کو حقیر و بے مایہ سمجھتا ہے، اور اُس کو دھوکہ ہوتا ہے، کہ لوگ اس کو حقیر سمجھتے ہیں، اور دنیا میں وہ بے قیمت اور ذلیل ہے، حالانکہ یہ خیال وہ خود اپنے اوپر کرتا ہے،

یاد رکھئے جو خود اپنی نگاہ میں ذلیل ہو جائے اُس کو کوئی باعزت نہیں بنا سکتا، اور جو خود اپنے کو اپنی نظر سے گرا دے، کسی کو اس کی بالکل ضرورت نہیں کہ اس کو اپنے دل یا آنکھوں میں جگہ دے، جس کی گنجائش خود اپنے یہاں نہیں ہے، اس کی گنجائش کون و مکاں میں نہیں ہے، یہ زمین بقدرِ دل سمٹتی اور پھیلتی ہے، اور اس کی وسعت گھٹتی اور بڑھتی ہے، آدمی کو یہ دیکھنا چاہیے کہ اسنے اپنے کو اپنے دل میں کیا مقام دیا ہے اور اس کا معاملہ خود اپنی ذات کے ساتھ کیا ہے، اگر کسی نے اپنے کو ذلیل و حقیر، مجبور و بے بس، تہی دست و بے بضاعت، اور دنیا کے بازار میں بے قیمت و بے ضرورت سمجھ لیا ہے، تو اُس کو دنیا سے کسی انصاف اور کسی اعزاز کی توقع نہیں کرنی چاہیئے، حاتم طائی نے اِسی حقیقت کو اپنے اس شعر میں بیان کیا ہے:۔

ونفسک اکرمها فانك ان تهن

علیك فلن تلقیٰ من الناس مکرما

اپنی ذات کی خود عزت کرو، اسلئے کہ اگر تم اپنی نگاہ میں ذلیل اور بے وزن ہو جاؤ گے، تو پھر دنیا میں تمھیں کوئی بھی عزت کرنے والا نہیں ملے گا۔

دوستو! مجھے یقین ہے کہ ہم حقیر نہیں ہیں، صرف احساسِ حقارت کے مریض ہیں، اور یہ احساسِ حقارت ہماری خود ناشناسی اور خود فراموشی پر مبنی ہے، اس کا علاج صرف یہ ہے کہ ہم اپنے مقام سے باخبر ہو جائیں اور اپنی دولت اور سرمایہ کا صحیح جائزہ لیں، دُنیا کی تبدیلی، نگاہوں کی تبدیلی، سب ہماری نگاہ کی تبدیلی کی تابع ہے، جس دن ہماری یہ نگاہ بدلی، دنیا بدل جائے گی، اور حقارت کا یہ مہیب سایہ جو ہمارے دل و دماغ پر مسلط ہے اور ہم کو ڈرا رہا ہے کافور ہو جائے گا، کہنے والے نے کچھ غلط نہیں کہا:۔

اور اگر باخبر اپنی شرافت سے ہو	تیری بیسہ انس و جن، تو ہے امیر جنود

ہماری قدیم اور معاصر تاریخ میں جن اشخاص نے اپنے مقام کو پہچان لیا، اور جن کو اس کا احساس ہو گیا کہ اللہ نے ان کو کون سی دولت دی ہے اور کس منصب پر سرفراز کیا ہے، ان کو یہ سارا عالم پست نظر آنے لگا، اُن کو سلطنتیں نہیں خرید سکیں، انھوں نے دنیا کی بڑی سے بڑی پیشکش سُن کر ہمیشہ زیرِ لب مُسکرا کر کہا:۔

بروایں دام برمرغِ دگرنہ	کہ عنقارا بلند است آشیانہ

انسانی تاریخ کی آبرو جو ارزاں فروشیوں اور خود فراموشیوں کی داستانوں سے داغدار ہے، انھیں خود آشنا و خدا شناس انسانوں کے دم سے ہے، انسانیت کا سر انھیں کی بدولت اونچا ہے، جنھوں نے اپنا سر ہمیشہ اونچا رکھا۔

عزیزانِ گرامی! اس زندگی کے بقاء و تسلسل کے لئے جس طرح غذا اور لباس کی ضرورت ہے، مادی ساز و سامان کی ضرورت ہے، اور لوگوں نے اس کا ذمہ لیا ہے، اسی طرح زندگی کے فروغ اور وقار اور انسانیت کے شرف اور اعتبار کے لئے یہ بھی ضروری ہے کہ اس مادہ پرست کوتاہ بیں دنیا میں وقتاً فوقتاً پیغمبرانہ خودداری اور دنیا کے پیمانوں کے انکار اور حقارت کا بھی اظہار ہوتا رہے، اور کسی کسی گوشہ سے یہ صدا بھی آتی رہے، کہ اتمدونني بمال فما آتاني الله خير مما آتاكم بل انتم بهديتكم تفرحون ۔ جس روز یہ صدا بالکل بند ہو جائے گی، اور ساری دنیا نیلام کی منڈی بن جائے گی، جہاں جوہرِ ادراک، شعلۂ ایمان، اور متاعِ علم سب کسی نہ کسی دام پر ملنے لگیں گے، اور انسان جمادات اور حیوانات کی طرح ارزاں اور گراں بکنے لگیں گے، اُس دن یہ دنیا رہنے کے قابل نہ رہے گی، اور انسانیت اپنی آب و تاب کھو دے گی، اب اس کی ذمہ داری کہ انسانیت کی خودداری اور پیغمبروں کی سرداری کی شان قائم رہے، تنہا آپ کے سر ہے، اس کی توقع ان درسگاہوں سے نہیں کی جا سکتی، جنھوں نے معدہ اور پیٹ کے نصب العین سے بلند ہونے کا دعویٰ خود بھی نہیں کیا، اس کی توقع تو آپ ہی سے ہو سکتی ہے، جن کے اسلاف میں امام ابو حنیفہ اور امام احمد جیسے غیور اور خود شناس امام گذرے ہیں جن کو حکومتِ عباسیہ کسی قیمت پر خرید نہ سکی، امام غزالیؒ جیسے عالی ہمت جنھوں نے حریمِ خلافت کے اشارہ کے باوجود نظامیہ بغداد کی صدر مدرسی جو خلافت کے بعد سب سے بڑا دینی اعزاز تھا قبول نہیں کی، حضرت مجدد الف ثانی جیسے صاحبِ عزیمت جنھوں نے جہانگیر کے سامنے جھکنے پر گوالیار کی اسیری کو ترجیح دی، آپ کے اسلاف میں حضرت مرزا مظہر جانجاناں بھی ہیں، جن کو بادشاہ دہلی نے پیغام بھیجا کہ اللہ نے اتنی بڑی سلطنت مجھے عطا کی ہے، آپ اس میں سے کچھ قبول فرمالیں، فرمایا اللہ تعالیٰ تو ہفت اقلیم کو متاع الدنیا قلیل، فرماتا ہے، پھر ایک اقلیم میں سے ایک ولایت آپ کے حصے میں آئی ہے، وہ کتنی ہے کہ فقیر اس کی طرف طمع کا ہاتھ بڑھائے، نواب آصفجاہ نے ایک بار بیس ہزار روپیہ نذر کیا، آپ نے قبول نہیں فرمایا نواب نے کہا لیکر محتاجوں کو بانٹ دیجئے، فرمایا کہ مجھ کو اس کا سلیقہ نہیں، یہاں سے نکل کر بانٹتے چلے جائیے، گھر تک پہونچتے پہونچتے تقسیم ہو جائے گا، نہ ہو تو وہاں ہو جائے گا، آپ کے اسلاف میں سے حضرت شاہ غلام علی صاحب دہلوی بھی تھے، نواب امیر خاں والیِ ریاست ٹونک نے ان کی خانقاہ کے سالانہ مصارف کیلئے کچھ مقرر کرنا چاہا تو ان کو لکھ دیا گیا، کہ:۔ ؎

ما آبروئے فقر و قناعت نمی بریم　　با میر خاں بگوئے کہ روزی مقدر است

آپ کے اسلاف میں مولانا عبدالرحیم رامپوری جیسے مدرس گذرے ہیں، جنھوں نے ریاست کے دس روپیہ ماہوار کو بریلی کالج کی ڈھائی سو روپیہ کی اسامی پر اور لوجہ اللہ پڑھانے کو ایک معزز پروفیسری پر یہ کہہ کر ترجیح دی کہ اگر خدا نے قیامت کے دن پوچھا تو میں کیا جواب دوں گا، آپ کے اسلاف کرام میں اس دارالعلوم کے بانی مولانا محمد قاسم صاحب نانوتویؒ کی ذات گرامی ہے، جنھوں نے علیگڈھ کے ایک دیندار رئیس کی تنخواہ میں جو غالباً دس روپیہ ماہوار سے زیادہ نہ تھی، دو روپیہ ماہوار یہ کہہ کر کمی کرادی کہ میں دو روپیہ اپنی والدہ صاحبہ کو دیا کرتا تھا اُن کے انتقال کے بعد یہ روپیہ فاضل ہے، اور میں قیامت کے دن اسکے حساب سے بچنا چاہتا ہوں، آپ کے اسلاف قریب میں دارالعلوم اور دوسرے دینی مدارس کے وہ ایثار پیشہ مدرسین ہیں جنھوں نے اپنے مدارس کی چھوٹی چھوٹی تنخواہوں اور اپنے اساتذہ اور شیوخ کے قرب پر بڑی بڑی درسگاہوں کی بڑی بڑی پیشکشوں کو قربان کردیا، اور عسرت اور تنگی میں اپنی عمر بسر کردی، آپ کو یقیناً یہ شعر پڑھنے کا حق ہے، کہ :- ؎

اولئك آبائی فجئنی بمثلهم اذا جمعتنا یا جریر المجامع

دوستو! آپ اس سے یہ خیال نہ فرمائیں کہ مجھے زمانہ کی تبدیلی، ضروریات کی زیادتی، ہمتوں اور قویٰ کی کمزوری، حالات کے اختلاف کا کوئی احساس نہیں، اور میں آپ سے اس زمانہ میں مولنا عبدالرحیم اور مولنا محمد قاسم صاحب کے ایثار و زہد کا پورا پورا مطالبہ کر رہا ہوں، لیکن میں یہ ضرور کہوں گا کہ آپ کا راستہ بلاشبہ ایثار و قناعت، جد و جہد، جفاکشی، اور بلند ہمتی کا ہے، آپ نے جو راستہ انتخاب کیا ہے، یا مرضیٔ الٰہی نے آپ کیلئے پسند کیا ہے، وہ معاشی حوصلہ مندیوں اور دنیاوی سربلندیوں کا راستہ نہیں، اس راستے پر تو قد کنت فینا مرجوا قبل هذا کا طعنہ سننا ہی پڑے گا، اس راستے پر تو ولا تمدن عینیك الی ما متعنا به ازواجا منهم زهرة الحیاة الدنیا لنفتنهم فیه ورزق ربك خیر وابقیٰ کا سبق پڑھنا ہی پڑے گا، لیکن اس کا انعام کیا ہے، وہ بھی سُن لیجئے وجعلنا منهم ائمة یهدون بامرنا لما صبروا وکانوا بآیاتنا یوقنون ہ۔ مولنا روم نے اسی مقام کی خبر دی ہے کہ :-

معدہ را بگزار سوئے دل خرام تاکہ بے پردہ زحق آید سلام

آپ کو جو احساس کمتری تکلیف دے رہا ہے، اُس کی کچھ تو وجہ یہ ہے کہ آپ اپنے مقام سے واقف نہیں، میں نے اس کو تفصیل سے عرض کر دیا ہے، دوسری وجہ یہ ہے کہ آپ اس دنیا سے واقف نہیں، آپ کو معلوم نہیں کہ زمانہ کس قدر بے بضاعت و تہی دامن، اور کس قدر تشنہ لب ہے، آپ اس زمانہ کو مرعوب اور للچائی ہوئی نظر سے دیکھتے ہیں،

اِسلئے کہ آپ اس سے ناآشنا ہیں، آپ اس کو قریب سے دیکھیں گے تو معلوم ہوگا کہ یہ کس درجہ دیوالیہ ہے اور اس کو اپنے دیوالیہ پن کا شدت سے احساس ہو رہا ہے، اسکے سب سکے کھوٹے نکلے، اسکے سب تیر دغا دے گئے، اسکے سب چشمے سراب ثابت ہوئے، اسکے سب فلسفے اور نظام اسکے سب اِزم ناکام رہے، اسکے سب خواب بے تعبیر رہے، آپ کے پاس نبوتِ محمدیؐ کے عطا کئے ہوئے جو حقائق ہیں، اُن کو اپنی کم نظری سے پیش کرتے ہوئے آپ شرماتے ہیں کہ یہ زمانہ سائنس اور سیاسیات اور اقتصادیات کی ترقی کا ہے، لیکن دنیا کا حال یہ ہے کہ آج وہ انھیں کے لئے بیتاب اور چشم براہ ہے، آج قومیں اُن لوگوں کے انتظار میں ہیں جو اُن کو زندگی کا نیا راستہ بتلائیں، اور محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا پیغام حیات سنائیں۔ ؎

ہمہ آہوان صحرا سر خود نہادہ برکف بامید آں کہ روزے بشکار خواہی آمد

آپ جن باتوں کو معمولی سمجھتے ہیں اور جن کو آپ نے کوئی وقعت نہیں دی، میں نے بڑے بڑے فاضلوں کو ان پر سر دھنتے دیکھا ہے، جب کبھی ان کے سامنے پیغمبروں کی بتلائی ہوئی باتیں کی گئیں، تو ایسا معلوم ہوا کہ جیسے کسی بلندی سے خطاب کیا جارہا ہے اور ان کے کان اس سے ناآشنا تھے، آپ دنیا کے بازار میں اسی کا مال اور اسی کے مصنوعات لیجانا چاہتے ہیں، پھر اس کا کیا شکوہ کہ وہ بضاعتنا ردت الینا کہہ کر آپکے سامنے ڈال دیتی ہے دنیا آپ سے اُمیدوار ہے کہ آپ انبیاء علیہم السلام کی لائی ہوئی اطلاعات اور تبلائے ہوئے راستہ کو پیش کریں، دنیا آج بھی ان کے سامنے سر جھکانے کے لئے تیار ہے، اسکے دماغ اب بھی اسکے سامنے سرنگوں ہیں، جیسے چھٹی صدی مسیحی کے محدود ماحول میں سرنگوں تھے، یقیناً آپ کے پاس یونانیوں کے طبعیات وعنصریات وفلکیات پر چند اوراق ہیں، اسکے مقابلے میں یورپ کے پاس سائنس اور تجربات ومشاہدات کی ایک دنیا ہے، یہ بھی واقعہ ہے کہ آپ آج یورپ کو یونان کی فلسفیانہ موشگافیوں اور عقلیات کی دقیقہ سنجیوں سے مرعوب نہیں کرسکتے، انکی زندگی ختم ہوگئی ہے، اور وہ اپنی طاقت کھو چکے ہیں، لیکن آپ کے پاس انبیاء علیہم السلام کے لائے ہوئے جو علوم اور حقائق ہیں، یورپ وایشیاء ان سے اب بھی محروم ہے، اُسکے پاس آپ کے عقلی وفکری نتائج اور آپکے علمی ذخیرے کا کچھ نہ کچھ جواب ہے، لیکن انبیاء علیہم السلام کے معجزات کا جواب نہیں، آپ اپنی اصلیت اور حقیقی دولت لیجائیں اور پورے اعتماد ویقین کے ساتھ زندگی کے میدان میں آئیں، اس میدان میں آپ کا کوئی حریف نہیں، آپ کے پاس انسانیت کے لئے جو دعوت اور پیغام ہے، آپ کے پاس علم وحقیقت کا جو سرچشمہ ہے، آپ کو جس ذاتِ گرامی سے نسبتِ غلامی حاصل ہے، اسکے بعد آپ میں سے ہر شخص کو یہ

کہنے کا حق حاصل ہے، کہ :- ؎

عجب کیا گر مہ و پرویں مرے نخچیر ہو جائیں
کہ بر فتراک صاحب دولتے بستم سر خود را

وہ دانائے سُبل ختم الرسل مولائے کُل جس نے
غبارِ راہ کو بخشا فروغِ وادیٔ سینا

عزیزانِ گرامی قدر! میں نے عرض کیا تھا کہ آپ کے تعلق کا ایک سرا نبوتِ محمدی سے ملتا ہو، اس سے آپ پر کیا ذمہ داریاں عائد ہوتی ہیں، میں نے ابھی تک اسی کی تفصیل بیان کی ہے، اسی کے ساتھ یہ عرض کیا گیا تھا کہ آپ کا دوسرا سرا زندگی سے ملتا ہے، اب میں عرض کروں گا کہ اس کی کیا ذمہ داریاں اور تیاریاں ہیں، اور آپ اسکے حقوق و فرائض سے کس طرح عہدہ برآ ہو سکتے ہیں!۔

عزیزو! اور دوستو! نبوت نے ہم کو جو علوم و حقائق اور جو اصول و ضوابط عطا کئے ہیں، اُن میں ایک شوشہ اور ایک نقطہ کی ترمیم ممکن نہیں، آپ کے اسلاف کا یہ تجدیدی کارنامہ ہے کہ انھوں نے ان میں کوئی تحریف اور کوئی تبدیلی نہیں ہونے دی، اور اس ذخیرے کو ہمارے ہاتھوں تک بے کم و کاست پہونچا دیا، لیکن اسی کیساتھ اس حقیقت کو یاد رکھئے کہ ہمارے انھیں اسلاف نے ہر دور اور ہر عصر میں اس ذخیرے کو زندگی میں منتقل کرنے کی کوشش بھی جاری رکھی، انھوں نے اپنی ذہانت اور محنت سے اس ذخیرے کو ایک زندہ قابلِ عمل اور نمو پذیر ذخیرہ ثابت کیا، انھوں نے اس کی ایسی ترجمانی اور تشریح کی کہ ان کی معاصر نسلوں کے دماغوں نے اس کو بآسانی قبول اور ہضم کر لیا، اور ان کو اپنے زمانہ اپنی عقلی سطح اور اس ذخیرے کے درمیان کوئی تفاوت اور فاصلہ محسوس نہیں ہوا، ان میں اصل شریعت، مقاصدِ دین، اور منصوصات کے بارے میں پہاڑوں کی سی استقامت، اور فولاد کی سی صلابت تھی، لیکن اس کی تعبیر و تشریح میں، اس کی توضیح و تفہیم میں شاخِ گُل کی سی لچک اور ریشم کی سی نرمی تھی، ان کا عمل در اصل سیدنا علی مرتضیٰ کرم اللہ وجہہ کی اس حکیمانہ ہدایت پر تھا، کہ کلموا الناس علےٰ قدر عقولھم اتریدون ان یکذب اللہ و رسولہ اسلئے انھوں نے ہر زمانہ کی عقلی سطح کے مطابق دین کی تشریح و ترجمانی کا فرض انجام دیا، اور اس زمانہ کی نفسیات و ضروریات کا لحاظ کیا، تیسری صدی میں مامون و معتصم کی سرپرستی اور یونانی علوم کے اثرات سے معتزلہ دماغوں پر چھا گئے تھے، اور عقلیت کے واحد نمائندہ تصور کئے جانے لگے تھے، اعتزال زمانہ کا فیشن اور روشن خیالی کی علامت بنتا جا رہا تھا، اُس وقت امام ابو الحسن اشعری نے معتزلہ کی اس عقلی اجارہ داری کے خلاف علمِ بغاوت بلند کیا، اور شریعت و سنت کی حمایت و نصرت اور عقائد اہلِ سنت کا اثبات اسی زبان، انھیں اصطلاحات اور اسی اسلوب میں کرنا شروع کیا،

جس کے سہارے معتزلہ نے اپنا علمی تفوق اور ذہنی سیادت قائم کی تھی، اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ تھوڑی مدت میں معتزلہ کا یہ عقلی طلسم ٹوٹ گیا، اور سنّت و شریعت کے حلقوں میں جو احساسِ کمتری تیزی سے پھیلتا جارہا تھا وہ دفعتہً رُک گیا، ابو بکر بن الصیرفی کا مقولہ ہے کہ ــــــــــــــــــ یہ معتزلہ نے بہت سر اٹھایا تھا، اللہ تعالیٰ نے ان کے مقابلہ کے لئے شیخ ابو الحسن اشعری کو پیدا کیا، انھوں نے اپنی ذہانت و استدلال سے انکو بند کردیا اسی کارنامہ کی بنا پر ابو بکر اسمٰعیلی جیسے مبصرین نے ان کو مجددینِ اُمت میں شمار کیا ہے۔

امام ابو الحسن اشعری کے بعد ان کے مکتبِ خیال کے علماء نے ان کے کام کو جاری رکھا، اور قاضی ابو بکر باقلانی، شیخ ابو اسحٰق اسفرائنی جیسے متکلم، اور علامہ ابو اسحٰق شیرازی، اور امام الحرمین جیسے مدرس و استاد پیدا ہوئے جنھوں نے اہلِ سنّت کا علمی تفوق قائم رکھا، لیکن اس عرصہ میں یونان کا علمی ذخیرہ عربی میں منتقل ہو چکا تھا، اور باطنیوں اور فلاسفہ نے مل کر فلسفہ کو تقدیس و عصمت کا جامہ پہنا دیا تھا اور وہ عقلیت و حق کا معیار بن گیا تھا، اوھر علم کلام کے حلقہ میں جسکو سب سے زیادہ زمانہ شناس اور بیدار مغز ہونا چاہیے تھا، جمود و تقلید سرایت کر گئی تھی، علماء کلام کو نہ صرف اس پر اصرار تھا کہ اشعری و ماتریدی عقائد کو تسلیم کیا جائے بلکہ اس پر بھی اصرار تھا کہ ان عقائد کو ثابت کرنے کے لیے بھی وہی مقدمات و دلائل اور وہی الفاظ و اصطلاحات استعمال کیے جائیں جو اشاعرہ و ماتریدیہ نے استعمال کیے ہیں۔ حالاں کہ زمانہ نئے دلائل اور نئے طرز استدلال اور نئے اجتہاد کا طالب تھا، امام ابو الحسن اشعری کا دور فلسفہ کا دور طفولیت تھا اور عالمِ اسلام میں اس کا نیا نیا تعارف ہوا تھا۔ پانچویں صدی میں وہ اپنے شباب کو پہونچ چکا تھا۔ اور زندگی میں اپنے پنجے گڑو چکا تھا، اس وقت ایک نئی شخصیت، نئے اجتہاد تازہ دماغ اور نئے علم کلام کی ضرورت تھی، اس کے لیے انتظامِ خداوندی نے امام غزالی کو تیار کیا، امام غزالی نے اپنی تصنیفات میں اُصول و عقائد اسلامیہ پر نئے انداز سے گفتگو کی اور ان کے ثبوت کے لیے ایسے مقدمات و دلائل قائم کیے جو اس زمانہ کے لحاظ سے زیادہ موثر اور اپنے اثر کے لحاظ سے زیادہ دل نشین و دل پذیر تھے۔ انکے استدلال اور طریقِ بحث نے دین کا نیا وقار اور اہل سنت کا نیا اعتبار قائم کر دیا۔ اور ہزاروں بے چین اور مضطرب دماغوں کے لیے وہ سکون و ایمان کا باعث ہوئے۔ اگرچہ علم کلام کے حلقہ نے اس وقت ان کی اس اہم دینی خدمت کی داد نہیں دی بلکہ علم کلام کی پرانی لکیر سے ہٹنے کی بنا پر ان پر اعتراضات کیے جن کا جواب امام صاحب نے فیصل التفرقہ بین الاسلام والزندقہ میں دیا ہے، لیکن بالآخر عالم اسلام نے ان کے اس مجددانہ کارنامہ کا اعتراف کیا، امام صاحب نے فلسفہ کا جواب دینے کے لیے اس کی ضرورت سمجھی کہ وہ فلسفہ کے

اصل ماخذوں کا براہ راست مطالعہ کریں اور اس پر علمی تنقید کرنے کا استحقاق پیدا کرسکیں، چنانچہ انھوں نے دو سال لگ کر (جیسا کہ المنقذ من الضلال میں وہ لکھتے ہیں) فلاسفہ کے علوم کا گہرا مطالعہ کیا، اور باطنیہ عقائد و خیالات کی واقفیت پیدا کی، پھر انھوں نے اول مقاصد الفلاسفہ پھر تہافۃ الفلاسفۃ لکھی تہافۃ الفلاسفہ میں انھوں نے نیا کام یہ کیا کہ ابھی تک متکلمین اسلام کی طرف سے مدافعت و جوابدہی کیا کرتے تھے جو ہمیشہ سے ایک کمزور طریقہ ہے۔ امام غزالی نے پہلی بار فلسفہ کے شیش محل پر سنگ باری کی، ان کے اس حملہ کا اثر یہ تھا کہ بقول مغربی مورخین فلسفہ سو برس تک فلسفہ کی عمارت ان کے حملہ سے متزلزل رہی، اور تقریباً نوے سال کے بعد فلسفہ کے حلقہ نے ابن ارشد کی کتاب تہافت التہافت کی صورت میں امام غزالی کی کتاب کا جواب پیش کیا، امام غزالی کے بعد اس کی ضرورت تھی کہ فلسفہ کی بنیادوں پر منظم حملہ ہو، اور نفس فلسفہ کو اعتراضات کے تیروں سے چھلنی کر دیا جائے۔ اور ثابت کیا جائے کہ فلسفہ کا سارا نظام قیاس آرائی اور بادپیمائی سے زیادہ نہیں، اس کے لیے فلسفہ سے بڑی گہری اور وسیع واقفیت ایک بڑے نقاد دماغ اور ایک بڑے جری اور طاقت ور قلم کی ضرورت تھی، اس کام کیلئے شیخ الاسلام حافظ ابن تیمیہ بڑھے جو ہر طرح اس کے لیے موزوں تھے، انھوں نے اپنے مختلف رسائل بالخصوص اپنی تصنیف الرد علی المنطق میں فلسفہ اور اس کے پورے نظام فکری کو بے اعتبار ثابت کر دیا۔ ان کی مجتہدانہ کتابیں اب بھی ذہن کو نئی غذا، قلوب کو نیا اعتماد اور فکر کو تازگی اور نشاط بخشتی ہیں۔ ادھر فلسفہ اور علم کلام دونوں نے مل کر جو ایک عقلی ظاہریت اور سطحی تفلسف پیدا کر دیا تھا اور عالم اسلام میں اس کے اثر سے یہ غلط خیال پیدا ہو گیا تھا کہ صداقت و یقین حاصل کرنے کا راستہ صرف استدلال و فکر ہے، اس کے خلاف مولانا جلال الدین رومی نے قلمی جہاد کیا، ان کی زندۂ جاوید مثنوی درحقیقت ساتویں صدی کے عقلی بحران کے خلاف قلب و روح کی ایک دلکش صدائے احتجاج ہے اور نہ صرف علم کلام کی ایک مجتہدانہ تصنیف ہے بلکہ نئے علم کلام اور نئے استدلال کی بنیاد ہے۔ انھوں نے عقاید و حقائق اسلامیہ کے ثبوت کے لیے نئے نئے دلائل اور نئی نئی مثالیں دی ہیں۔ جو بیک وقت قلب و دماغ دونوں کو متاثر کرتی ہیں اور دونوں کی سلوٹوں کو دور کرتی ہوئی دلنشیں اور جاگزیں ہوتی چلی جاتی ہیں۔ اس کتاب کی تاثیر ابھی تک باقی ہے اور فلسفہ زدہ حلقوں میں اب بھی اس کے تیر بے خطا ہیں۔

مولانا روم اور حافظ ابن تیمیہ کے بعد فلسفہ نے نئی کروٹ لی، اب وہ تصوف و اخلاق کی

سرحدوں میں بھی گھس آیا اور سیاست و انتظام میں بھی دخل دینے لگا، اب اس کی تردید کے لیے تنہا الٰہیات کے مباحث اور علم کلام کی کاوش کافی نہ تھی، اب فلسفہ کے ہمہ گیر اثرات کا مقابلہ وہ کرسکتا تھا جو یونانی الٰہیات کے ساتھ یونانیوں کے علم الاخلاق، مصر کی افلاطونیت جدیدہ اور اشراق، ہندستان کے جوگ اور قرون وسطیٰ کے سیاسی تخیلات پر بھی ناقدانہ نظر رکھتا ہو، اور فلسفہ و تصوف، علم الاخلاق اور علم السیاست اور اسلام کے معاشی اصول اور نظام مالیات پر بھی اس کا مطالعہ وسیع اور نظر عمیق ہو، اس موقع پر حضرت شاہ ولی اللہ کی شخصیت نمودار ہوتی ہو، جنھوں نے حجۃ اللہ البالغہ اور ازالۃ الخفا لکھ کر اسلام کی عظمت اور صداقت کا نقش قائم کر دیا، اور علمی حلقوں میں اسلام کی نئی علمی ساکھ، علوم اسلامیہ کی زندگی کا ثبوت اور طبقۂ علماء کا وقار قائم کر دیا۔

۱۸۵۷ء میں انگریزی حکومت کے تسلط سے نئے نئے فتنوں نے سر اٹھایا، عیسائی مبلغین نے اسلام پر علانیہ حملے شروع کر دیے، اور علماء اسلام کو دعوت مقابلہ دی، پادریوں کا جواب دینے کے لیے اناجیل ان کی تفاسیر اور ان کی تاریخ تدوین اور مسیحیت و اسلام کے مابہ النزاع مسائل و مباحث کے براہ راست مطالعہ کی ضرورت تھی، اس موقع پر طبقۂ علماء ہی کے ایک فرد مولانا رحمت اللہ صاحب کیرانوی میدان میں آئے اور انھوں نے اظہار الحق اور ازالۃ الاوہام جیسی کتابیں لکھ کر مسیحیت کی اشاعت میں ایک سنگِ گراں رکھ دیا۔ یہ کتابیں ہندستان سے لے کر مصر و ترکی تک اپنے موضوع پر بے نظیر سمجھی جاتی ہیں اور ابھی تک لاجواب ہیں۔

دوسری طرف آریوں نے جن کو حکومت وقت کی شہ مل گئی تھی اسلامی عقائد و الٰہیات پر نیا حملہ شروع کر دیا۔ اور عالم کے حدوث و قدم، ذات و صفات، کلام الٰہی، حیات بعد الموت اور تناسخ، قبلہ اور حیاتِ نبویؐ پر عقلی اعتراضات کرنے شروع کیے۔ ان کے جواب میں نہ تو قدیم کلامی دلائل پورے طور پر کارگر تھے، نہ قدیم مقدمات اور قدیم اسلوب موثر تھا، حضرت مولانا محمد قاسم نانوتویؒ ان کے جواب کے لیے ایک نیا علم کلام تیار کر دیا۔ انھوں نے روزمرہ کی ہلکی پھلکی زبان میں چھوٹی چھوٹی مثالوں اور عام فہم دلیلوں میں بڑے بڑے علمی مسائل سمجھائے اور بڑے بڑے مباحث کا فیصلہ کیا۔ تقریر دلپذیر، حجۃ الاسلام آبِ حیات اور قبلہ نما ان کی ذہانت و سلامت فہم اور دقیقہ شناسی کا بہترین نمونہ ہیں۔ دوسری طرف انیسویں صدی کے آخر اور بیسویں صدی کے شروع میں پنجاب میں ایک فتنہ کھڑا ہوا۔ یہ نبوت محمدی کے خلاف ایک

سوچی سمجھی بغاوت تھی اور اسلام کے پورے اعتقادی اور علمی و فکری نظام کو ڈائنامیٹ کرنے اور خدا نخواستہ اس کے ملبہ پر ایک نئی نبوت اور امامت کے قصر کی تعمیر کی کوشش، اس کے مقابلہ میں چند مخلص اور بالغ نظر علماء میدان میں آئے جن میں مولانا سید محمد علی مونگیریؒ بانیٔ ندوۃ العلماء اور مولانا سید انور شاہؒ کا نام اور کام سب سے زیادہ روشن ہے۔

یہ ساری تفصیل اس لیے سنائی گئی کہ آپ اندازہ کرسکیں کہ علماء اسلام کی ذہانت اور جذبۂ خدمت نے کبھی کسی منزل پر قیام اور کسی لکیر کا فقیر بننا گوارا نہیں کیا، انھوں نے علم کے چلتے پھرتے قافلہ کا ساتھ دیا۔ ان کا ہاتھ زمانہ کی نبض سے کبھی جدا نہیں ہوا، ان کی نگاہ زندگی کے بدلتے ہوئے تیوروں سے کبھی ہٹی نہیں، انھوں نے اسلام کی خدمت کے لیے جس زمانہ میں جس چیز، جس طرز اور جس اسلوب کی ضرورت سمجھی، بلاتکلف اختیار کرلیا، انھوں نے اسلام سے وفاداری اور دین کی خدمت گذاری کا عہد کیا تھا، انھوں نے کسی مدرسۂ فکر، کسی مکتب خیال اور کسی اندازِ فکر سے وابستگی کی قسم نہیں کھائی تھی۔ ہندستان و مصر میں جب اسلام پر تمدن و تہذیب اور تاریخ و ادب کی راہ سے حملے شروع ہوئے اور مغربی مصنفین اور مستشرقین نے اسلام کی مستند شخصیتوں اور اس کے معیاری عہد پر اعتراضات کیے اور اسلام کے خدوخال کو بگاڑ کر بدنما شکل میں پیش کیا، تو طبقۂ علماء ہی میں سے ایسے اہلِ قلم اور ادیب و مصنف آگے بڑھے جنھوں نے ان مضامین پر ایسی کتابیں لکھیں جو نہ صرف اسلامیات بلکہ اردو ادب میں بھی یادگار ہیں اور جنھوں نے جدید تعلیم یافتہ اصحاب میں سے ہزاروں کو نیا اطمینان اور دماغی سکون عطا کیا، اور نہ صرف ان کا تذبذب دور ہوا بلکہ اسلام سے شیفتگی پیدا ہوگئی۔

الفاروق، الجزیۃ فی الاسلام، کتبخانۂ اسکندریہ اس سلسلہ کی کامیاب تصنیفات ہیں۔

خود آپ کا نصاب تعلیم اس حقیقت کا گواہ ہے کہ علماء اسلام نے کسی ضرورت کے تسلیم کرنے اور کسی مفید و ناگزیر چیز کو قبول کرنے میں کبھی پس و پیش نہیں کیا، یہ نصاب عہد بہ عہد تبدیلیوں اور مختلف علمی و عقلی رجحانات کا نمائندہ ہو، اس میں ہر دور میں اضافہ و ترمیم ہوتی رہی ہے، صرف یہ سو برس کا زمانہ ایسا ہے جس میں اس نصاب میں کم سے کم تبدیلی ہوئی ہو، حالاں کہ یہی زمانہ اپنی سیاسی و ذہنی تبدیلیوں کی بناء پر جائز اور ضروری تبدیلیوں کا سب سے زیادہ مستحق و متقاضی تھا۔

عزیزو! اس عہدِ انقلاب میں دین کی نمائندگی، تعلیمات اسلام کی ترجمانی اور نہ صرف ان کی

تشریح و تفہیم بلکہ ان کی بلندی و برتری کا نقش قائم کرنے کے لیے بڑی وسیع تیاریوں اور بڑی متنوع صلاحیتوں کی ضرورت ہو۔ آپ اسلام کے سپاہی ہیں اور زندگی کے معرکہ کے لیے تیار ہو رہے ہیں، کسی فوجی تربیت گاہ اور وہاں کی تیار ہونے والی فوج کے لیے سب سے زیادہ ناموزوں، سب سے زیادہ خطرناک بحث، قدیم و جدید اسلحہ اور طریق جنگ کی بحث ہو، سپاہی کے لیے نہ کوئی ہتھیار قدیم ہے نہ جدید، اس کو تو یہ دیکھنا ہو کہ میدانِ جنگ کے لیے کون سا ہتھیار کارگر ہو اور کون سا طریقِ جنگ موزوں، تیار ہونے والے سپاہی کے لیے تعصب کی کوئی گنجائش نہیں، اس کا نہ کسی خاص اسلحہ سے رشتہ ہے نہ کسی خاص فنِ جنگ سے، اس کو تو تمام ضروری اسلحہ سے مسلح ہونا چاہیے، عرب شاعر نے بہت پہلے کہا تھا،

کل امرئ یسعی الی یوم الھیاج بما استعدا

آپ کو نئے فتنوں سے واقف ہونا چاہیے، مگر سطحی واقفیت عدم واقفیت سے زیادہ مضر ہے، آج ہمارے مدارس میں فیشن کے طور پر بعض تحریکوں اور نظاموں کے نام لیے جاتے ہیں، اور ان کے متعلق بہت کم معلومات ہیں، ناقدانہ نظر اور محققانہ مطالعہ تو بڑی چیز ہے، ان کی اجمالی حقیقت سے بھی واقفیت نہیں، ضرورت ہو کہ ماہرین فن اور اہلِ نقد و نظر کی نگرانی اور رہنمائی میں ان کا مطالعہ کیا جائے اور اسلام کے نظام کی برتری ثابت کی جائے، یہ کام مشکل ہو لیکن ضروری ہے، اگر یہ مدارس کے اہتمام میں منظم طریقہ پر نہ ہوا تو وہ غیر منظم طریقہ پر ہوگا۔ ہمارے مدارس میں نئے مطالعہ کا رجحان بھی بڑھ رہا ہو، مگر مجھے اس کا اظہار کرتے ہوئے افسوس ہوتا ہو کہ ہمیں کوئی سنجیدگی اور گہرائی نہیں، میں عصری مطالعہ کا بڑا داعی ہوں، مگر بے تکلف کہتا ہوں کہ وہ اسقدر آسان اور سرسری کام نہیں جتنا سمجھ لیا گیا ہو، اس کے لیے کتابوں کے صحیح انتخاب و ترتیب پر پوری رہنمائی اور کسی اچھے مشیر کی رفاقت کی ضرورت ہو، پھر اس سے پہلے اس کی ضرورت ہو کہ وہ ذہن تیار ہو جائے جو اس مطالعہ سے فائدہ اٹھا سکے۔ معلومات میں صحیح ترتیب و نظام قائم کر سکے اور ان کو صحیح طور پر استعمال کر سکے، اگر یہ ذہن صحیح تعلیم و تربیت اور اساتذہ کی صحبت سے تیار ہو گیا تو وہ ہر طرح کی پڑھی ہوئی چیزوں سے کام لے گا اور معلومات کے مواد خام سے کارآمد مصنوعات اور عظیم نتائج پیدا کرے گا، اور ادب، تاریخ، معلومات عامہ، یہاں تک کہ بہت سی غیر متعلق چیزوں سے دین کی نصرت اور خدمت کا ایسا موثر اور حیرت انگیز کام لے گا جو بعض اوقات خالص دینی چیزوں سے نہیں لیا جا سکتا، اس وقت من بین فرث و دم لبناً خالصاً سائغاً

للشاد مبین کی حقیقت کا ظہور ہوگا، اگر ایسا نہیں ہو، دین کی بنیادیں قلب و دماغ میں مستحکم نہیں ہوئی ہیں، ذہن کج اور ذوق فاسد ہے تو ع

ہر چہ گیرد علتی علت شود

کا مصداق ہوگا۔

اس موقع پر میں دو اور حقیقتوں کی طرف آپ کو متوجہ کرنا چاہتا ہوں۔

ایک حقیقت تو یہ ہے کہ کسی ملک میں دین کی خدمت و اشاعت اور وہاں کی زندگی پر اثر انداز ہونے کے لیے ضروری ہو کہ دین کی خدمت کرنے والوں کو اس ملک کی زبان و ادب کا صاف ستھرا ذوق ہو، اور وہ مذاقِ سلیم اور معیار صحیح کے مطابق اس میں اظہار خیال کرنے کی قدرت، جیتی جاگتی زبان اور شگفتہ انداز بیان میں تصنیف و تقریر کی قابلیت رکھتے ہوں، دین کی دعوت اس وقت بہت موثر ہو جاتی ہو جب اس میں دل آویزی اور دلپذیری بھی ہو، اور یہ ایک ایسی نفسیاتی حقیقت اور امر واقعہ ہے کہ انبیاء علیہم السلام تک کو اپنی قوم کو خطاب کرنے اور ان کے دل و دماغ میں نفوذ کرنے کے لیے بہترین زبان دی گئی، قرآن مجید میں کہا گیا انا انزلناہ قرانا عربیا لعلکم تعقلون کہیں فرمایا گیا بلسان عربی مبین کہیں ارشاد ہوا وما ارسلنا من رسول الا بلسان قومہ اہل نظر سمجھتے ہیں کہ لسان القوم سے مراد صرف اتنا ہی نہیں کہ وہ ان کی سمجھ سکتا اور ان کو سمجھا سکتا ہو، بلکہ اپنے زمانہ کے اعلیٰ سے اعلیٰ لسانی اور ادبی معیار پر پورا اترتا، بلکہ سب سے فائق ہو، اس کی تصدیق اس سے ہوتی ہو کہ اس کے بعد ہی فرمایا لتبین لھم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا انا افصح العرب آپ جانتے ہیں کہ جن لوگوں نے اسلام کی تاریخ اصلاح و تجدید میں کوئی بڑا کارنامہ انجام دیا اور مسلمانوں کے خیالات و رجحانات پر گہرا اثر ڈالا، وہ عموماً زبان و قلم کی طاقت رکھتے تھے اور ان کی تصنیفات یا تقریروں میں صحیح ادبیت اور بلاغت ہو، حضرت شیخ جیلانی کے مواعظ آج بھی زور بیان اور خطابت کا نمونہ ہیں، امام ربانی کے مکتوبات اپنی ادبیت، زور اور طاقت، سلاست اور بے تکلفی میں ابو الفضل اور فیضی کی انشاپردازی سے کہیں بڑھے ہوئے ہیں، شاہ ولی اللہ صاحب کی حجۃ اللہ البالغہ عربی انشاء اور علمی زبان کا ایسا نمونہ ہو کہ مقدمہ ابن خلدون کے بعد سے ان صدیوں میں اس سے بہتر نمونہ نظر نہیں آتا۔ شاہ صاحب کی فارسی میں بھی خاص حلاوت اور سلاست ہو، ازالۃ الخفا کے بعض ٹکڑے ادبی شہپارے ہیں، یہ اس وقت کی

باتیں ہیں جب عربی اور فارسی اس ملک میں مسلمانوں کی تصنیفی اور علمی زبان تھی، اردو کے رواج کے بعد خود شاہ صاحب کے فرزندوں نے اردو میں تصنیف و تالیف کا کام شروع کیا، شاہ عبدالقادر صاحب کا ترجمہ دہلی کی ٹکسالی زبان کا بہترین نمونہ ہے، اور اپنی ادبی خوبیوں اور استناد کی بنا پر اردو کے کلاسیکل ادب میں خاص درجہ رکھتا ہے، مولانا محمد قاسم صاحب کی اردو تصنیفات میں ایسی سلاست سادگی اور برجستگی پائی جاتی ہے کہ دقیق علمی مضامین ذہن اور ذوق پر بار نہیں ہونے پاتے، اس ملک میں عرصۂ دراز تک زبان و ادب کی نظامت طبقۂ علمار کے ہاتھ میں رہی اور وہی اس ملک کی ادبی رہنمائی کرتے رہے، مولوی محمد حسین آزاد، خواجہ الطاف حسین حالی، مولوی نذیر احمد دہلوی اور مولانا شبلی نعمانی ادب اردو کے عناصر اربعہ سمجھے جاتے تھے، علمار نے اپنی لطافت ذوق، سلامت طبع، سخن فہمی، اور انشار پردازی کے ایسے نمونے چھوڑے ہیں جو اردو کا قیمتی سرمایہ ہیں، مولانا حبیب الرحمٰن خاں شروانی رحمۃ اللہ علیہ کے مضامین اور مولانا سید عبدالحئی ناظم ندوۃ العلما رکا تذکرہ گل رعنا اور تاریخ یاد ایام اردو نثر کا ایسا نمونہ ہے جس میں تاریخی ثقاہت و متانت اور ادبی بانکپن اور رنگینی پہلو بہ پہلو ہیں، اور یادش بخیر مولانا سید سلیمان ندوی رحمۃ اللہ علیہ نے تو اردو کو اپنی علمی تحقیقات اور ادبی مضامین سے گرانبار کر دیا۔ ان کی کتابیں اب بھی اور بہت دنوں تک نقد کامل عیار اور ادب و انشار کا معیار سمجھی جائیں گی۔ اسی طرح مولانا ابوالکلام آزاد کی تحریروں نے اردو کو ایک نئی طاقت اور نیا اسلوب بخشا، الہلال کے سحر حلال نے ایک وقت میں سارے ہندستان کو مسحور کر لیا تھا، اب بھی ان کا ایک ایسا ادبی مقام ہے جو انھیں کے ساتھ مخصوص ہے۔ علمار کی اس بیدار مغزی اور زمانہ شناسی کا نتیجہ یہ ہوا کہ علمار پر اس ملک کی تعمیر و ترقی سے علیحدگی اور اس کے رجحانات و جذبات سے بے خبری کا الزام نہیں لگایا جا سکا، انھوں نے اس ملک میں کبھی جزیرہ بننے کی کوشش نہیں کی، بعض دوسرے اسلامی ملکوں کی طرح وہ زمانہ کے کاروان سے بچھڑے نہیں، انھوں نے اپنی دعوت اور دینی مقاصد کے لیے وہی زبان استعمال کی جو اس ملک میں رائج تھی اور جو ادبی حلقوں میں اثر رکھتی تھی، ہمیں ان روایات کو قائم رکھنا چاہیے، اور اس مقدس ترکہ کی حفاظت کرنی چاہیے، ہم اگر اب بھی دین کی مؤثر خدمت انجام دینا چاہتے ہیں اور اپنے عقائد و خیالات کو عوام و خواص تک پہونچانا چاہتے ہیں تو ہمیں اپنی تصنیف و تقریر

کے لیے شگفتہ وسلیس زبان اور نیا اسلوب اختیار کرنا پڑے گا، اور اپنی تصنیفات ومضامین اور تقریروں کو اس ادبی معیار پر لانا ہوگا جو اس زمانہ میں قائم ہوگیا ہو۔ یہ نہ ثقاہت کے خلاف ہو نہ اسلاف کی روایت کے بلکہ حکمت دین کے عین مطابق ہے۔

دوسری چیز یہ ہو کہ عربی زبان اس وقت ایک زندہ اور طاقت ور زبان ہے، عرب ملکوں میں وہ اپنے پورے عروج اور شباب پر ہے، وہ تصنیف وتالیف، خطابت وتقریر، سیاست وصحافت، علم وفلسفہ اور دستور وقانون کی زبان ہے، وہ پورے طور پر نکھر گئی ہو، ہمارے عربی مدارس میں ایک غلط فہمی یہ پھیلی ہوئی ہے کہ قدیم عربی زبان تفسیر وحدیث وفقہ میں محدود ہو اور وہ کہیں پائی نہیں جاتی، عربی کے نام سے بالکل ایک جدید زبان ایجاد ہوگئی ہے، جس میں زیادہ تر انگریزی وفرانسیسی کے معرب یا دخیل الفاظ ہیں، اس غلط فہمی نے ہمارے بہت سے علماء اور نوجوانوں کو عربی سے متوحش اور مایوس بنا دیا ہو، آپ اگر مجھ پر اعتماد کرسکیں تو میں پورے وثوق کے ساتھ عرض کروں گا کہ جدید عربی کا کہیں وجود نہیں، اس وقت جو زبان اہل علم اور اہل قلم شرق اوسط میں استعمال کرتے ہیں، وہ قرآن وحدیث اور جاہلیت واسلام کی زبان سے زیادہ سے زیادہ قریب ہو، نئی ضرورتوں کے لیے بھی انھوں نے عربی کے قدیم ذخیرہ اور قرآن وحدیث سے الفاظ نکال لیے ہیں۔ اس سلسلہ میں عرب ملکوں نے جو کام انجام دیا ہے وہ حیرت انگیز بھی ہے اور قابل داد بھی، مصر پر فرانسیسی حملہ کے بعد سے جو مغربی الفاظ عربی زبان میں داخل ہوگئے تھے وہ ایک ایک کرکے بے دخل کیے گئے اور انکی جگہ پر خالص عربی الفاظ رکھے گئے، اس وقت ان ملکوں کا لسانی اور ادبی معیار اتنا بلند ہوگیا ہو، اور صحافت و اشاعت نے عربی کے خزانۂ عامرہ کے نوادر کو ایسا وقف عام کردیا ہے کہ اب عربی میں کام کرنے کے لیے بڑی تیاری اور بڑی جد وجہد کی ضرورت ہے، ہمارے مدارس میں جس انداز پر عربی زبان وادب کی تعلیم ہورہی ہے اس کے ساتھ ان ملکوں میں کوئی علمی خدمت یا دعوتی کام ناممکن ہو، اگر آپ کو عربی دنیا میں دین کی دعوت وتبلیغ کا کام انجام دینا ہے یا ہندستان کی دینی وعلمی تحریکات کا تعارف کرانا ہو تو اس کے لیے بڑے پیمانے پر تیاری کی ضرورت ہوگی۔ اب ہندستان ان ملکوں سے الگ نہیں رہ سکتا، دنیا کی سیاست میں شرق اوسط کو خاص اہمیت حاصل ہے، اور یہ اہمیت بڑھتی جائے گی۔ ہر ایک مسلمان کے نقطۂ نظر سے وہ اب بھی عالم کا قلب اور مرکز اعصاب ہو۔ اگر شرق اوسط سے ربط قائم کرنے اور

دین اور مسلمانوں کی صحیح نمائندگی کرنے کے کام سے علماء نے گریز کیا تو یہ نہ ان کے حق میں اچھا ہوگا نہ اس ملک کے حق میں اس لیے اس پہلو کی طرف بھی ہمارے مدارس میں خصوصی توجہ کی ضرورت ہو، زبان وادب زندہ اور متحرک چیزیں ہیں، کچھ مدت کیلیے بھی اگر کوئی ادارہ یا فرد ان سے بچھڑ جائے تو اس کو اس کا نقصان مدتوں برداشت کرنا پڑے گا۔

دوستو! اور بھائیو! میں نے آپ کا بہت وقت لیا، لیکن

لذیذ بود حکایت دراز تر گفتم

اب آپ سے رخصت ہونے سے پہلے میں ایک آخری چیز کہنا چاہتا ہوں جو اگرچہ آخر میں کہی جارہی ہے، مگر وہ اہمیت میں کسی سے کم نہیں، آپ کے اسلاف کا سب سے بڑا کارنامہ یہ ہے کہ انھوں نے مسلمانوں کے دینی حس اور مذہبی غیرت کی حفاظت کی اور وقت کے کسی فتنہ کے سامنے سپر نہیں ڈالی۔ انھوں نے بدعات و رسوم اور شعائر جاہلیت کے معاملہ میں بھی مداہنت و تساہل سے کام نہیں لیا۔ آپ کے اسلاف میں حضرت مولانا شاہ محمد اسمٰعیل شہیدؒ اور مولانا رشید احمد صاحب گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ جیسے جبل استقامت اور نقیب شریعت گزرے ہیں، جنھوں نے سب کچھ گوارا کیا، مگر کسی خلاف شریعت فعل اور کسی بدعت کے ساتھ رعایت نہیں برتی، انگریزی حکومت کے تسلط کے بعد جب اس ملک پر مغربی تہذیب و عادات اور ملحدانہ عقائد و خیالات کا سیلاب آیا تو آپ چٹان کی طرح اپنی جگہ قائم رہے، آپ کے اسلاف شریعت کے بارہ میں اتنے ذکی الحس، اتنے دوربین اور اتنے غیور واقع ہوئے تھے کہ انھوں نے آخر وقت تک مجالس میلاد، قیام اور ان بے شمار بدعات کو سندِ جواز نہیں دی۔ جو مسلمانوں کی زندگی کا جزو بنتی جاتی تھیں، انھوں نے محتسب اور شریعت کے بے لاگ منتظم کے فرائض انجام دیے اور ان کی نگاہ احتساب سے کوئی انحراف اور کوئی بدعت بچ کر نکل نہیں سکی انھوں نے عوام کا عتاب، لوگوں کی ملامت، تکفیر کے فتوے، مقاطعہ اور ایذارسانی سب کچھ گوارا کی مگر اپنے مسلک کو نہیں چھوڑا، اس کا نتیجہ یہ ہو کہ آج لاکھوں کی تعداد میں ایک طبقہ جو زیادہ سنجیدہ، باوقار اور صاحب فکر ہو ان بدعات سے محفوظ ہے۔ اور یہ بدعات ابھی تک مسلمانوں کی زندگی میں متند اور مسلّم نہیں ہوسکیں، اللہ تعالیٰ ان خادمین شریعت اور ان محافظین دین کی تربتیں ٹھنڈی رکھے اور ان کو امت کی طرف سے جزائے خیر عطا فرمائے۔

آسماں ان کی لحد پر شبنم افشانی کرے
سبزۂ نورستہ اس گھر کی نگہبانی کرے

آج ہمیں ان کی بصیرت، ان کی فراست، ان کے دینی تفقہ اور ان کے رسوخ فی العلم کی قدر آتی ہو کہ انھوں نے اپنا فرض کس خوبی سے انجام دیا من المومنین رجال صدقوا ما عاھدوا اللہ علیہ فمنھم من قضی نحبہ ومنھم من ینتظر وما بدلوا تبدیلا۔

مجھے پہلے تو آپ سے یہ کہنا ہو کہ یہ آپ کا بڑا عزیز اور محبوب سرمایہ ہو، انھوں نے اپنی جانوں کو حصار بنا کر اس باغ کی حفاظت کی ہو، انھوں نے اپنے خون سے اس کے درختوں کو سینچا ہو۔ اور ہمیں بتلا دیا کہ شریعت کے باغ کی رکھوالی اس طرح کی جاتی ہو۔

آغشتہ ایم ہر سر خارے بخونِ دل
قانونِ باغبانیٔ صحرا نوشتہ ایم

ہمیں اس سرمایہ کو سینہ سے لگا کر رکھنا چاہیے۔ اور اپنے ہر سرمایہ سے زیادہ اس سرمایہ کو عزیز رکھنا چاہیے۔ مجھے آپ سے دوستانہ شکایت ہو، میرے دردمند دل کو آپ سے گلہ ہو کہ آپ اس سرمایہ سے بیگانہ ہوتے جا رہے ہیں۔ آپکے بزرگوں کی بہترین صلاحیتیں اور مبارک ترین اوقات ان نفوس قدسیہ کی طرف سے حمایت و مدافعت میں گزرے، آپ انھیں کی بدولت ایک بڑے گروہ میں معتوب و مغضوب ہوئے اور آپ کے ساتھ اب بھی یہ نسبت لگی ہوئی ہو، مگر اب آپ میں بہت سے ان کے نام اور کام سے بھی واقف نہیں، آپ میں سے کتنے مولانا اسمٰعیل شہیدؒ کے حالات اور کارناموں سے واقف ہیں؟ آپ میں سے کتنے بھائیوں نے صراط مستقیم اور تقویۃ الایمان پڑھی ہو؟۔ آپ میں سے کتنے بھائی توحید و سنت کی صحیح حقیقت سے واقف ہیں۔ وہ بتلا سکتے ہیں کہ اہلِ جاہلیت کے ایمان باللہ کی حقیقت کیا تھی، اور قرآن نے کیوں ان کو مشرک کہا، توحید کے کیا مراتب ہیں، اور شرک کے کیا مظاہر ہیں۔ بدعت کی جامع و مانع تعریف کیا ہے اور اس کے کیا نقصانات ہیں، آپ کو ان سب مسائل پر تیار ہونا چاہیے تھا۔ اور آپ کا مطالعہ اور آپ کی بصیرت عوام سے اس بارہ میں بہت ممتاز ہونی چاہیے تھی، مگر مجھے خطرہ ہو کہ آپ میں سے بہت سے بھائی ان چیزوں سے بالکل خالی الذہن

ہوں گے،

اسی کے ساتھ ایک دوسری حقیقت یہ ہے کہ اب نیا دور نئے فتنے لا رہا ہے۔ جاہلیت نئے روپ میں ظاہر ہو رہی ہے، پہلے اگر بدعات کا معاملہ تھا تو اب کھلی کھلی وثنیت اور اصنامِ قدیمہ کا دور دورہ ہے، یہ حالات ہمارے احساسِ مذہبی، ہماری حمیتِ دینی اور ہمارے عقیدۂ توحید کو چیلنج کرتے ہیں۔ اب دیکھنا یہ ہو کہ جنھوں نے مجلس میلاد کے قیام، سجدۂ تعظیمی، عرس اور فاتحہ اور نذر و نیاز کو کبھی گوارا نہیں کیا وہ ان مشرکانہ رسوم و مظاہر کو کس طرح گوارا کرتے ہیں، اور ان کا رویہ اس بارہ میں کیا ہوتا ہے۔ ہم اپنے اسلاف کے دینی تصلب اور دینی شجاعت کے معترف ہیں۔ اور خدا اور خلق کے سامنے اس کی گواہی دینے کے لیے تیار ہیں کہ انھوں نے باطل کے سامنے گردن نہیں جھکائی۔ اور ہتھیار نہیں ڈالے، دیکھنے کی بات ہے کہ ہمارے بعد کی نسلیں ہمارے متعلق کیا رائے قائم کرتی ہیں، اور ہم تاریخ میں کیسے نقوش چھوڑ کر جاتے ہیں۔

عزیزو! اور رفیقو! تقدیر الٰہی نے ہمارے لیے جس دور کا انتخاب کیا ہو اسکی ذمہ داریاں بہت بڑھی ہوئی ہیں۔ لیکن اس کا انعام اور اس کی سرفرازیاں بھی بہت بڑھ چڑھ کر ہیں۔ ذمہ داریوں سے گریز اور زمانہ سے شکست مردوں کا کام نہیں، جو وقت باقی رہ گیا ہے اس کو تیاری میں صرف کیجیے، خدا نے آپ کو بہترین مربّی اور شفیق استاد دیے ہیں، ایک دینی ماحول اور ایک بہت بڑا ادارہ بخشا ہے۔ زمانہ کی نزاکت، اور اپنے کام کی عظمت سمجھیے، اور اپنے کو قیمتی اور کارآمد بنائیے، تاکہ اُمّت کے لیے قیمتی اور کارآمد ثابت ہوں۔

غافل منشیں، نہ وقت بازیست
وقت ہنر است و کار سازیست

ھادم اللذات

ایک سیاسی قوال کا عروج و زوال

از ۔۔۔ مولانا سید مناظر احسن گیلانی

(۲)

(سلسلہ کے لیے الفرقان بابت ماہ جمادی الاخریٰ ملاحظہ فرمائیں)

دس سال کی گمنامی، خمول، عزلت و گوشہ گزینی کی صبر آزما مدت بالآخر ختم ہوئی، انتظار کے ان کٹھن دنوں کو گذارنے کے بعد خالد کے لیے پھر ابھرنے اور سر نکالنے کا موقع اس وقت آیا جب عبد الملک کے چار نامدار لڑکوں (ولید، سلیمان، یزید، ہشام) میں سے چوتھے لڑکے ہشام کے ہاتھ میں مروانی حکومت کی باگ آئی۔ اس زمانہ کے دو مختلف سیاسی نظریات میں ہشام بن عبد الملک کا نظریۂ حکومت وہی تھا، جو اس کے باپ عبد الملک کا تھا، یعنی حکمرانی و جہان بانی کے سلسلے میں ایک نمونہ دا سرہ تو وہ تھا، جسے خود داعی اسلام خاتم المرسلین صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے راشدین خلفاء رضی اللہ تعالیٰ عنہم نے عملاً دنیا کے سامنے پیش کیا تھا، اور دوسری مثال کسریٰ اور قیصر کی حکومتوں کی تھی۔ عبد الملک کے متعلق تاریخوں میں یہ لطیفہ جو نقل کیا جاتا ہو کہ جب تک خلافت کی گدی تک اس کی رسائی نہیں ہوئی تھی،

کان ناسکا　　بڑا عبادت گذار تھا، عالم و فقیہ سمجھا جاتا

عالماً فقیہا.　　تھا۔

مشہور صحابی عمر فاروق کے صاحبزادے حضرت عبد اللہ بن عمر نے اسی لئے لکھا ہو کہ اس زمانہ میں عبد الملک کا نام ہی حمامۃ المسجد (مسجد کی کبوتری) رکھ دیا تھا، لیکن ٹھیک اس وقت جب عبد الملک قرآن کی تلاوت میں مشغول تھا، سنانے والے نے یہ بشارت جب اس کو سنائی کہ خلافت کے لیے وہ منتخب ہوگیا، تو جیسا کہ الدمیریؒ وغیرہ نے لکھا ہو۔

سلہ حاشیہ اگلے صفحہ پر ملاحظہ ہو۔

قرآن مجید کو اس نے بند کر دیا اور قرآن کو خطاب کر کے بولا، سلام ہو تجھ پر میرے اور تیرے درمیان جدائی کا وقت آگیا۔

فطبقه و قال سلام عليك
هذا فراق بيني وبينك
ص۵

اس کے بعد عبد الملک نے اپنی حکمرانی کے عہد میں جو کچھ کیا تاریخ میں اس کی روداد موجود ہو، بقول علامہ ابوبکر الجصاص جزیہ کا ٹیکس اسلام قبول کرنے والے نومسلموں سے بھی وصول کرنے کا طریقہ اسی نے جاری کیا، لیکن مروانی حکومت کا اقتدار جب عمر بن عبد العزیز رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے ہاتھوں میں آیا تو اس مشہور گشتی فرمان کو جاری کر کے جس میں لکھا تھا کہ ان الله بعث محمدا صلى الله عليه وسلم داعيا ولم يبعثه جابيا (یعنی محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو خدا نے اس لیے اٹھایا تھا کہ لوگوں کو خدا کی طرف دعوت دیں، نہ کہ مالگذاری اور ٹیکس وصول کرنے کے لیے آپ مبعوث ہوئے تھے) حضرت عمر بن عبد العزیز نے جزیہ والے ٹیکس کو مسلمانوں سے منسوخ فرما دیا تھا، الجصاص نے اپنی فقہی تفسیر میں اسی واقعہ کو بیان کرنے کے بعد لکھا ہو کہ۔

ف۱ مگر الدمیری ہی نے عبد الملک کی اسلامی غیرت و حمیت کا ایک بڑا دلچسپ قصہ نقل کیا ہو، خلاصہ یہ ہو کہ دینار و درہم عبد الملک کے زمانہ تک اسلامی ممالک و مقبوضات میں بھی عموماً وہی مروج تھے، جو رومیوں اور ایرانیوں کے ٹکسالوں میں مسکوک ہوئے تھے۔ مسلمانوں کی حکومت نے اس وقت تک مستقل ٹکسال اپنا نہیں قائم کیا تھا، اتفاقاً یہ واقعہ پیش آیا کہ مصر میں سرکاری کاغذ جو بنتے تھے یا خاص قسم کے کپڑے تیار ہوتے تھے ان پر رومیوں کی عیسائی حکومت کے خاص نشانات بھی بنائے جاتے تھے، عبد الملک کو جب یہ معلوم ہوا کہ درحقیقت مسیحیت کے عقیدۂ تثلیث کے یہ رمزی نقوش ہیں تو آئندہ ان نقوش کی ممانعت کا حکم اس نے دے دیا۔ اس کی خبر قیصر روم کو جب ہوئی تو عبد الملک کو لکھ بھیجا، تمھارے ملک میں ہمارے یہاں کے سکے درہم و دینار چلتے ہیں، میں بھی ان پر تمھارے پیغمبر کے نام گالیاں چھپواؤں گا، قیصر کی یہ دھمکی عبد الملک تک جب پہونچی تو بیان کیا جاتا ہے کہ سخت پریشان ہوا، کہتا تھا کہ اسلام میں مجھ سے زیادہ بدبخت اور منحوس آدمی کوئی پیدا نہ ہوا، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو گالیاں سکوں میں میری وجہ سے چھاپی جائیں گی، اس کے بعد طے ہوا کہ مسلمان اپنی ٹکسال خود بنائیں۔ کہتے ہیں کہ امام محمد باقر نے سکوں کے ڈھالنے اور وزن وغیرہ کا طریقہ بتایا تھا۔

(حیٰوۃ الحیوان ص۵۶ للدمیری)

جب ہشام بن عبدالملک حکمراں بنایا گیا، تو اس نے مسلمانوں پر جزیہ کے اس ٹیکس کو پھر لگا دیا۔	فلما ولی ہشام بن عبدالملک اعادھا علی المسلمین ص۱۲۶ ج۳

سیاست اور طریقۂ حکمرانی میں ان دونوں پارٹیوں کے اسی بنیادی نقطۂ نظر کے اختلاف کی طرف اشارہ کرتے ہوئے حضرت عمر بن عبدالعزیز فرمایا کرتے تھے کہ

میں (حکمرانی کے طریقہ میں) کسی نئی بات کے ایجاد کرنے کا حق نہیں رکھتا، بلکہ میرا کام صرف پیروی کرنا ہو، یعنی عہد نبوت و خلافت راشدہ کے طریقۂ حکمرانی کا اتباع میرا کام صرف یہی ہو۔	لست بمبتدع ولکنی متبع ص۲۵۱ ج۵ ابن سعد

خالد جیسا کہ اس کے گزشتہ حالات سے اندازہ ہوا ہوگا، اس زمانہ کی اسی سیاسی پارٹی کا ہمنوا تھا جو ہشام بن عبدالملک کے خلیفہ منتخب ہونے کے بعد برسر اقتدار آگئی تھی، خلافت اور رسالت کے متعلق جس نظریہ کے ایجاد کا فخر خالد نے حاصل کیا تھا ہشام جو اسی پارٹی کا آدمی تھا، اس سے ظاہر ہو کہ خالد کی اس اُپج کے مخفی رہنے کی وجہ ہی کیا ہو سکتی تھی، اسی کا نتیجہ یہ ہوا کہ ہشام بن عبدالملک کی حکومت پر چند مہینے بھی ابھی نہیں گزرے تھے کہ وہی خالد بن عبداللہ جو اس زمانہ کے سیاسی مطلع سے ناپید ہو کر عوام کے دل دماغ سے گویا محو ہو چکا تھا، اچانک دکھا گیا کہ پہلے تو بصرہ اور کوفہ کا والی بن کر دمشق سے روانہ ہوا اور کچھ ہی دن بعد عراق کے ساتھ خراسان کا سارا علاقہ بھی اسی کے زیر اقتدار ہشام نے کر دیا۔

خالد نے اپنا مستقر تو کوفہ کو قرار دیا، بصرہ میں اس کی نیابت اس زمانہ کی ایک خاص سیاسی شخصیت بلالؒ بن ابی بردہ کرتے تھے، اور خراسان جس میں ایران و ترکستان وغیرہ کے سارے علاقے شریک تھے۔ یہاں کی حکمرانی خالد ہی کے اپنے بھائی اسد بن عبداللہ کے سپرد تھی، جس نے خراسان میں آگ لگا کر اپنے

ؒ بلال بن ابی بردہ کے حالات بھی خاص طور پر قابل مطالعہ ہیں، ان کا ایک خاص رنگ تھا، عمر بن عبدالعزیز جب خلیفہ ہوئے ...... تو بلال نے بڑی مسرت کا اظہار کیا، ان کی خدمت میں حاضر ہوئے اور کہنے لگے کہ (باقی اگلے صفحہ پر)

قیام کے لیے انتخاب کیا تھا، بلکہ بلخ کی نئی تعمیر اسد ہی کے زمانہ میں ہوئی، عام آبادی سے چند میل دور بورقان
نامی مقام کو صرف امراء کے لیے اسد نے مختص کر دیا تھا، گویا اس زمانہ میں بورقان کی حیثیت سول لائن کی تھی۔
الغرض خالد کی دیرینہ تمنا خلافت کے سارے مشرقی علاقوں کی حکومت جب پوری ہوئی، تو اس نے بڑے
آن بان سے فرماں روائی شروع کی، ملک کی آبادی اور آب پاشی کے ذرائع کی توسیع میں کافی اُولوالعزمیوں سے
اس نے کام لیا۔ مورخ طبری نے براہ راست اسی کی زبانی یہ دعویٰ نقل کیا ہو کہ

سکرت دجلة ولم یتکلف — یعنی دجلہ پر میں نے بند باندھا، اس ہم کو
ذالك احد ص ۲۵۳ ج ۸ — کسی نے اب تک انجام نہیں دیا تھا۔

سچ پوچھیے تو یہ وہی کار وبار ہو جس کی تعبیر آج کل پراجکٹ کے مہیب لفظ سے نہروں اور دریاؤں
کے متعلق لوگ کرتے ہیں، خالد نے دجلہ پر بھی بند تعمیر کر کے اس کے پانی پر قابو حاصل کیا تھا، اور فرات سے جو
نسبتاً دجلہ سے چھوٹا دریا تھا، اس سے بھی کاٹ کاٹ کر عراق کے مختلف حصوں میں اس نے نہریں جاری کی تھیں۔
نہر باجوی، نہر بارماتا، نہر مبارک، نہر جامع، نہر صلح، نہر خالد، .... ناموں کی نہروں کا ذکر ہمارے
مورخین کی عام کتابوں میں اب تک موجود ہو جو اسی خالد گورنر عراق کی تعمیر کی ہوئی تھیں، دریاؤں کو باندھ کر
ان کے پانی سے استفادہ کا خیال خالد کے ذہن میں شاید اس لیے آیا ہو کہ اس کے آباء و اجداد کا اصلی وطن
یمن کا علاقہ شراۃ نامی تھا، یمن کے مشہور قبیلہ بجیلہ سے اس کا نسبی تعلق تھا، یمن میں تاریخ کے نامعلوم زمانہ سے

(حاشیہ صفحہ گزشتہ) خلافت پر لوگ اب تک ناز کرتے تھے، لیکن آج خلافت آپ پر ناز کر رہی ہو، چند اشعار بھی اس نے سنائے
جس میں اسی مضمون کو ادا کیا گیا ہو، لکھا ہو کہ وہاں سے رخصت ہو کر مسجد پہونچے اور یصلی ویقرء لیلہ ونہارہ (یعنی مسلسل
نمازیں پڑھتے رہتے تھے، اور صبح و شام تلاوت میں مشغول رہتے، حضرت عمر بن عبدالعزیز نے ایک صاحب کو ان کے پاس بھیجا کہ بصرہ
کی گورنری کا عہدہ اگر خلیفہ سے کوشش کر کے دلا دوں تو مجھے کیا معاوضہ دوگے، بیان کیا گیا ہو کہ بلال کے سامنے یہ تجویز جب
پیش ہوئی تو بولے کہ سال بھر کی تنخواہ پیش کر دوں گا، یہ رقم ایک لاکھ میں ہزار درہم کی تھی۔ اس شخص نے کہا کہ تحریری معاہدہ
کیجیے، لکھ کر بھی دے دیا، عہد نامہ کے اسی وثیقہ کو حضرت عمر بن عبدالعزیز کے سامنے اس شخص نے پیش کر دیا، فرمایا صرف باتوں کا آدمی ہو
کام کا نہیں ہو، بلال ناکامی کے ساتھ واپس ہوئے، ہشام بن عبدالملک کے عہد حکومت میں خالد کی پارٹی میں شریک ہو کر بالآخر بصرہ کی گورنری
حاصل کرنے میں کامیاب ہوئے، اسی سے معلوم ہوتا ہو کہ کوئی خاص اصولی نظریہ سیاست میں نہیں رکھتے تھے۔ ارباب سیاست کی ایک خاص قسم
یہ بھی ہو کہ با مسلماں اللہ اللہ با برہمن رام رام ۱۲-

پہاڑوں کے درمیان دیوار بنا کر بند یعنی سد بنانے کا طریقہ مروج تھا جس کی ٹوٹی پھوٹی یادگاریں آج بھی اس ملک میں پائی جاتی ہیں، سد مارب خاص طور پر یمن کا تاریخی بند تھا، اسلامی عہد میں نہر سازی کے اس کاروبار کو سکر کہتے تھے، بند کی تعبیر بھی اسی لیے سکر کے لفظ سے کی جاتی تھی، بظاہر سندھ کا سکھر اسی سکر کے لفظ کی بگڑی ہوئی شکل ہے۔ سکھر برج جس کا شمار موجودہ دنیا کے عظیم ترین پراجکٹوں میں کیا جاتا ہے بظاہر عہد اسلامی کے قدیم سکر کی یہ تجدید سکھر میں ہوئی ہے[۱]۔

خالد کے نہری نظام کا ملک کے معاشی ارتقاء پر کیا اثر مرتب ہوا تھا، اس کا اندازہ اسی سے ہوتا ہے کہ ذاتی طور پر خالد کو صرف اسی نہر کی بدولت جس کا نام نہر خالد تھا، طبری میں ہے۔

پانچ ملین (پچاس لاکھ) کی سالانہ آمدنی ہوتی تھی۔ — کان یغل خمسۃ آلاف الف — ج ۵ ص ۲۵۵

آمدنی کی توفیر کے ساتھ ساتھ، جیسا کہ بیان کیا جاتا ہے، حکومت کی عام وفادار، پرامن رعایا کے ساتھ خالد اور خالد کے نواب جو ملک میں مختلف حصوں میں اس کی نیابت کرتے تھے، جود و کرم، بذل و نوال کے جو قصے مزے لے لے کر بیان کرتے ہیں۔ ان کو پڑھ کر حیرت ہوتی ہے، ابن عساکر نے براہ راست خالد ہی کی زبانی یہ روایت نقل کی ہے کہ

"برسر منبر ایک دن خالد نے اقرار کیا تھا کہ ۳۶ ہزار بدویوں میں روزانہ اس کے ہاں سے ستو اور کھجور (کا راشن مفت) تقسیم ہوتا ہے" — تاریخ دمشق ج ۵ ص ۸۲

تاریخوں میں خالد کی داد و دہش کے دلچسپ لطیفے لوگوں نے نقل کیے ہیں، ایک بدوی نے سوال کیا خالد نے پوچھا کہ کتنی رقم تجھے چاہیے۔ بدو نے کہا ایک لاکھ، خالد نے کہا اوہ تیرا مطالبہ تو بہت

---

[۱] حاضر العالم الاسلامی عربی کتاب جو ایک امریکی مصنف کی انگریزی کتاب کا ترجمہ ہے۔ اسی پر امیر شکیب ارسلان مرحوم نے جو قیمتی ضخیم نوٹ لکھے ہیں، ان میں یہ بھی امیر مرحوم ہی کی روایت ہے، کہ جرمن کا ایک ماہر انجینیر جو عراق کی سیر کر چکا تھا کہتا تھا کہ عربوں نے اپنے ایام حکومت میں دجلہ و فرات کو باندھ باندھ کر نہروں کا جال بن فنی مہارتوں سے کام لیتے ہوئے پھیلا دیا تھا، اور وحشی تاتاریوں نے سب کو توڑ پھوڑ کر برابر کر دیا، ان کے شکستہ آثار کو دیکھ کر مجھے اندازہ ہوا کہ اس زمانہ کے انجینیر بھی اس نوعیت کے بند بنانے سے عاجز ہیں۔

زیادہ ہو، اپنے مطالبے کو کچھ کم کر، بدو نے کہا اچھا نوے ہزار کم کر کے صرف دس ہزار تک اپنے مطالبے کو محدود کر دیتا ہوں، یہ سن کر خالد نے حیرت سے پوچھا کہ تو بھی عجیب آدمی ہو، ایک لاکھ سے دس ہزار پر اُتر آیا۔ جواب میں بدوی نے کہا

جی ہاں! پہلی دفعہ مطالبہ آپ کی ہمت کے مطابق میں نے کیا تھا، اور بات جب آپ نے میری ہمت کے سپرد کر دی تو اس وقت اپنی ہمت کے مطابق جو رقم ہو سکتی تھی اسی کا ذکر کر دیا گیا۔

بدوی کی صرف اس بذلہ سنجی سے خالد اتنا خوش ہوا کہ چلا کر غلام سے اس نے کہا

"ایک لاکھ کی رقم بدو کے حوالہ کر دو۔" ص۲۰۰

اس قسم کے لطیفوں کا ایک ذخیرہ کتابوں میں لوگوں نے جمع کر دیا ہو، اسی کا بھائی اسد بن عبداللہ جس کا مستقر بلخ تھا، بڑا منچلا فاتح تھا، فاتح ہند شہاب الدین غوری کے وطن غور پر پہلا حملہ اسد ہی نے کیا تھا، غور والوں نے اپنی دولت پہاڑ کے ایسے غاروں میں چھپا دی تھی جہاں تک پہونچنے کی راہ بجز غور والوں کے دوسروں کو معلوم نہ تھی۔ اسد نے بڑے بڑے صندوق تابوت کی شکل میں تیار کرا کے آہنی زنجیروں میں باندھ کر حکم دیا کہ ان میں بیٹھ کر لوگ ان غاروں تک لٹک کر پہونچ جائیں اور یوں سارا مال اسد نے برآمد کر لیا، گویا کرین لگا کر یہ مدفونہ مال نکال لیا گیا۔

بلخ کی سول لائن بورقان میں اسد کا دربار مختلف تقریبوں کے سلسلہ میں شاہانہ شان و شوکت کے ساتھ منعقد ہوتا تھا، خراسان کے بڑے بڑے دہقان (زمیندار و جاگیردار) ملک کے اطراف و اکناف سے بورقان میں جمع ہو جاتے تھے اور تحفے تحائف کے پیش کرنے میں ایک دوسرے پر سبقت کرتا تھا، "مہرجان" جو ایرانیوں اور خراسانیوں کی عید کا مشہور دن تھا، ان لوگوں کی اسی قومی عید کے دن بھی خاص دربار کا انتظام اسد کی طرف سے کیا جاتا تھا[1]، طبری وغیرہ میں اسی تہوار

---

[1] مروانی دور حکومت کی یہ سیاسی پارٹی جس میں خالد اور خالد کے بھائی اسد وغیرہ جیسے لوگ شریک تھے، ان مسلمانوں کا یہ عجیب حال تھا کہ ایک طرف تو عرب اور عربی قومیت پر حد سے زیادہ زور دیتے تھے، رومی اور فارسی زبانوں سے شاہی دفاتر عربی زبان میں عبدالملک ہی کے زمانہ میں منتقل ہوئے۔ امام ابوحنیفہ کا قول کتابوں میں نقل کیا ہو کہ (بقیہ حاشیہ اگلے صفحہ پر)

والے دربار کا تذکرہ ان الفاظ میں کیا گیا ہے، یعنی یہ لکھتے ہوئے کہ

اسد کے دربار میں ملک کے امراء اور دہاقین تحائف لے کر حاضر ہوئے	قدم علیہ الامراء والدہاقین بالھدایا۔ ص ۲۲۷ ج ۵

آگے صرف ایک دہقانی جو دہقان ہراۃ کہلاتا تھا، اس کے متعلق بیان کیا ہے کہ

ایک ملین (دس لاکھ) کی قیمت ان تحائف اور سوغاتوں کی تھی جو دہقان ہراۃ نے پیش کیے تھے جن میں دو قصر (بظاہر کا سکٹ)، ایک خالص سونے کا، اور ایک خالص چاندی کا تھا۔ بڑے بڑے طلائی اور نقرئی جگ (اباریق) اور طشت بھی سونے چاندی کے دہقان نے پیش کیے تھے۔ اسد کرسی پر بیٹھا تھا اور سامان اس ترتیب سے چنے گئے تھے، سب سے آگے دونوں کا سکٹ (قصر زریں وسیمیں) تھے، ان کے پیچھے طلائی ونقرئی جگ اور طشت رکھے گئے تھے، اور ان کے بعد دیبا وحریر کے تھان تھے۔ جن میں مروی، کوہی، ہروی ہر قسم کے ساخت کے کپڑے تھے، یہاں تک کہ سارا فرش دہقان ہراۃ کی پیشکشوں سے بھر گیا، ایک دلچسپ تحفہ اسی دہقانی کا ہرات کا ایک کرہ (گیند) تھا، جو زر خالص سے ڈھالا گیا تھا۔"

ہراۃ کے ایک دہقانی کی پیش کش کے ان سامانوں سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ مختلف عیدوں اور تہواروں کے موقع پر کیا کچھ چیزیں نذرانوں میں نہیں آتی ہوں گی، تحفے تحائف کی راہوں سے خود حکمرانوں کو نہیں، بلکہ اس کے گورنر کو بھی نہیں گورنر کی نیابت کرنے والوں کے سامنے جب ایسی چیزیں پیش ہوتی تھیں تو حکومت کے عہدہ داروں کی عام آمدنیوں کا کیا حال ہوگا، لیکن اسی کے ساتھ جیسا کہ خالد کا

(بقیہ حاشیہ صفحہ گزشتہ) مروانیوں کے سارے ایام حکومت میں کسی غیر عربی مسلمان عالم کو حکومت کا کوئی عہدہ قضا وغیرہ کا دیا جاتا تھا، اور انتہا عربی عصبیت کی یہ تھی کہ فتویٰ تک پوچھنے میں احتیاط برتی جاتی تھی۔ کہ کسی غیر عربی مسلم عالم سے مسئلہ نہ پوچھا جائے۔ پہلی دفعہ مروانیوں کے آخری گورنر کوفہ ابن ہبیرہ نے امام صاحب رحمۃ اللہ علیہ سے مجبور ہو کر ایک مسئلہ دریافت کیا (دیکھو میری کتاب امام ابوحنیفہ کی سیاسی زندگی)، اور بھی بیسیوں امتیازی برتاؤ عربی اور غیر عربی مسلمانوں کے ساتھ کیے جاتے تھے۔ باوجود اسلام قبول کر لینے کے جزیہ مسلمانوں پر جو لگایا گیا تھا اس کی تہ میں بھی گورنری جذبہ کارفرما تھا، لیکن اسی کے ساتھ اپنے ملک کی غیر مسلم رعایا کو خوش کرنے کے لیے ان کی قومی عیدوں اور تہواروں میں بھی غیر معمولی گرم جوشیوں کے ساتھ مسلمانوں کی یہ سیاسی پارٹی حصہ بھی لیتی تھی۔"

حال تھا کہ بہت کچھ حاصل بھی کرتا تھا اسی طرح لٹاتا بھی تھا، یہی حال اس کے بھائی اسد کا بھی تھا۔ مہرجان کے اسی دربار میں دہقان ہراۃ کے پیش کردہ مذکورہ تحائف کے متعلق جانتے ہیں اسد نے دربار کو برخواست کرنے سے پہلے کیا کیا، اپنے اسٹاف کے ایک ایک رکن کا نام لیتا جاتا تھا اور کہتا جاتا تھا کہ لو! یہ طلائی کا سکٹ تم لو، نقرئی تم لو، تا ہیں کہ ایک یک تھان کپڑے کا جن کا ڈھیر فرش پر لگا ہوا تھا، معمولی معمولی سپاہیوں کو ان کے حسب حال اس طور سے اسد نے تقسیم کر دیا کہ

"جو کچھ فرش پر تھا سب ہی کو اس نے بانٹ دیا۔" (طبری صفحہ ۲۴۴ ج ۵)

اور اسد کے متعلق کہا جا سکتا ہو کہ گورنر خالد کا ماں جائی بھائی تھا، خالد کی پارٹی کے دوسرے افراد جن کے سپرد حکومت کے مختلف شعبے تھے، جن میں ایک صاحب طارق تھے جن کو خالد نے خراج کا افسر مقرر کر رکھا تھا، طبری میں ہو کہ ایک دفعہ خالد کو جب ضرورت پیش آئی تو طارق نے کہا کہ

"چالیس ملین تو خاکسار حاضر کر سکتا ہو۔"

اسی کے ساتھ اسی نے یہ بھی اطلاع کی تھی کہ

"آپ کے اسٹاف میں سعید بن راشد بھی چالیس ملین کی رقم حاضر کر سکتا ہو، اور الزینبی نیز ابان بن ولید کی طرف سے بیس بیس ملین مل سکتے ہیں۔ ج ۵ صفحہ ۲۵۲

یوں طارق نے خالد کو یقین دلایا کہ جس وقت بھی آپ کا حکم ہوگا بہ سہولت تمام آپ کے دربار کے ملازمین

"ایک لاکھ ملین کی رقم فراہم کر کے حاضر کر سکتے ہیں۔"

خراج کے اسی افسر طارق کے حال میں لکھا ہو کہ

"اپنے بچے کے ختنے کی تقریب کے موقع پر علاوہ دوسری چیزوں اور قیمتی تحائف کے خالد کے یہاں بطور تحفہ کے تین ہزار غلام اور لونڈی بھی طارق نے پیش کیے تھے۔"

ج ۵ صفحہ ۲۵۲، طبری

بلال بن ابی بردہ جو خالد کی طرف سے بصرہ کے والی تھے، ان کے متعلق ابن عساکر نے جو لطیفہ نقل کیا ہو سننے کے قابل ہو، ہمارے ملک ہندوستان میں بطور ضرب المثل کے کسی دولت و ثروت کا تذکرہ کرتے ہوئے لوگ کہتے ہیں کہ ان کی عورتیں دودھ میں نہاتی ہیں، بظاہر ایک خیالی بات سے زیادہ اس کی اہمیت نہیں ہو، بھلا دودھ بھی نہانے کی کوئی چیز ہو سکتی ہو، لیکن سنیئے دودھ ہی نہیں بلکہ دودھ کا جوہر اور

دودھ ہو، یعنی گھی میں بھی نہانے والے دنیا میں پائے گئے ہیں، لکھا ہو کہ ان ہی بلال بن ابی بردہ پر جذام (کوڑھ) کے آثار کچھ نمایاں ہوئے، ان کو مشورہ دیا گیا کہ روزانہ کسی برتن (ٹب وغیرہ) میں گھی بھریں اور چند گھنٹے اسی گھی میں بیٹھا کریں، ذرائع کی وسعت کا اندازہ کیجیے کہ روزانہ گھی کی اتنی بڑی مقدار فراہم ہوتی تھی اور اسی میں بلال کچھ دیر اپنے کو غرق کر دیا کرتے تھے یا گھی میں تیرتے تھے، میرے خیال میں بجائے دودھ کے گھی میں نہانے کی یہ تاریخی مثال ہو سکتی ہو۔[1]

دولت و ثروت، داد و دہش کے ان قصوں کے ساتھ خالد اور اس کے نمائندوں کی بڑی کڑی نظر ان لوگوں پر رہتی تھی، جو اس زمانہ میں الخوارج کے نام سے موسوم تھے۔ یعنی حکومت قائمہ کے خلاف جن کے اندر بغاوت اور سرکشی کے جذبات پرورش پاتے تھے، کسی رنگ میں اور کسی بھیس میں بھی وہ سر نکالتے، خالد کی حکومت اسی وقت ان کا سر کچل دیتی تھی، خالد کے عہد کے خارجیوں کی فہرست بھی کافی طویل ہو، جن میں خصوصیت کے ساتھ بعض لوگوں کا تذکرہ کیا گیا ہو۔

واقعہ یہ ہو کہ عوام کو اپنے اوپر جمع کرنے یا رائے عامہ کی ہمواری کا طریقہ ہر زمانہ میں اس زمانہ کے ماحول کے مطابق ہی ہوتا ہو، ہمارے زمانہ میں ملک کے عام باشندوں کی معاشی فراغ بالی کا سبز باغ یا سیاسی طلسم ہو، جس کے وعدے اور کچھ تماشے دکھا دکھا کر ٹولیوں کے فراہم کرنے کا عام دستور ہے بقول اکبر مرحوم

لیڈری چاہو تو فقط قوم ہے مہماں نواز
گپ فروشوں کو اور اہل میز کو راضی کرد

گپ فروشوں سے ان کی مراد اخبار والے ہیں، لیڈروں اور عوام کے درمیان ربط پیدا کرنے کا ذریعہ صحافت اور پریس ہو۔

---

[1] لیکن بلال بڑے جوش و گرش کے آدمی تھے، گھی جیسی قیمتی چیز کی اتنی بڑی مقدار کے بہا دینے اور ضائع کرنے پر ان کا دل راضی نہ ہوا، طے یہ کیا گیا کہ امیر کے غسل کے بعد گھی کو ٹب سے نکال کر چھوٹے برتنوں میں رکھ کر بازار میں فروخت کرنے کے لیے بھیجدیا جائے، لیکن راز فاش ہو گیا، بیان کیا ہو کہ بصرہ کے باشندوں نے بازار سے گھی کا خریدنا ہی اس زمانہ میں ترک کر دیا تھا، گھر میں اپنے سامنے دودھ سے نکال کر جو بچتا تھی اسی سے لیتے تھے۔

ہم مروانی حکومت کے جس دور سے بحث کر رہے ہیں اس زمانہ میں ظاہر ہو کر دین کی دعوت کے ساتھ ساتھ بلکہ ذیل میں ایک سیاسی طاقت بھی عرب کی سرزمین میں نشو و نما پا گئی، قدرت کی غرض یہی تھی کہ بندوں کیلئے ان کے خالق آفریدگار کے آخری پیغام یعنی قرآن و اسلام کی ابتداء ہی میں بنیادوں کو اتنا استوار و عمیق کر دیا جائے کہ اس کے بعد لاکھ طوفان آئیں، طغیانیاں ہوں، آندھیاں چلیں، انسانی زندگی کے قدرتی دستور کا یہ آخری قالب حوادث روزگار سے محفوظ ہو جائے، اسی کا نتیجہ ہو کہ گزشتہ تیرہ صدیوں سے زیادہ مدت میں خدا ہی جانتا ہو اسلامی دین اور اس دین کے ماننے والوں کو کتنے روح فرسا، زہرہ گداز حوادث سے گزرنا پڑا، اور آج بھی شدید مخالفانہ طوفانوں سے دوچار ہیں، لیکن بایں ہمہ اسلامی دین کی اساسی کتاب القرآن بھی اپنے ایک ایک حرف و نقطہ، زبر و زیر کے ادنیٰ تغیر کے بغیر اسلامی دنیا کے ہر حصہ میں موجود ہو، پڑھا جا رہا ہو، سمجھا جا رہا ہو، اور اس آسمانی کتاب کی تعمیلی شکل کا ناسوتی قالب، السنۃ کا بھی اعتماد آفرینی اور وثوق انگیزی میں وہی حال ہو جو پہلی صدی ہجری میں تھا، موکد ترین قسموں کے ساتھ یہ دعوی کیا جا سکتا ہو کہ بال برابر فرق اس لحاظ سے پیدا نہیں ہوا ہو، اور یہ واقعہ ہو کہ ایمان و عمل صالح کی بلندیوں سے بلند تر معیار زندگی بسر کر کے مرنے کی تمنا رکھنے والوں کے لیے آج بھی وہ سب موجود ہو جو کل پایا جاتا تھا۔

بہر حال تقدیری فیصلہ کے وہ تدبیری مظاہر تھے جو آغاز اسلام کے ساتھ ہی نمایاں ہوئے تھے، لیکن بدبختوں کا ایک طبقہ ہر زمانہ میں پایا گیا ہو، تا اینکہ نبوت کا عہد بھی اس سے خالی نہ تھا جو عربوں کے سیاسی اقتدار کا حیلہ اور بہانہ دین کی دعوت و پیغام کو باور کرتا رہا۔ مسیلمہ، اسود عنسی، سجاح اور اسی قسم کے سبک مغز لوگ عہد نبوت ہی میں اپنے اس خود فریبہ وسوسہ کے زیر اثر سیاسی اقتدار کے لیے ہاتھ پاؤں پھینکنے لگے تھے۔ اور ان کے بعد بھی اسی عجیب و غریب غلط فہمی کے زہر سے مسموم ہونے والوں کے قلوب میں اس کی ہوس اٹھتی رہتی ہو وہ دین کا نعرہ لگاتے ہوئے سیاسی دنگلوں میں کود پڑتے ہیں، اور بے دینی اور الحاد و استہزاء کے اس تاریک عہد میں بھی جب تجربہ کرنے والے اس تجربہ سے باز نہیں آرہے ہیں۔ تو خود سوچیے کہ جس زمانہ میں دین ہی دین تھا، دین کے سوا اور کچھ نہ تھا، اگر سیاسی اہوں

میں دین کا نام لے لے کر لوگ اُٹھ رہے ہوں، تو اس پر تعجب کیوں کیجیے، ہجری کی پہلی صدی ختم ہوئے ابھی چند سال ہی گزرے تھے، خالد کوفہ کا گورنر تھا، منبر پر لکھا ہو کہ اپنی فصاحت و بلاغت کی لوگوں سے داد لے رہا تھا، ڈھلے ڈھلائے تراشیدہ و خراشیدہ فقرے اس کی زبان سے نکل رہے تھے۔ کہ عین اسی حال میں کسی نے یہ خبر پہونچائی،

"کوفہ کے بیرونی محلوں میں ایک نئی دینی تحریک شروع ہوئی ہو جس کے لیڈر مغیرہ بن سعید اور بیان نامی دو آدمی ہیں، سر دست ان کے ساتھ اس وقت کل بھ آدمی ہیں، اپنے آپ کو "ابو صفاء" (برگزیدگان) کے نام سے موسوم کرتے ہیں۔"

کامل ابن اثیر وغیرہ ج۵ ص۶

اب خدا جانے یہ کوئی اتفاقی بات تھی، یا واقعی خالد اس خبر سے غیر معمولی طور پر اتنا متاثر ہوا، کہ اس کی چلتی ہوئی زبان رُک گئی، منھ خشک ہو گیا اور منبر ہی سے چلانے لگا، مجھے پانی پلاؤ، پانی پلاؤ۔[۱]

بظاہر خوف زدہ ہونے کی وجہ خالد کی یہ معلوم ہوتی ہو کہ مغیرہ کے متعلق اس کے پاس غالباً پہلے سے اس قسم کی اطلاعیں پہونچ رہی تھیں کہ اپنی باطنی قوتوں کو بیدار کر کے طرح طرح کے کرشمے دکھاتا ہو، کتابوں میں نقل کیا گیا ہو کہ مردوں کو زندہ کرنے کا مغیرہ مدعی تھا، لوگوں کو قبرستانوں میں لے جاتا، اور کچھ بڑبڑاتا بیان کرتے ہیں کہ اس کے بعد ایسا معلوم ہوتا تھا کہ قبروں پر پتنگے اڑ رہے ہیں، شاید ان ہی اُڑنے والے پتنگوں کے متعلق باور کراتا تھا کہ مرنے والے ان ہی کے قالب میں زندہ ہو گئے ہیں۔ (کامل ج۵ ص۶)

مغیرہ نے اپنا ایک مستقل الہیاتی فلسفہ بھی گھڑ لیا تھا، وہ اس راز سے واقف تھا کہ غیب کے متعلق ذرا چرب زبانی سے کام لے کر کچھ کہہ دیا جائے، وہی فلسفہ بن جاتا ہو۔ کہتا تھا کہ عوام کیا جانیں یہ حروف ہجا

---

[۱] شعراء تو تاک میں رہتے ہیں، یحیٰی بن نوفل اس زمانہ کا ایک ظریف شاعر تھا جس نے چند شعر بھی لکھے تھے، جن میں گالیاں دیتے ہوئے خالد کو خطاب کر کے اس نے کہا تھا کہ ارے خالد تجھے یہ کیا ہو گیا، مغیرہ کا نام سن کر تیرا خون خشک ہو گیا، منبر ہی سے چلانے لگا مجھے پانی پلاؤ پانی پلاؤ۔ اور پلنگ پر تیرا ڈر کے مارے پیشاب خطا ہو گیا۔ تف ہو تجھ پر ایک فرقت بڈھے مغیرہ اور اس کے ساتھیوں سے تو ڈر گیا۔ اصلی اشعار طبری وغیرہ میں درج ہیں۔ میں نے خلاصہ ان کا اردو میں کر دیا ہو۔

ان کی تعداد اس قدر کیوں ہو؟ پھر خود کہتا کہ خدا کے اعضا کی تعداد بھی درحقیقت اسی قدر تھی، اسی کا ظہور ہجائی حروف کی شکل میں ہوا ہو۔

کائنات کی تخلیق کے فلسفہ کو بیان کرتے ہوئے سمجھاتا تھا کہ اپنے اسم اعظم کا خدا نے تلفظ کیا، بس اسی سے عالم بن گیا، اور کہتا تھا کہ خدا نے اپنی انگلیوں سے اپنے کفِ دست پر لوگوں کی نیکیوں اور بداعمالیوں کو خود لکھا، پھر بداعمالیوں کو دیکھ کر پسینے پسینے ہوگیا، وہی پسینہ خدا کا ہو جو سمندروں اور دریاؤں کی شکل میں جھلک رہا ہو"

الغرض اسی قسم کے ہفوات کو سُنا سُنا کر سیدھے سادے عوام کو اپنا معتقد بناتا، اسی کے ساتھ مسلمانوں کے عام رجحان سے فائدہ اٹھاتے ہوئے، حضرت علی کرم اللہ وجہہ اور ان کے صاحبزادوں کی الوہیت کی تلقین بھی پوشیدہ طور پر کرتا، باور کراتا کہ وہی الوہیت منتقل ہوتے ہوئے اہلبیت نبوت کے فلاں[1] صاحب تک پہنچ چکی ہو، عن قریب ان کا ظہور ہوگا، وہی مہدی ہیں، مردانیوں کو ختم کردیں گے۔

خلاصہ یہ ہو کہ ایک بے ڈھنگی سی سیاسی تحریک تھی جس پر دین کی چادر اُڑھادی گئی تھی، سب سے دلچسپ لطیفہ مغیرہ کے رفیق بیان نامی کا ہو، ابن اثیر نے نقل کیا ہو کہ

"قرآنی آیت ھذا بیان للناس کو سنا کر کہتا کہ لوگوں کے فائدہ کے لیے بیان نامی آدمی کو خدا پیدا کرنے والا تھا، اس کا یہی مطلب ہو" (جزء ۵ ص ۷۷ کامل)

دلچسپ اس لطیفہ کو اس لیے کہہ رہا ہوں کہ ہندستان (پنجاب) میں بھی ایک صاحب اپنے والد کے رکھے ہوئے نام کے ایک جز کو حذف کرکے فرمایا کرتے تھے کہ میرا ذکر تو قرآن میں پہلے سے موجود ہو[2]

---

[1] رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے گھرانے کے بزرگوں کے لیے ان سیاسی بازی گروں کا وجود مصیبت بنا ہوا تھا، اپنی طرف سے ان کا نام لے کر وہ یہ دھینگا کرتے، لیکن خود ان بزرگوں کو جب خبر ہوتی تو ظاہر ہو کہ بے چارے ان باتوں سے پناہ مانگتے، یہی مغیرہ امام باقر اور امام جعفر کی خدمت میں جیسا کہ ابن اثیر لکھتا ہو، حاضر ہوکر کہنے لگا کہ آپ غیب کے عالم ہیں، مردوں کو زندہ کرسکتے ہیں۔ دونوں حضرات نے اپنے پاس سے اس کو نکلوادیا۔ امام زین العابدین اسی لیے عام مسلمانوں سے فرمایا کرتے تھے۔ خدا کے لیے عام مسلمانوں کے مقابلہ میں ہمارے ساتھ تولا کا دم مت بھرا کرو، تمھاری دوستی ہمیشہ ہم لوگوں کی مصیبت کی وجہ بن گئی ہو۔ (طبقات ابن سعد) [2] یہ مرزا غلام احمد قادیانی صاحب ہیں۔ ان کے پدر بزرگوار نے (بقیہ اگلے صفحہ پر)

مغیرہ بن سعید اور اس کے ماننے والے قرآن کی تفسیر میں بھی نئی نئی اُپج سے کام لیتے تھے، مثلاً کہا کرتے تھے کہ عام مسلمان سمجھتے ہیں کہ قیامت میں ساری دُنیا فنا ہو جائے گی، اور صرف خدا کی ذات رہ جائے گی. لیکن واقعہ یہ نہیں ہو، اپنے مخلوقات کے ساتھ خود خالق بھی فنا ہو جائے گا، صرف اس کا چہرہ (وجہ) بس یہی ایک چیز باقی رہ جائے گی، کہتے ہیں قرآنی آیت ویبقیٰ وجہ ربك ذوالجلال و الاکرام کا یہی مطلب ہو.

علاوہ مغیرہ بن سعید اور اس کے رفقاء کے ابن عساکر نے لکھا ہو کہ خوارج یا سیاسی انقلابیوں کے اسی گروہ میں سے بعضوں نے براہ راست نبوت کا دعویٰ بھی خالد کے زمانہ میں کیا تھا، جب گرفتار ہو کر خالد کے سامنے نبوت کا یہی مدعی حاضر ہوا، تو یہ دریافت کرنے پر کہ وحی بھی تجھ پر کوئی نازل ہوئی ہو اثبات میں جواب دیتے ہوئے اپنی وحی سنانے لگا، جس کے الفاظ یہ تھے.

"انا اعطیناك الجماھر، فصل لربك ولا تجاھر ولا تطع کل فاجر وکافر" گویا قرآن کے سورۂ الکوثر کے چند الفاظ کو رد و بدل کر کے بدبخت نے اپنی وحی بنالی تھی، اس زمانہ میں بھی اسی قسم کی بے باکیوں کا ظہور نبوت کے بعض مدعیوں کی طرف سے ہوا۔[۵]

بہرحال پوری قوت کے ساتھ خالد اپنے عہد کے خوارج کے استیصال کے درپے رہا، مغیرہ اور بیان یا اسی قسم کے مذہبی سحروں کو تو گرفتار کر کے ان کے کیفر کردار تک خالد نے پہونچا دیا، مغیرہ اپنے رفقاء کے ساتھ اسیر ہو کر جب خالد کے سامنے پیش کیا گیا تو مغیرہ سے پہلے اس کے کسی رفیق کی گردن مارنے کا حکم

(سلسلہ حاشیہ صفحہ گزشتہ) ان کا نام غلام احمد رکھا تھا، لیکن غلام کا لفظ حذف کر کے قرآن کی مشہور آیت مبشرا برسول یاتی من بعدی اسمہ احمد (صف) میں احمد کا مصداق اپنے آپ کو قرار دیتے تھے. ان کے ماننے والوں کا یہ زیادتی ہو کہ اپنے آپ کو "احمدی" کہتے ہیں. حالانکہ ان کے نام کے پہلے جز غلام کی طرف منسوب کر کے "غلامیہ" نام اس فرقہ کا زیادہ موزوں ہو سکتا تھا. میں تو نہیں سمجھتا کہ ایک مومن کو اس کی جرأت بھی کیسے ہو سکتی ہو کہ جس کی غلامی اس کے ایمان کا سب سے بڑا سرمایہ ہو اسی غلامی پر دلالت کرنے والے لفظ کو اپنے نام سے جدا کرے؟

[۵] میرا اشارہ مرزا صاحب ہی کی طرف ہو. گو ان کی وحی عربی زبان تک محدود نہ تھی، عربی کے سوا اردو و فارسی بلکہ کبھی کبھی انگریزی میں بھی ان پر (العیاذ باللہ) وحی اترتی تھی، لیکن عربی الفاظ والی وحی میں مرزا جی کی بھی عموماً قرآن ہی کا استعمال و سرقہ ہوتا ہو ۱۲

خالد نے دیا، پھر مقتول کی لاش کی طرف اشارہ کر کے مغیرہ سے کہنے لگا کہ تم تو مردوں کو زندہ کرنے کی کرامت لوگوں کو دکھاتے ہو، ذرا اپنے اس مقتول ساتھی کو تو زندہ کر کے مجھے دکھاؤ، تب مغیرہ کھسیانا سا ہو کر کہنے لگا کہ "خدا امیر کو خوش حال رکھے" کسی مرے ہوئے کو میں کیسے زندہ کر سکتا ہوں" خالد نے کہا جی نہیں، یا تو آپ اس کو جلائیے، ورنہ آپ کی گردن بھی اڑا دی جائے گی؟ مغیرہ کہتا رہا یہ میرے بس کی بات نہیں ہو، خالد نے حکم دیا کہ آگ کا الاؤ جوڑا جائے، پھر مغیرہ جو کرامتوں کی ڈینگ مارا کرتا تھا اس سے کہا

"چل آگ کے الاؤ سے معانقہ کر، اور بغل گیر ہو"

مغیرہ کی ہمت نہ پڑی، لیکن اس روایت کے راوی ابوبکر بن عیاش حدیثوں کے مشہور راوی جو وہیں موجود تھے، انھوں نے اپنی چشم دید شہادت نقل کی ہو کہ مغیرہ کے رفیقوں میں سے ایک آدمی کو میں نے دیکھا کہ آگ کے الاؤ سے لپٹا ہوا ہو، آگ اس کو کھاتی چلی جا رہی ہو، اور وہ شہادت کی انگلی اٹھائے ہوئے اشارہ کر رہا ہو، اس رنگ کو دیکھ کر مغیرہ کو مخاطب بناتے ہوئے خالد نے کہا۔

"تیری پارٹی کی لیڈری کا تجھ سے زیادہ حقدار تو یہی تھا[1]" (ص ۶۹ ج ۵ ابن عساکر)

ابن عساکر نے یہ بھی نقل کیا ہو کہ انا اعطیناک والی وحی کے مدعی کو جب خالد نے سولی پر چڑھا دیا تو شاعر جو اسی قسم کے مواقع کا منتظر رہتا ہو، اس نے جواباً کہا تھا،

انا اعطیناک العمود، فصل لربک علی عود، وانا ضامن لک ان لا تعود[2]

---

[1] اور اسی سے سمجھ میں آتا ہو کہ جاں بازی و جاں فروشی و قربانی کو حق و باطل کا معیار ٹھہرا لینا کتنا بڑا مغالطہ ہو، میں لوگوں سے اکثر کہا کرتا ہوں کہ قربانی و جاں بازی کے لحاظ سے دیکھا جائے تو سید الشہداء حضرت حمزہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے جو کچھ کر کے دکھایا، تقریباً ابوجہل نے بھی تو یہی کیا، مال و دولت، عزت و آبرو کے ساتھ ساتھ جان اس نے بھی گنوائی۔ لیکن وہ ابوجہل کا ابوجہل ہی رہا۔ اور حضرت حمزہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سید الشہداء بن گئے۔ پس دیکھنے کی چیز یہ نہیں ہو کہ کرنے والے کیا کر رہے ہیں بلکہ یہ ہو کہ کس لیے کر رہے ہیں۔ سیدنا حمزہ نے خدا کے لیے قربانی پیش فرمائی۔ اور ابوجہل جاہلی حمیت و غیرت کے زیر اثر مارا گیا ۱۲

[2] یعنی ہم نے تجھے سولی کا ستون عطا کیا، اسی لکڑی پر اپنے رب کی نماز پڑھ اور میں اس کی ضمانت لیتا ہوں کہ اب تو کبھی اس ستون سے واپس نہ ہوگا ۱۲

الغرض یہ اور اسی قسم کی متعدد انقلابی پارٹیوں سے خالد اور اس کے نمائندوں کو مقابلہ کرنا پڑا۔

اور یوں تقریباً چودہ سال تک ملک کی آبادی کی بڑی بڑی علمی اسکیموں، پھر اپنی بے پناہ داد و دہش بذل و نوال، اور خوارج کے مقابلہ میں حکومت کی بہی خواہیوں کے جو کارنامے اس کی طرف سے وقوع پذیر ہوتے رہے، قدرتی طور پر ان ہی وجوہ و اسباب سے اس کے اقبال و عروج کا ستارہ بلند سے بلند تر ہی ہوتا چلا گیا، گویا مروانی حکومت میں خود حکمران وقت ہشام بن عبدالملک کے بعد سب سے بڑی ہستی گویا خالد ہی کی بن چکی تھی۔ نظر کی بلندی کہیے یا احساس کی نزاکت میں حالت خالد کی یہ ہوگئی تھی، ابن عساکر ہی کی روایت ہو کر خالد کے حرم کی ایک خاتون رائقہ نامی کی انگوٹھی بیس ہزار درم کی خریدی ہوئی گھر کے کسی "چہبچہ" میں گر پڑی، رائقہ کو خالد نے اس کی وجہ سے پایا کہ کچھ مغموم و پریشان ہو، بولا کہ آخر تم کیا چاہتی ہو، بولی کوئی آدمی بلوا دیجیے جو "چہبچہ" سے میری انگشتری نکال دے، خالد نے رائقہ کی طرف دیکھتے ہوئے کہا کہ

"اب یہ انگشتری تمہاری انگلیوں کے لائق کب رہی، ایسی (گندہ) جگہ سے نکال کر پھر تمہارے استعمال میں وہ آئے، یہ نہیں ہو سکتا۔"

صرف اسی قدر کہہ کر خالد خاموش ہی نہیں ہو گیا، بلکہ لکھا ہو کہ اسی وقت

گری ہوئی انگشتری کے معاوضہ میں	اشتری لھا بدلہ فصا بخمسۃ
پانچ ہزار اشرفیوں کا نگینہ خرید کر رائقہ	الف دینار
کے حوالہ خالد نے کیا	ص۸۲ ج۵ ابن عساکر

طبری نے بھی اپنی تاریخ میں خالد کی اسی حرم رائقہ ہی کے ایک یاقوتی نگینہ کا ذکر کر کے لکھا ہو کہ

یہ یاقوت خالد بن عبداللہ کی حرم	کانت الیاقوتۃ للرائقۃ جاریۃ
رائقہ کا تھا جسے رائقہ نے ۷۰ ہزار	خالد بن عبداللہ اشترتھا بثلاثۃ
اشرفیوں میں خریدا تھا	وسبعین الف دینار ص۲۲ ج۸ طبری

۷۰ ہزار اشرفیوں والے اسی یاقوت کے متعلق طبری میں ہو کہ "مٹھی میں جو اس کو بند کیے ہوئے تھا، کہتا تھا کہ دونوں کنارے اس یاقوت کے مٹھی سے باہر نکلے ہوئے تھے، جس سے اس یاقوت کے وزن اور ضخامت کا اندازہ ہوتا ہو۔

زمانہ کا یہی اتار چڑھاؤ، اور پھیر ہو، گورنری کوفہ کے زمانہ میں کسی نے خالد کو مشورہ دیا کہ اپنے لڑکے

یزید بن خالد کی آمد وخرچ پر کچھ نگرانی قائم کیجیے اس کے جواب میں براہ راست خالد کے یہ الفاظ طبری نے نقل کیے ہیں، مشورہ دینے والے سے اس نے کہا

میرے بچے کو چھوڑ دو، ایک زمانہ اسی پر	دع ابنی فلربما طلب الدرھم
گزرا ہو کہ بسا اوقات ایک درم کی بھی اسے	ولم یقدر علیہ
ضرورت ہوتی اور اسے نہیں پاتا تھا۔	طبری ج۵ ص۲۵۲

اور آج اسی خالد کا یہ حال ہو کہ اس کی جاریہ (حرم کی لونڈی) کے لیے پیچھے سے نکلی ہوئی بیس ہزار درم کی انگوٹھی بھی پہننے کے قابل باقی نہ رہی تھی۔ (باقی)

انتخاب

(از ——— ادارہ)

سچی باتیں

محمد علی پاشا مصری (متوفی ۱۸۴۹ء) کے نام نامی سے پڑھے لکھوں میں اکثر لوگ واقف ہوں گے۔ حکومت مصر کو ترقی دینے کے سلسلہ میں ان کے خیال میں یہ بات آئی کہ جب تک مصر کی بری و بحری فوج کو مغربی اسلوب پر تیار نہ کیا جائے گا۔ دشمنوں پر غلبہ نہ حاصل ہو سکے گا چنانچہ جدید طریقہ کے جنگی جہازوں کی تیاری کے لئے اشتہار دیا۔ فرانس اور دوسرے فرنگی ملکوں سے ماہرین فن آئے۔ لیکن انھوں نے اپنے بیوی بچوں کو بھی ساتھ لانا چاہا۔ پاشا نے اسے منظور کیا۔ لیکن جب ان کا قیام ہوا تو انھوں نے قدرۃً یہ بھی چاہا کہ بیماری میں ان کا علاج بھی فرنگی ڈاکٹروں ہی کا ہو محمد علی نے اسے بھی منظور کیا۔ ڈاکٹروں نے آکر رفتہ رفتہ ایک زچگی کا اسپتال بھی قائم کیا اور ابھی ایک نسل بھی نہ گزرنے پائی تھی کہ وہی مسلمان عورتیں جو گھر سے باہر قدم نکالنا گناہ سمجھتی تھیں۔ زچگی کے سلسلہ میں بے تکلف فرنگی وکافر ڈاکٹروں تک پہنچنے لگیں۔ اور دیکھتے ہی دیکھتے شرم وحیا کا جو معیار صدیوں سے چلا آرہا تھا مسلم گھرانوں میں بدل گیا ——— پروفیسر آرنلڈ ٹوئین بی (TOYN BEU) کا شمار اس وقت برطانیہ کے ایک بہترین مورخ و ماہر علم معاشرت (سوشیالوجسٹ) بلکہ ایک مفکر کی حیثیت سے بھی ہوتا ہے، یہ واقعہ انھوں نے تازہ کتاب "دنیا اور مغرب" -THE WORLD & THE WEST-) میں درج کیا ہے۔ اور کتاب کا مختصر سا خلاصہ کراچی کے معزز انگریزی پندرہ روزہ الاسلام نے حال میں اپنے صفحات میں درج کیا ہے۔

واقعہ غالباً ۱۸۳۰ء کا ہے۔ اسی سنہ میں پاشا موصوف نے فرانس سے جہاز سازی کے ماہروں کو طلب کیا تھا، بہر حال ایک ہی دو نسلوں کے اندر مصر کی کایا پلٹ ہوگئی، اور "قدامت" "جدت" میں تبدیل ہو کر رہ گئی، بات شروع کہاں سے، اور کس نیت ومقصد سے ہوئی تھی۔ اور دیکھتے ہی دیکھتے

کہاں سے کہاں پہنچ گئی! پروفیسر ٹوئین بی خود نتیجہ نکالتے ہیں۔

"ثقافتی لین دین کے کھیل میں ایک چیز اسی طرح دوسری چیز تک پہنچاتی ہے، یہاں تک مغربی ہتھیارٹں، قواعد اور وردیوں کا استعمال لازمی طور سے نہ صرف مسلم خواتین کی آزادی تک پہنچا دے گا، بلکہ عربی حروف کی بھی جگہ لاطینی حروف کو جاری کرا دے گا اور اسلام کی قوت کو تحلیل کر دے گا جس کا تفوق مسلم ملکوں میں زندگی کے ہر شعبہ میں اب تک مسلّم رہا ہے۔"

ملّت پر، جو جمود آج سے نہیں صدیوں سے طاری ہے، اس کا علاج ضرور کیجیے، اس کی اصلاح کی طرف سے غفلت برتنا خود ایک جرم ہے لیکن ذرا نتائج کا بھی پورا اندازہ کر لیجیے۔ تو ہیں ضرور ڈھالیے ریل اور تار اور ٹیلیفون ضرور پھیلائیے، بجلی گھر ضرور کھولیے لیکن اس کو بھی سوچتے رہیے کہ ان کا دامن شراب اور جوئے، حرام کاری اور سود خواری سے کب تک بچائے رہیے گا؟ (صدق جدید)

حق کا سوال کونسل آف اسٹیٹ میں ہندو شادی بل پر بحث کرتے ہوئے ایک ممبر نے کہا کہ یہ کیا بات ہے کہ اس بل کا اطلاق صرف ہندوؤں پر ہو، ہندو تو ایک سے زیادہ عورتوں سے شادی نہ کر سکے مگر مسلمانوں کو اس کی کھلی اجازت ہو حالانکہ دستور میں صاف مذکور ہے کہ مذہبی امتیاز کے بغیر تمام شہریوں کے حقوق برابر ہوں گے! ایک ممبر نے کہا کہ مذہب سے شادی کا کوئی تعلق نہیں اس لئے سول کوڈ بھی سب کے لئے ایک ہی ہونا چاہئے۔

اگر سیاست کھلی بے ایمانی نہیں ہے تو ہم پوچھنا چاہتے ہیں کہ اس بات کے فیصلہ کا حق کس کو ہونا چاہیے کہ شادی کا تعلق مذہب سے نہیں ہے؟ اگر اس بات کا حق ارباب سیاست کو ہے تو مذہب کے عالم کس مرض کی دوا ٹھہرے؟ اور پھر اس بات کی کیا ضمانت ہے کہ مذہب کے دوسرے مسائل پر ہاتھ صاف کرنے کیلئے یہ نہ کہدیا جائے گا کہ ان کا مذہب سے کوئی تعلق نہیں؟ سیدھی بات تو یہ ہے کہ جس طرح فن طب میں ایک طبیب ہی کو رائے دینے کا حق ہے اسی طرح مذہب کے کسی عالم ہی کو یہ فیصلہ کرنے کا حق ہوگا کہ کس چیز کا تعلق مذہب سے ہے اور کس کا نہیں ہے۔ اسی بنا پر تو ہمارا خیال ہے کہ موجودہ سیاست نے گھر گھر پہنچ کر فرنیچر تک کو سیاسی بنا دیا ہے اور انسان کے نجی معاملات تک اس کی گرفت میں آگئے ہیں عجیب قسم کی دھاندلی ہے کہ جس مسئلہ پر گرفت کرنی چاہی بھولے بن کر کہدیا کہ اس کا تو مذہب سے کوئی تعلق ہی نہیں، اگر پارلیمنٹ ہی کو یہ حق ہے کہ وہ کسی چیز کے مذہبی اور غیر مذہبی ہونے کا فیصلہ کرے تو وہ تو اچھا خاصا دارالافتاء بن گیا اور اسکے تمام ممبر مفتیان کرام!

(الجمعیۃ دہلی)

ناچ، گانے

آج کل ہندوستان میں ناچ گانوں کا بڑا زور ہو رہا ہے اور اس کا جوڑ بھارتیہ سنسکرتی کے ساتھ ملایا جا رہا ہے لطف یہ ہے کہ حکومت اس کی سرپرستی کر رہی ہے اور بجنیوں اور گویوں کے خوب بو پارے ہو رہے ہیں، اس عجیب و غریب صورت حال پر اٹاوہ کے ایک اخبار "شوشت سماج" نے ذرا دل کھول کر تبصرہ کیا ہے وہ لکھتا ہے کہ

"ایک طرف ملک کی غریبی اور بے چینی دوسری طرف مذہبی تہوار وغیرہ کے نام سے جوان جوان بیٹیوں کا ناچ ملک کی تہذیب پر کلنک کا ٹیکہ ہے پچھلے ماہ دکھنی بھارتی سنسکرتی منڈل کی طرف سے اس ناچ کا راشٹر پتی بھون دہلی میں مظاہرہ کیا گیا تھا جس سے ہمارے چوٹی کے نیتاؤں نے دل بہلایا تھا، کوئی میلہ یا بڑی تقریب اس سے خالی نہیں ہے اس لئے گھر گھر طبلوں اور ہارمونیم کی جھنکار سنائی دیتی ہے، اسی لئے کروڑوں روپیہ اس پر صرف ہو رہا ہے، لڑکیوں میں بے شرمی بڑھ رہی ہے، اخلاق خراب ہو رہے ہیں"۔

مصیبت یہ ہے کہ ناچ گانوں کو بھارتیہ سنسکرتی میں شامل کر لیا گیا ہے اگر اس کی مخالفت کی جائے تو کہا جائے گا کہ قدیم کلچر کی مخالفت ہو رہی ہے! اصل میں آزادی ملنے کے بعد حوصلے نکالے جا رہے ہیں کہ ہر پرانی بات واپس آجائے اور ایک دفعہ تو ہندوستان پانچ ہزار برس پہلے کی تہذیب کا تماشا دیکھ ہی لے! (الجمعیۃ)

ایک سید کی زبان سے

روزنامہ قومی آواز کے رپورٹر کے قلم سے۔

لکھنؤ ۲۲ مارچ۔ یوپی اسمبلی میں مخالف پارٹی کے لیڈر مسٹر راج نرائن سنگھ نے آبکاری کے وزیر کو اس حیثیت سے کہ وہ مسلمان ہیں یاد دلایا کہ قرآن و حدیث میں شراب کی سخت ممانعت آئی ہے، ایک مسلمان وزیر کے لئے آبکاری کی مد میں ایک پیسہ بھی مانگنا غلط ہے.... مسٹر راج نرائن سنگھ نے قرآن کی ایک آیت اور ایک حدیث کا حوالہ دیتے ہوئے کہا کہ قرآن شریف میں ہے کہ شراب اور جوا اور غیر خدا کے نام پر کی گئی قربانی اور تیروں کے ذریعہ جوا کھیلنا ناپاکی اور شیطانی کام ہیں اور حدیث میں ہے کہ ہر نشہ لانے والی چیز حرام ہے، ایسی حالت میں ایک مسلمان وزیر کا آبکاری کے لئے ایک پیسہ بھی مانگنا غلط ہے، میں مسلمان وزیر اس لئے کہہ رہا ہوں کہ گزشتہ انتخابات میں جب ذمہ دار انتخابی جلسوں میں تقریر کرتے تھے تو یہ بھی کہہ دیتے تھے کہ وہ فلاں طبقہ کے نمائندے ہیں.... وزیر انصاف و آبکاری نے اپنی جوابی تقریر میں مسٹر راج نرائن سنگھ کے قرآن و حدیث کے اقتباسات کا ذکر کرتے ہوئے کہا کہ جہاں تک شراب کے

بُرے ہونے کا سوال ہی وہ سب کو تسلیم ہے۔ اس سلسلہ میں قرآن میں بھی اور دوسری مذہبی کتابوں میں بہت کچھ مل سکتا ہی اور ہمارے لئے تو ہمارا دستور ہی، کافی ہے، جس میں صاف طور پر نشہ بندی کے اصول کو مان لیا گیا ہے۔

بہت خوب! خلاصہ یہ کہ ایک غیر مسلم ممبر بے چارہ تو زور دے دے کر قرآن و حدیث کے حوالے پیش کر رہا ہے کہ شراب کا کاروبار فوراً بند کیجیے، اور جواب میں مسلمان وزیر صاحب (آل رسول اور ولائے رسول و آل رسول کے مُدعی) یہ فرما رہے ہیں کہ ہاں ممانعت کا حکم تو قرآن کیا معنی اور بھی مذہبی کتابوں میں درج ہے اور ہمارے لئے، سب سے بڑھ کر یہ کہ خود ہمارے دستور حکومت میں بھی یہی درج ہے! ــــ سبحان اللہ کیا آداب شناسی اور کیا حفظ مراتب ہے!! (صدق جدید)

بندش خمر کی برکت

یوپی کے وزیر آبکاری کی تقریر اسٹیٹ اسمبلی میں ۲۲ مارچ کو:-

"جن ضلعوں میں نشہ بندی کا قانون نافذ ہو گیا ہے، وہاں کے دیہی علاقوں کی معاشری حالت پہلے سے کہیں بہتر ہو گئی ہے .... ایک تحقیقاتی پروگرام کے ذریعہ جو اعداد جمع کئے گئے ہیں ان سے معلوم ہوا ہے کہ ممنوع علاقوں میں جرائم فوجداری کی تعداد میں ۷۵ فی صدی کمی ہو گئی ہے، خانگی زندگیاں سدھر گئی ہیں۔ صحتیں اچھی ہو گئی ہیں اور ان علاقوں میں رہنے والوں کی قرضداری بھی کافی گھٹ گئی ہے"

اور یہ کرشمہ قرآن کی ہدایتوں پر نہیں، اس کے صرف ایک جزو، بلکہ جزو در جزو پر عمل پذیر ہونے سے ظاہر ہو گیا ہے، قرآن ظاہر ہے کہ دستور العمل مکمل زندگی کا ہے۔ جس کے اندر عبادات، معاملات، اخلاق و معاشرت کے سیکڑوں قانون آگئے۔ یہ تعمیل اس کے صرف ایک شعبۂ اخلاق کے بیسیوں جزئیوں میں سے صرف ایک جزئیہ کی ہوئی اور اس نے حالت میں اتنا عظیم الشان فرق پیدا کر دیا! جرائم کل ۲۵ فی صدی رہ گئے، قرضداری گھٹ گئی، صحتیں درست ہو گئیں، خانگی زندگیاں سدھر گئیں۔ اب اور کیا چاہیئے تھا؟ ــــ قرآن کی کل تعلیمات پر، یا کم از کم یہ کہ ان کے بیشتر حصہ پر اگر کہیں عمل ہونے لگے اور ماحول انھیں کے مطابق ڈھل جائے تو خدا گواہ ہے کہ یہی مصیبتوں کی ماری ہوئی دنیا نمونۂ جنت نظر آنے لگے! (صدق جدید)

تعارف وتبصرہ

مسئلہ اجتہاد | از مولانا محمد حنیف صاحب ندوی ۔ ۴+۱۸۰ صفحے، کاغذ وکتابت وطباعت بہتر، مجلد قیمت ڈھائی روپے آٹھ آنے، پتہ ادارۂ ثقافت اسلامیہ کلب روڈ لاہور

(افسوس ہے کہ اس کتاب پر تبصرہ بہت دیر سے آرہا ہے ہم ناشر سے معذرت خواہ ہیں)

اس کتاب کا نام پوری طرح مضامین کتاب کی ترجمانی نہیں کرتا۔ اس کا موضوع صرف اجتہاد نہیں ہے بلکہ دین کے کل ماخذ اس میں زیر بحث آئے ہیں ـــــ یعنی قرآن، سنت، اجماع اور قیاس بتلایا گیا ہے کہ ان ادلۂ شرعیہ میں سے کس کا کیا وزن ہے، اور کیا اس کے حدود ہیں؟ اور ان سے استدلال کے کیا اصول و قواعد ہیں؟ ـــــ حجیت سنت پر جو اشکالات اُٹھائے جارہے ہیں اُن کو بھی صاف کرنے کی کوشش کی گئی ہے اور اجتہاد و قیاس کی ضرورت واہمیت کو ثابت کرکے، خاص طور سے پاکستان کے اہل علم کو توجہ دلائی گئی ہے کہ وہ اس نوخیز اسلامی ریاست کے جدید تقاضوں سے عہدہ برآ ہونے کے لئے فقہ جدید کی تشکیل کی طرف قدم اٹھائیں ـــــ اس سلسلہ میں کچھ اشارات بھی دئے گئے ہیں۔

مجموعی اعتبار سے کتاب قابل مطالعہ اور ایک اجمالی بصیرت پیدا کرنے والی ہے۔

حنیف صاحب میں تعبیری اُپج بہت ہے، مگر اس اُپج کے نتیجہ میں جو تعبیر وہ اختیار کرلیتے ہیں اس کو پھر اس بُری طرح پیٹتے ہیں کہ آخر کار ذوق پر گراں ہونے لگتی ہے۔ اس کتاب میں لفظ "ڈھب" کا موقع بے موقع استعمال اسی قسم کا ہے!

اسلامی فلسفۂ ملکیت | از جناب نعیم صدیقی، مکتبہ چراغ راہ کراچی نمبر ا کتابت طباعت بہتر

کاغذ معمولی، چھوٹا سائز ۲۱۲ صفحے، قیمت دو روپے چار آنے

پیش نظر کتاب نعیم صاحب کے دو مقالوں کا مجموعہ ہے — ایک قومی ملکیت، دوسرا انفرادی ملکیت — قومی ملکیت پہلے تنہا کتابی شکل میں شائع ہو چکا ہے اور اس پر ان صفحات میں تبصرہ بھی کیا جا چکا ہے۔ دوسرا مضمون با این معنی اس کا تتمہ ہے کہ اُس پر جو بعض اشکالات و اعتراضات کیے گئے انھیں کے ازالہ کے لئے یہ مضمون لکھا گیا، مگر اس مجموعہ میں ترتیب علی العکس ہے کہ پہلے انفرادی ملکیت والا مضمون رکھا گیا ہے اور بعد میں قومی ملکیت!

مصنف نے ملکیت کے بارے میں اسلام کا نقطہ نظر واضح کیا ہے، ان لوگوں کی مدلل تردید کی ہے جو قومی ملکیت کے اصول کو ایک اسلامی اصول ثابت کرنا چاہتے ہیں، ان مغالطوں کو رفع کیا ہے جو اس سلسلہ میں قرآن کی بعض آیات اور دور خلافت راشدہ کے بعض واقعات سے دئے جاتے ہیں، نیز بتلایا ہے کہ جن فوائد کے لئے قومی ملکیت کے اصول کو اپنانے کی کوشش کی جاتی ہے، اسلام نے ان کے لئے کیا دیگر انتظامات کیے ہیں جو اُن مضرات سے پاک ہیں جنھیں قومی ملکیت لازماً اپنے جلو میں لے کر آتی ہے!

منتخب نظمیں مرتبہ جناب کوثر نیازی، ۴۴ صفحات، کتابت و طباعت عمدہ، کاغذ معمولی قیمت ایک روپیہ آٹھ آنے — یہ بھی مکتبہ چراغ راہ کراچی سے شائع ہوئی ہے۔

یہ اُن پندرہ اسلامی شاعروں کے کلام کا انتخاب ہے جو جماعت اسلامی سے متأثر یا تعلق رکھتے ہیں۔ انتخاب مرتب کا کیا ہوا نہیں بلکہ ہر شاعر نے اپنے کلام کا خود انتخاب کر کے مرتب کے حوالہ کیا ہے — تمام نظمیں پاکستان میں نظام اسلامی کی جد و جہد سے تعلق رکھتی ہیں جن میں پاکستان کی موجودہ قیادت، نظام حکومت اور مغرب زدگی کے رجحانات پر سخت تنقید اور اس کے خلاف شدید احتجاج ہے اور اسلامی نظام اور اسلامی تہذیب کو غالب کرنے کے عزائم کا اظہار ہے — کلام سے پہلے ہر شاعر کا مختصر سا تعارف ہے۔ تعارف بھی زیادہ تر شعراء کے خود اپنے قلم سے ہے، چند کا تعارف مرتب نے کرایا ہے۔

تعارف کی سادگی بڑی بھلی معلوم ہوئی. مگر جناب ماہر القادری کا خود اپنا تعارف کچھ دوسرے رنگ کا ہے جس کی ان سے توقع نہ تھی ——— یعنی کچھ مرعوب کرنے کی کوشش جھلکتی ہے، سفر عراق کے ذکر کا یہ کوئی موقع نہ تھا اور ہز مجسٹی غازی الاول شاہ عراق، سے شرف ملاقات کو قابل ذکر سمجھ کر تو انھوں نے اپنے اس شعر کا رخ اپنی ہی طرف پھیر دیا ہے کہ

گرہ میں باندھ لے ہم سے قلندروں کی یہ بات
شکوہِ قیصری و سروری میں کچھ بھی نہیں!

انتخاب کو زیادہ اچھا نہیں کہا جا سکتا، حالانکہ یہ سب شعرا، خاصہ اچھا کہنے والے ہیں، البتہ قابل اجمیری اور عاصی کرنالی نے ضرور اپنے کلام کا اچھا نمونہ پیش کیا ہے!

حقیقت ذکر از مولانا محمد احتشام الحسن صاحب کاندھلوی. ناشر کتب خانہ انجمن ترقی اردو جامع مسجد دلی ۶، کتابت وطباعت وکاغذ بہتر، صفحات ۲۷۲، قیمت دو روپے چار آنے، مجلد دو روپے بارہ آنے۔

اللہ تعالیٰ کا ذکر اسلامی زندگی کی جان ہے، ایک مسلم اور غیر مسلم کی زندگی میں حقیقی فرق یہی ہے کہ ایک خدا کو دھیان میں رکھ کر زندگی گزارتا ہے اور دوسرا اس سے غافل ہو کر ——— دین کا بڑے سے بڑا عمل اگر بلا ذکر و فکر کے ہو تو وہ بس ایک ڈھانچہ اور صورت ہے، اس میں حقیقت ذکر ہی سے پیدا ہوتی ہے! ——— مولانا موصوف نے اس تصنیف میں اسی ذکر کی حقیقت و اہمیت اجاگر کی ہے، قرآن وحدیث سے اس کے فضائل بتلائے ہیں، اس کے مختلف شعبے بیان کئے ہیں اور ہر شعبے میں ذکر کے صحیح اور مسنون طریقے بتلائے ہیں۔

امید ہے کہ یہ کتاب مسلمانوں کے لئے عام طور پر مفید ہوگی اور اس کے مطالعہ سے ذکر کی حقیقت کا علم اور اس کی ضرورت کا احساس پیدا ہوگا۔

رمضان المبارک کے موقع پر

کتب خانہ الفرقان کا رعایتی اعلان

گذشتہ سالوں کی طرح اس سال بھی ہم نے یہ فیصلہ کیا ہے کہ رمضان المبارک کے موقع
پر اپنی اور دیگر اداروں کی تمام مطبوعات پر کچھ رعایت دیں

(اگر آپ کم از کم دس روپے کی کتابوں کا آرڈر دیں)

تو ہم اپنی مطبوعات پر چار آنے فی روپیہ اور دوسرے اداروں کی مطبوعات پر دو آنے فی روپیہ
رعایت کریں گے!

یہ رعایت صرف رمضان المبارک کے لئے ہے اگر رمضان کے بعد
کوئی آرڈر پہنچا تو وہ اس رعایت کا مستحق نہیں ہوگا!

پاکستانی حضرات

کو اس ماہ مبارک کی رعایت دوسرے طریقہ پر دی جائے گی!
وہ اس طرح کہ اُن سے محصول ڈاک نہیں لیا جائے گا!
واضح رہے کہ ہندستان میں محصول ڈاک کی شرح پاکستان کے مقابلہ میں تقریباً دوگنی ہے (یعنی فی سیر ۳؍)
لیکن اُن کے لئے یہ ضروری ہے کہ مطلوبہ کتابوں کی پوری قیمت
ادارہ اصلاح و تبلیغ آسٹریلین بلڈنگ لاہور
کو پیشگی بھیج دیں اور پھر منی آرڈر کی ابتدائی رسید کے ساتھ
اپنی فرمائش ہمارے پاس بھیجیں

ضمیمۂ الفرقان بابت ماہ شعبان سنہ ۷۲ھ

معذرت اور فیصلہ

ہم اپنے خریداروں کے بیحد ممنون ہیں کہ گزشتہ سال (سنہ ۷۱ھ) میں الفرقان کی اشاعت کے اتفاقی التوار کی بناء پر خریداروں کا جو قرض ہمارے ذمہ ہو گیا تھا، اس سے سبکدوش ہونے کے لیے اپنی آسانی کو ملحوظ رکھتے ہوئے، جو تجویز بھی ہم نے پیش کی، انھوں نے بخوشی اس کو منظور کیا ——— اب آخر میں آکر یہ تجویز رکھی گئی تھی کہ جن خریداروں کا ہم پر یہ قرض ہو ان کو اس سال کے پورے بارہ پرچوں کے علاوہ ایک خصوصی نمبر پچھلے سال کا حساب بے باق کرنے کے لیے دیا جائے، جسکی ضخامت تین چار مہینے کے الفرقان کے برابر ہو، اس کو بھی ہماری توقع کے مطابق ہمارے سب ہی کرمفرماؤں نے منظور کر لیا، ہمارا ارادہ تھا ——— جس کے مطابق گزشتہ مہینے میں اعلان بھی کر دیا گیا تھا ——— کہ یہ خاص نمبر زیادہ سے زیادہ آخر شعبان تک نکال لیا جائے۔ اور ہم نے اس کا مکمل پروگرام بنا لیا تھا ——— مگر ہماری بدقسمتی کہ جن حضرات نے اس نمبر کے لیے مضامین لکھنے کا وعدہ فرمایا تھا، اُن میں سے بعض تو اس وعدہ کو پورا کرنے سے بالکل ہی معذور رہے۔ مثلاً مولانا سید مناظر احسن گیلانی مدظلہ العالی، کہ ابتدائے مارچ سے ان کی ایسی شدید علالت کا سلسلہ شروع ہوا کہ اب اپریل میں آکر حالت کچھ قابل اطمینان ہوئی ہو ——— اللہ تعالیٰ مولانا موصوف کو صحت کاملہ عطا فرما کر ان کے فیوض کو تا دیر باقی رکھے ——— اور بعض حضرات نے کچھ لکھا بھی مگر کچھ ایسی ناسازیٔ طبع یا عدیم الفرصتی کی حالت میں کہ ان کو بیحد اختصار سے کام لینا پڑا ——— الغرض ان وجوہ سے ہمارے پیش نظر خاکہ کے اکثر خانے خالی رہ گئے۔ اور اب اسکی تکمیل کی اس کے سوا کوئی صورت نہیں ہو کہ نمبر کی اشاعت کو کچھ اور مؤخر کر دیا جائے ——— مگر معاملہ چونکہ قرض اور حساب کتاب کا ہو۔ اور متعلقہ اصحاب ہمارے وعدہ کے بموجب اسکی ادائیگی کے منتظر ہیں، اس لیے مزید تاخیر و التوار بالکل مناسب نہیں معلوم ہوتا۔

پس اب اس قرض سے سبکدوش ہونے کے لیے بنام خدا یہ فیصلہ کر لیا گیا ہو کہ (تھوڑی سی مالی پریشانی کے خطرہ کو گوارا کر کے) اب سے اُن حضرات سے جو نئے سال کا چندہ وصول کیا جائے وہ ان کے اس واجب الادا کو منہا کر کے وصول کیا جائے۔ اسکی صورت یہ ہوگی کہ جو حضرات شعبان سنہ ۷۲ھ مطابق اپریل سنہ ۵۳ء میں بھی الفرقان کے خریدار تھے اُن سے اب نئے سال کے لیے چندہ بجائے پانچ روپیہ کے ساڑھے تین روپے وصول کیا جائے گا، اور وی پی کی شکل میں بجائے ساڑھے پانچ روپیہ کے چار روپے، اور جو لوگ آئندہ کے لیے خریداری کا سلسلہ بند کرنا چاہیں گے، ان کی مدت خریداری میں چار ماہ کا اضافہ کر کے ان کا حساب بے باق کر دیا جائے گا۔

یہ بات بکرر ذہن نشین کر لیجیے کہ یہ معاملہ صرف انھیں خریداروں سے متعلق ہو جو شعبان سنہ ۷۲ھ میں بھی خریدار تھے جو لوگ اسکے بعد سے خریدار بنے ہیں ان کا اس معاملہ سے کوئی تعلق نہیں ہو۔

ناظم الفرقان لکھنؤ

Regd No.— (A-353.)

Pri ted at—NAMI PRESS, Lko.

ماہنامہ

الفرقان لکھنؤ

ہماری دعوت

لا الٰہ الا اللہ محمد رسول اللہ

اسی کلمہ پر اسلام کی بنیاد ہے اور ہمارا ایمان ہے کہ یہی انسانیت کی نجات کا کلمہ ہے

لیکن یہ صرف ایک بول ہی نہیں ہے، بلکہ ایک شہادت، ایک اصول اور ایک اہم فیصلہ ہے، وہ جس پر

اس بات کا عہد ہے کہ ہم صرف اللہ کی عبادت اور بندگی کریں گے اور زندگی کے ہر شعبہ میں اس کی بھیجی ہوئی

اور حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی لائی ہوئی ہدایت اور شریعت کی پیروی کریں گے اور اسی حال میں جیئیں گے اور مریں گے۔

جو لوگ اس کلمہ پر ایمان لا چکے ہیں ان کا فرض ہے کہ زندگی اس عہد کے مطابق گزاریں اور اسی ایمانی

زندگی کو دنیا میں رواج دینے کی کوشش کریں، وہ اسی لیے پیدا ہوئے ہیں، ہم اس کا

عہد کرتے ہیں، اسی کی دعوت دیتے ہیں اور اسی پر جینا اور مرنا چاہتے ہیں۔

فاطر السموات والارض انت ولیی فی الدنیا والآخرۃ

توفنی مسلما والحقنی بالصالحین

"ادارۂ الفرقان"

مدیر و مسئول

محمد منظور نعمانی عفا اللہ عنہ